خلیل احمد نینی تال والا

میرے سفر نامے

خلیل احمد نینی تال والا

پیش لفظ

قارئین کرام

السلام علیکم!

اس سے قبل میری 9 کتابیں جن میں شگوفہ نو، حالات و واقعات، گردش ایام، کاش میں سیاست میں نہ آتا، یادِ رفتہ، صوبے کیوں ضروری ہیں، نرم گرم، میرے سیاسی تجزیئے اور سیاسی داؤ پیچ تصنیف پذیر ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں میں تقریباً ہر قسم کے مضامین زیر بحث آچکے ہیں جو جنگ اخبار میں چھپنے والے کالموں پر مشتمل تھے تقریباً 25 سالوں پر محیط تھے جن کو عام و خاص ہر طبقے میں بہت پذیرائی ملی جن کتابوں کو بین الاقوامی طور پر بہت سراہا گیا۔ اس میں میری آپ بیتی یادِ رفتہ، کاش میں سیاست میں نہ آتا اور صوبے کیوں ضروری ہیں شامل تھیں۔ الحمد اللہ 4 مرتبہ تو گلوبل سفر کر چکا ہوں یعنی ایشیاء، یورپ، امریکہ، مشرق بعید، مشرق وسطیٰ سے ہوتا ہوا واپس پاکستان آیا ہوں۔ مگر علیحدہ علیحدہ بھی سفر کئے ہیں جن میں تھائی لینڈ، چین، ہانگ کانگ، ملائیشیا، انڈونیشیاء، تائیوان جاپان، کوریا، امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی، مصر، ہنگری، فرانس، ترکی، ایران،

افغانستان، بیلجیم، سوئٹزر لینڈ، کینیڈا، صومالی لینڈ، بھارت، سری لنکا، مالدیپ، یو اے ای، سعودی عرب، بیروت، ڈنمارک، موناکو، یونان، ایتھوپیا، اٹلی، ہالینڈ، جبوتی، کیوبا، بہاماس، سینٹ میری، میکسیکو، آسٹریا، بنگلہ دیش، آذربائیجان، بلغاریہ، کولمبیا، کوسٹا ریکا، سائپریس، ڈومیکا، ڈومینکن ری پبلک، نیپال، اسرائیل، آئر لینڈ، اردن، لیسنتھاان (سوئٹزر لینڈ)، لکسمبرگ، نیدر لینڈ، شمالی آئر لینڈ، فلسطین، اسکاٹ لینڈ، سنگاپور، اسپین، سوئیڈن، شام تقریباً 400 سے زائد شہر دیکھے اور تفریحی دورے کئے۔ پوری دنیا میں سیر و تفریح کے مواقع اور ان پر اٹھنے والے اخراجات پر تفصیلی جائزے، صحت پر مشتمل سائنسی ترقی سے قوم کو آگاہ کرنا۔ دنیا میں بہت سے عجوبات، ذاتی تجربے، سرد اور گرم بدلتے ہوئے موسموں کا احوال دیگر قوموں کی ترقی کے اسباب افغان، پاکستان کی جنگیں، پڑوسی ممالک خصوصاً بھارت سے ہمارے تعلقات امریکہ کی خارجہ پالیسی پاکستان کے ساتھ ناروا برتاؤ، الغرض جو بھی مشاہدات دیکھنے میں آئے بلا کسی خوف عوام کو آگاہ کردیا۔ گزشتہ 25 سال میں سائنس میں جو ترقی پوری دنیا میں ہوئی اکثر یوٹیوب، یاہو، گوگل، دنیا بھر کے سائنسی جنرلز کتابیں، مضامین جو میرے پڑھنے سننے اور دیکھنے میں آئے قوم کی

معلومات میں اضافہ کرتا رہا، اب میری 10 ویں کاوش "میرے سفرنامے" حاضر ہے۔ اِس میں میرے وہ کالم جو روزنامہ جنگ میں چھپے ہیں اور جو نہیں چھپے وہ بھی موجود ہیں۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

گزشتہ 53 سال سے مختلف ممالک آتا جاتا رہا، زیادہ تر ممالک میں کاروباری سلسلے میں گئے مگر 1997 سے زیادہ ممالک سیر و تفریح کی غرض سے وزٹ کئے جس میں فیملی اور اہلیہ حمیرا خلیل ہمراہ آتی جاتی رہیں، اس کی وجہ سے سفر کے پہلے 50 سال تو خالصتاً کاروباری سلسلے میں تھے۔ اُس میں دن رات میٹنگیں اور سفر کے دورانئے ہوتے تھے کب نکلنا ہے اور کب واپسی ہوگی اس کا پہلے کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا اکثر جہازوں اور ٹرین کا سفر رات کو کرنے سے دن میں کاروباری مصروفیت زیادہ آسان ہوتی تھی۔ بعض اوقات 2، ڈھائی ماہ مسلسل حالت سفر میں گزرتے تھے۔ ان دنوں یورپ، امریکہ میں حلال کھانوں کا ملنا محال ہوتا تھا تو سفر میں گھر کے بنے کھانے ٹن کے ڈبوں میں پیک کروا کر ساتھ لے جانا پڑتا تھا جو اکثر صرف رات کو ہی ہوٹل میں گرم پانی میں ڈال کر ڈبے سے نکال کر کھایا جا سکتا تھا۔ البتہ دن میں مچھلی یا پھر انڈوں کے آملیٹ پر ہی گزارہ ہوتا

تھا۔ اُن دنوں حلال کھانا مرغی، گائے، بکرے کا گوشت تصور کیا جاتا تھا۔ یعنی سؤر کا گوشت حرام کھانا سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا صرف حلال طریقے سے ذبح کرنے سے ہی یہ جانور حلال ہوتے ہیں تو پھر ذبح شدہ کھانے پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ حلال کھانوں کے ریسٹورنٹس کھلنے شروع ہو گئے تھے تو حلال کھانے آسانی سے ملنے لگے تھے، تو دن میں بھی کھانا باہر کھایا جاتا تھا۔ اکثر ہمارے سپلائرز کی فیکٹریوں میں ہم سبزی اور مچھلی پکوا کر گزارہ کر لیتے تھے پھر سلاد سبزی کے سوپ سے بھی کام چلا کر گزارہ کر لیا جاتا تھا۔ کاروباری اتار چڑھاؤ بھی آتے رہے۔ 1975 میں تیل کی بندش نے کیمیکلز اور دیگر ادویات کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا بہت سے کاروباری سودے بھی منسوخ ہوئے۔ الغرض نفع نقصان دونوں سے واسطہ پڑا مجموعی طور پر اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا کاروبار ادویات سے نکل کر کاسمیٹکس کی طرف بھی رواں دواں رہا۔ شروع میں ایک جاپانی کمپنی سبولی فرام جاپان 1979 کے بنائے ہوئے کاسمیٹکس زیادہ کامیاب نہ ہو سکے اس کی وجہ عوام کا رجحان یورپی اور امریکن پرفیوم تک محدود تھا اور جاپان سے کوئی کاسمیٹکس کمپنی بھی متعارف نہیں ہوئی تھی تو پھر میں نے ایک پاکستانی برانڈ ٹچ می کے نام سے

متعارف کرایا۔ اُسے پہلے صرف ٹیلکم پاؤدر سے شروع کیا پھر آہستہ آہستہ شیونگ کریم اور دیگر شیمپو شامل ہوتے گئے۔ یہ 1982 کا سال تھا بہت کامیاب گیا۔ 1988 میں جرمنی کی ایک ٹوتھ پیسٹ بنانے والی فیکٹری میں خود 2 ماہ کی ٹریننگ لی اور نیچرل ٹوتھ پیسٹ متعارف کرایا بہت دھوم مچی اور خاصا کامیاب بھی رہا۔ پھر دوسرا ٹوتھ پیسٹ میڈی کیم دانتوں کے درد کے لئے تھا۔ 1990 میں متعارف کرایا، شروع کے 2 سال بہت سخت کمپیٹیشن (Competation) کی وجہ سے ڈاکٹروں سے پزیرائی نہیں ملی تو 1992 میں ہم نے میڈیا سے اشتہاروں اور ٹی وی ریڈیو کی مدد سے اپنے سب سے بڑے کمپیٹیٹر سینسو ڈائن (Sensodyne) ٹوتھ پیسٹ سے مقابلہ کیا اور اللہ کے فضل سے چونکہ بہت فائدہ مند تھا جلد ہی عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے پاکستان میں چھا گیا۔ اور آج تک الحمداللہ اپنی کوالٹی اور مناسب قیمتوں کی وجہ سے 40 گرام سے شروع ہوکر 70 گرام، 100 گرام، 150 گرام اور اب 200 گرام تک کی پیکنگ میں دستیاب ہے اور دیگر ٹوتھ پیسٹوں سے آگے ہے خاص طور پر دانتوں کے درد والے ٹوتھ پیسٹوں سے زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ 1996 میں اس گروپ نے ووڈ ورڈ گرائپ واٹر

برطانیہ کا برانڈ خریدا اور اُس میں بھی دن دگنی رات چوگنی ترقی کے منازل طے کئے۔ الغرض بیرون ملک کے سفر سے بہت سے تجربات بھی سامنے آگئے اور آج تک یہ سفر جاری ہیں، فی الحال آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، افریقہ اور ساؤتھ افریقہ کی طرف نہیں جانا ہوا مگر انشاءاللہ بہت جلد ان ممالک جانے کا پروگرام بنے گا اور اس طرح ایک تہائی دنیا کے ممالک کی سیر کرنے کا تجربہ ہو جائے گا۔ فی الحال میں اپنے سفرنامے میں بہت سی معلومات بھی شامل کررہا ہوں۔ جو مختلف ممالک میں جانے سے ہمارے ادارے کو اس سے فائدہ پہنچا، جو اگر ہم نہ جاتے تو ان سے محروم رہتے اور شاید ترقی کے اتنے مراحل نہ طے کرپاتے۔

میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ کی کہانی

میرے دانتوں میں اکثر درد رہتا تھا جو اوپر اور نیچے کی داڑھیں تھیں جن میں 2 داڑھیں 1980 میں ایک ایک کر کے نکال دی گئی تھیں اور ڈاکٹر کا کہنا تھا ان میں کیڑا لگ چکا ہے، اب ان کو بھی نکالنا پڑے گا۔ فی الحال ہم مرہم پٹی یعنی روٹ کنال Root Canal کر کے کام چلا رہے ہیں، تقریباً ہر 2 ماہ بعد ڈینٹسٹ کو دکھانا پڑتا تھا خوش قسمتی سے ہمارے آرام باغ والے دفتر مینڈوزا ہاؤس کے برابر ہی میں ایک امریکن

ڈینٹسٹ کا کلینک تھا، ڈاکٹر صاحب دوپہر کو جانے سے پہلے مجھے بلالیا کرتے تھے اُس کی وجہ سے انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ 1987 میں ہم فیملی کے ساتھ ہر سال کی طرح فرانس جاتے تھے، اُس کی وجہ بھی ہمارا کاروبار فرانس کے ساتھ بہت زیادہ تھا۔ اکثر خوشبوئیں ہم فرانس کے شہر گراس کے گردونواح سے خریدتے تھے تو ایک ہفتے کے دن ہوٹل میں دانتوں میں تکلیف شروع ہوئی جب درد برداشت سے باہر ہوا تو ہوٹل والوں سے ڈینٹسٹ کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا دیگر ڈاکٹر تو مل سکتے ہیں مگر ڈینٹسٹ صاحبان ہفتہ اور اتوار کو ویک اینڈ پر چھٹی کرتے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان فرانسیسی دوست کو فون کیا اُس سے پوچھا وہ کسی ڈینٹسٹ سے واقف ہے، خوش قسمتی سے ان کا ایک بیٹا ڈاکٹر تھا۔ اُس نے بیٹے کو فون کر کے کلینک کھلوا کر دانتوں کا علاج کروایا، اس نے بھی یہی کہا ہم دانتوں کی عارضی مرمت کر دیتے ہیں پاکستان جا کر روٹ کنال کروالینا جو 3، چار گھنٹوں کا کام تھا۔ البتہ اُس نے ایک ٹوتھ پیسٹ لکھ کر دیا ٹوتھ پیسٹ خرید کر استعمال کیا تو پیسٹ بہت کڑوا تھا بمشکل ہفتہ، اتوار استعمال کر کے پیر کو مزید معائنہ کے لئے ڈاکٹر کو بتایا کہ کافی درد میں افاقہ ہے اور خون بھی بند ہو گیا مگر ٹوتھ پیسٹ ناقابل حد تک کڑوا تھا تو اُس نے برجستہ کہا میں

نے کوئی کینڈی تو نہیں دی تھی دوا دی تھی، وہ تو کڑوی ہوگی۔ ایک ہفتہ استعمال سے دانتوں کو کافی آرام آ گیا۔ ایک درجن ہم نے آئندہ کے استعمال کے لئے خرید لئے کیونکہ ڈاکٹر نے یہی بتایا تھا، دانتوں کے لئے یہ ٹوتھ پیسٹ بہت اکسیر ہے۔ یہ سوئیٹزرلینڈ کا بنا ہوا تھا ہم نے سوچا اس کمپنی سے مل کر پاکستان میں بناتے ہیں۔ اُس وقت عام ٹوتھ پیسٹ جس کا نام نیچرل ٹوتھ پیسٹ تھا ہم پہلے ہی سے بنا رہے تھے جس کی فارمولیشن اور تیاری کے مراحل میں نے خود سیکھے تھے جرمنی کی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کے تحت ڈپلومہ لیا تھا مگر سوئس کمپنی نے بڑا روکھا سا جواب دیا ہم پاکستان میں بنانے کے حقوق نہیں دے سکتے۔ البتہ اگر ہم امپورٹ کرنا چاہیں تو جو نرخ بھیجے تو پاکستان کرنسی میں 400 روپے فی ٹیوب بنتے تھے، جبکہ دانتوں کے درد کا ٹوتھ پیسٹ 50 روپے میں ملتا تھا تو چونکہ میں دیگر ٹوتھ پیسٹ بنانے کا مکمل فارمولا جانتا تھا اور فرانس کے قانون کے مطابق ہر دواء اور ٹوتھ پیسٹ پر فارمولا کے اجزاء درج کرنا لازم ہوتے ہیں تو اجزاء کی مدد سے ہم نے اپنی لیبارٹری میں دانتوں کے درد والے ٹوتھ پیسٹ بنانے شروع کئے۔ تجرباتی طور پر اس کو میٹھا کرنا بھی ضروری تھا چند فارمولوں کی مدد سے ہم اُس کو میٹھا بھی کرنے میں کامیاب ہو گئے،

تو اب نام کا مسئلہ تھا ہماری ادویات بنانے والی کمپنی نام چاس اے مینڈوزا تھا۔ یکا یک میرے ذہن میں اُس سے ملتا جلتا نام آیا یعنی میڈی کیم (Medicam) میڈی میڈیسن کا موقف اور CAM چاس اے مینڈوزا کا موقف بنتا تھا، تجویز ہوا۔ اور ہم نے چند ہی دنوں میں بنا کر مارکیٹ کر دیا مگر پہلے 2 سال بڑی دقتیں پیش آئیں خصوصاً ڈینٹسٹ حضرات میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ کو لکھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ اُس کے دام صرف =/25 روپے تھے، وہ کہتے تھے ہم نئے ٹوتھ پیسٹ لکھ کر اپنے مریض کے دانتوں کے درد کو نہیں روک سکتے نہ ہم رسک لیں گے۔ سینسوڈائن سے ہم مطمئن ہیں۔ 2 سال تک ہم لاکھوں سیمپل ان کو دیتے رہے مگر وہ مریضوں کو نہیں لکھ رہے تھے۔ لاکھوں سیمپل کے عوض چند ہزار فروخت ہو رہے تھے۔ تو مجبوراً ہم سب نے بیٹھ کر اُس کا حل نکالا کہ ڈاکٹروں کے بجائے ہم نے میڈیا کے ذریعے اُس کو دوبارہ لانچ کیا اور بھرپور پبلسٹی کی چونکہ ہمیں پوری امید تھی کہ ٹوتھ پیسٹ میں بہت دم ہے، جس کا مشاہدہ میں خود کر چکا تھا کہ درد، خون دونوں ختم کر دیتا ہے۔ تو اللہ کے فضل و کرم سے پہلے ماہ ہی اُس کا نتیجہ ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں ٹیوب فروخت ہونے لگے پھر عوام کا اعتماد بڑھا اور یہ ٹوتھ پیسٹ کیمیکل

سے پاک تھا۔ صرف خالص لونگ کا تیل، نمک، مینتھول جیسے قدرتی اجزاء تھے اور برس ہا برس کے آزمودہ تھے تو آج 30 سال گزرنے کے باوجود میڈی کیم پورے پاکستان میں زور وشور سے فروخت ہوتا ہے۔ اب تو نئی نسل بھی اس ٹوتھ پیسٹ کو استعمال کر کے دانتوں کے درد سے فوری نجات حاصل کرتی ہے اور پاکستان کا نمبر 1 ٹوتھ پیسٹ بن چکا ہے۔ اس طرح فرانس میں دانتوں کے درد نے پاکستان کے لئے ایک ٹوتھ پیسٹ ایجاد کرا دیا آج کروڑوں پاکستانی اس ٹوتھ پیسٹ یعنی میڈی کیم سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

ووڈورڈز گرائپ واٹر کمپنی کی خریداری

میں لندن میں تھا 1995 میں وہاں میرے ایک پاکستانی دوست نے بتایا ایک دواساز کمپنی ڈبلیو ووڈورڈز پوری دنیا میں فروخت ہو رہی ہے اور پاکستان میں بھی وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے ووڈورڈز کمپنی جو گرائپ واٹر بناتی تھی ہم اُس کے کراچی میں 70 کی دھائی میں ڈسٹری بیوٹر ہوتے تھے۔ سوچا اُس سے معلومات کریں کن شرائط پر فروخت ہو رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے ساتھ لندن گئے تھے وہ اگربتی کے کاروبار سے منسلک تھے مل کر

خرید نے کا پروگرام بنایا۔لندن کے دفتر میں اس کمپنی کے ذمہ داروں سے ملاقات کی انہوں نے ہمیں اپنی شرائط سے آگاہ کیا اور خفیہ ٹینڈر بھرنے کا طریقہ بتایا اور تاریخ بھی مقرر کردی۔ اتفاق سے ہماری پیشکش سب سے زیادہ نکلی تو انہوں نے ہمیں پاکستان میں جا کر فائنل کرنے کا بتایا۔ چونکہ ہم اُس تاریخ کو مقامی ہوٹل میں اُن کی میٹنگ میں شریک ہوئے وہ بورڈ میٹنگ تھی وہاں انہوں نے مقامی ڈائریکٹروں کی موجودگی میں بتایا کہ ہماری پیشکش سب سے زیادہ ہے،لہذا ہم اس کمپنی کو چاس مینڈوزا کے ہاتھ فروخت کررہے ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس 60فیصد مالیت کے شیئرز تھے وہ انہوں نے ہمارے ہاتھ فروخت کردیئے اور 60فیصد کا ہمیں مالک بنا دیا۔ مقامی پاکستانی ڈائریکٹروں کے 40فیصد شیئرز تھے انہوں نے اپنے شیئرز فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور دوسرے دن کورٹس میں ہمارے خلاف مقدمہ درج کرادیا کہ 60فیصد شیئرز فروخت کرنے کا لندن والوں کو اختیار نہیں تھا۔ پہلے اُن کا حق بنتا ہے میں نے کہا آپ نے بھی تو اس خریداری میں حصہ لیا تھا آپ نے کم دام لگائے اس وجہ سے آپ کا ٹینڈر نامنظور ہوا تھا مگر وہ نہیں مانے اور کورٹ کی کاروائی کرتے رہے۔ اس دوران ہمارے ایک دوست نے بیچ میں پڑ کر

40فیصد والوں کو راضی کرلیا اور اُن کے شیئرز بھی ہم نے خرید لئے۔ 2 سال تک چونکہ بہت کم منافع تھا ہمارے دوست یونس اگربتی والوں نے بھی اپنے شیئرز ہمارے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ اس طرح ہم الحمداللہ ووڈورڈز کمپنی کے 100فیصد شیئرز ہولڈر ہوگئے اس طرح لندن جانے کا فائدہ بھی ہوا۔

شنگریلا کا سفر

1986 میں گرمیوں کی چھٹی میں اسلام آباد سے شنگریلا کے لئے فیملی کے ساتھ جانا ہوا۔جس کے لئے اسلام آباد سے چھوٹے فوکر جہاز کے ذریعے اسکردو کے ہوائی اڈہ پر اترے وہاں سے شنگریلا ہوٹل والوں کی وین کے ذریعہ اُن کے ریزارٹ پر پہنچے۔ بہت خوبصورت جھیل پر ریزارٹ تھا، چاروں طرف ہر قسم کے پھلوں کے درخت تھے۔خصوصاً آڑو،خوبانی،چیکو کے درختوں نے ریزارٹ کو گھیرا ہوا تھا وہاں ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ اگر درخت سے توڑ کر پھل کھایا تو فی پھل 25روپے اور اگر زمین سے اٹھا کر کھایا تو 50روپے جرمانہ دینا ہوگا۔ان کی حفاظت کے لئے گارڈز رکھے ہوئے تھے،وجہ پوچھی کہ زمین کے

جرمانے دگنے کیوں ہیں تو انہوں نے بتایا کہ زیادہ تر پھل پک کر زمین پر گر جاتے ہیں جبکہ درخت سے توڑنا آسان نہیں ہے۔بہر حال ایک ہفتے کی چھٹیاں گزار کر جب ہوٹل کا بل آیا تو اس میں سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی شامل نہیں تھی جبکہ ریزارٹ کا شمار 5اسٹار ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔میں نے منیجر سے پوچھا آپ ایکسائز ڈیوٹی لگانا بھول گئے ہیں بل میں شامل کر دیں تو اس نے بتایا یہ PATA کا علاقہ ہے یہاں کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انکم ٹیکس بھی نہیں ہے اور نہ ہی لیبر قوانین ہیں اور کم سے کم اجرت کا قانون بھی نہیں ہے۔ مجھے تعجب ہوا میں نے منیجر سے پوچھا یہاں کا نظام کون چلاتا ہے۔اس نے بتایا کہ ڈپٹی کمشنر کے انڈر میں یہ علاقہ آتا ہے چنانچہ میں نے اس منیجر سے کہا کہ مجھے DC صاحب سے ملوا دو اور اتفاق سے DC کی فیملی اور ان کے کچھ مہمان بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔تو DC خود ملنے آئے ہوئے تھے تو فوراً ملاقات بھی ہوگئی تفصیلاً ان کی زبانی معلوم ہوا واقعی کوئی ٹیکس وغیرہ نہیں ہے۔لیبر اس زمانے میں صرف 500روپے ماہانہ پر مل جاتے تھے۔علاقے میں غربت بہت تھی۔ DC صاحب نے مفت زمین کی بھی پیشکش کی اگر ہم چٹ می کا سمیٹکس کی فیکٹری اسکردو میں لگائیں،انہوں نے بتایا کہ اسکردو ائرپورٹ برفباری

کے موسم میں اکثر بند رہتا ہے،گرمیوں میں آپریٹ ہوتا ہے،سڑکوں سے راستہ بھی برفباری کی وجہ سے 3،چار ماہ بند رہتا ہے یہ مشکلات جھیلنی پڑیں گی۔خیر واپسی پر میں نے اپنے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے دفتر سے معلومات جمع کیں کہ کہاں کہاں ٹیکس نہیں ہے تو معلوم ہوا تمام PATA اور FATA کے علاقے جہاں جہاں قبائلی آباد ہیں وہاں کوئی ٹیکس نہیں ہے اور نہ ہی وہاں پاکستانی قانون چلتا ہے البتہ جرگہ سسٹم عام ہے۔ اگر چہ ایڈمنسٹریشن پاکستان کی ہی ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ DC اور کمشنری نظام نافذ ہوتا جارہا ہے۔FATA میں اسلام آباد سے نزدیک ترین علاقہ سوات کا لگتا ہے جس کا ائرپورٹ بھی مینگورہ میں ہے اور زمینی راستہ تمام سال کھلا رہتا ہے،اور ٹیکس Exempted بھی ہے۔حتیٰ کہ چنگی بھی وصول نہیں کی جاتی اگر کوئی نئی فیکٹری بنائی جائے تو 5 سال تک مقامی ٹیکس بھی معاف ہیں۔لہذا اللہ کا نام لے کر مینگورہ شہر میں پہلی کاسمیٹکس کی فیکٹری چٹ می برانڈ میکس لیونڈر کے نام سے قائم کی اور کراچی سے بند کر کے سوات میں کاسمیٹکس بنانی شروع کر دی۔اُس زمانے میں کاسمیٹکس پر 28فیصد ڈیوٹی لی جاتی تھی جو بہت زیادہ تھی۔ ہماری دیکھم دیکھی کراچی سے دیگر کاسمیٹکس بنانے والے بھی سوات

شفٹ ہونے لگے 2 سال میں تقریباً کراچی والے جب سوات شفٹ ہوگئے تو ٹیکس وصول کرنے والے ادارے FBR والوں کو تشویش ہوئی اس طرح تو ہر ٹیکس دینے والا ادارہ خصوصاً تمباکو اور بیوریجز بنانے والے شفٹ ہوگئے تو ان کا کلیکشن کیسے ہوگا تو انہوں نے تمباکو اور شربت بنانے والے اداروں پر فوراً پابندی کا SRO جاری کر دیا۔ البتہ ہم سے رابطہ کر کے فی الحال سم ٹیکس جمع کروانا شروع کر دیا اور ہر سال اُس میں رضا کارانہ ٹیکس جمع کرواتے رہے اور اس میں اضافہ بھی کرتے رہے۔ حالانکہ قانوناً آج بھی PATA اور FATA میں کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ پھر جب طالبان نے سوات پر قبضہ کیا تو تمام فیکٹریاں بند کرنا پڑیں کیونکہ وہ خواتین کو فیکٹریوں میں کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس طرح 2007 میں کراچی واپس آنا پڑا اور اب یہ فیکٹری واپس کراچی میں قائم کر دی ہے۔

﴿صرف 2 گھنٹے اپنے لئے بچائیں﴾

پندرہ سال پہلے امریکن ٹی وی پر ایک بوڑھے ترکش اور اُس کی بیوی کو دکھایا گیا، بوڑھا ترکش باشندہ ترکی کے ایک چھوٹے قصبے میں رہتا تھا۔ اُس کی بیوی اور بچے بھی ساتھ رہتے تھے۔ اس کی عمر 124 سال اور بیوی 120 سال کی تھی۔ اُس سے ایک ٹی وی اینکر نے پوچھا کہ آپ کی اتنی لمبی عمر کی وجہ کیا ہے، اس بوڑھے نے بتایا ہم نے تمام زندگی صرف دودھ، دہی، پنیر کے علاوہ کچھ نہیں کھایا اور ان کی اولادوں کی عمریں بھی 90 سال سے زائد ہیں۔ سننے والوں سے رائے طلب کی کہ کتنے فیصد لوگ اس غذا پر گزارا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ تو کروڑوں سننے والوں میں سے کسی نے اس غذا کی حامی نہیں بھری اور کہا ایسی لمبی زندگی کا کیا فائدہ جو صرف ڈیڑی فارم تک محدود ہو۔ بھلے ہم صرف 50 ساٹھ سال زندہ رہیں مگر کھا کر مریں وہ بدرجہ بہتر ہے۔

حال ہی میں نیویارک کے ایک باشندے کو ٹی وی پر دکھایا گیا اس کا 111 سالہ برتھ ڈے منایا گیا وہ خود چل کر اپنے دوستوں میں آیا جن کو

اُس نے اپنے گھر میں مدعو کیا ہوا تھا۔اس نے کیک کاٹا دوستوں نے خوب تالیوں میں داد دی،اُس سے پوچھا گیا اُس کی لمبی عمر کی وجہ کیا ہے تو اس نے بتایا وہ ساری زندگی صرف سبزیاں،پھل،شہد،چاکلیٹ،لہسن، دارچینی اور زیتون کا تیل روزآنہ بلا ناغہ استعمال کرتا رہا ہے اور صبح ایک میل واک کر کے ناشتہ کرتا ہے۔پھر زیادہ خوش رہنے کے لئے نئے اور اچھے دوست بناتا ہوں اور خوشگوار زندگی گزار رہا ہوں البتہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کوئی دوائیں استعمال بھی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

قارئین آج سے 40 سال پہلے میں سنگاپور گھومنے گیا وہاں اُن دونوں سگریٹ اور چیونگم کے خلاف ٹی وی پر حکومت کی مہم جاری تھی۔وہ سگریٹ پینے کے نقصانات سے آگاہ کرتے تھے اور ہر ایک ایڈورٹائزمنٹ کے بعد مختلف زاویئے سے پھیپڑوں کے سرطان سے آگاہ کرتے تھے،کافی متاثر انداز میں عوام کو سمجھاتے تھے اور سگریٹ چھوڑنے کے آسان طریقوں سے آگاہ کرتے تھے۔اتفاق سے اُن دنوں میں بھی سگریٹ پیتا تھا۔اُس ایک ہفتے میں بار بار یہ Anti Smoking کمپین سے متاثر ہوکر میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔کچھ دن تو تکلیف ضرور ہوئی مگر پھر آہستہ آہستہ یہ بُری عادت چھوٹ گئی۔اس کا زیادہ فائدہ

پہلے کھیل میں سانس جلدی پھول جاتا تھا اور واک میں بھی جلد ہی تھکن محسوس ہوتی تھی،وہ ختم ہوگئی۔پھر میں نے مختلف کتابوں سے خصوصی طور پر مطالعہ کے ذریعے اچھی صحت مند زندگی گزارنے کی تدابیر پڑھیں۔ان سے میں اپنے قارئین کو آگاہ کرتا ہوں۔سب سے زیادہ ضروری صبح کی واک ہے۔آپ نے سوچا کہ آپ نے 24 گھنٹوں میں کبھی خود اپنے لئے کتنے گھنٹے مخصوص کئے،اکثر نے کبھی نہیں سوچا ہوگا۔آیئے آج سے ضرور سوچیں اور صرف 2 گھنٹے آپ کی زندگی کو صحت مند بنا دیں گے۔صبح سویرے اُٹھیں اور واک کے لئے نزدیکی پارک میں چلے جائیں اگر پارک میں نہیں جانا چاہتے تو اپنے گھر میں ہی واک کریں۔بے شک اپنے کمرے میں 1 گھنٹہ واک کریں۔پھر ایک شربت بنا کر گھر کے فریج میں رکھ لیں اس میں ایک پیالہ ادرک کا جوس،ایک پیالہ لہسن کا جوس، ایک پیالہ سیب کا سرکہ اصلی اور ایک پیالہ شہد ان چاروں کو ملا کر مکس کرلیں اور نہار منہ چار کھانے کے چمچے روزآنہ استعمال کریں۔یہ ایک ماہ سے 2 ماہ کے لئے کافی ہونگے،مگر آپ نے تمام زندگی اس کو جاری رکھنا ہے اس سے آپ کے دل کی شریانوں میں خون نہیں جمے گا۔ناشتہ میں زیادہ سے زیادہ فروٹ،سلاد،کھجور،انجیر،نٹس،2 ابلے ہوئے انڈے،دودھ،قہوہ

یا گرین ٹی کے ساتھ لیں ۔موسم کے لہٰذا سے ہر فروٹ مثلا، کیلا، آڑو، سیب، ناشپتی ، مالٹا، کینو، موسمی اور آم وغیرہ استعمال کریں ۔آم میں کثیر تعداد میں آئرن موجود ہوتا ہے، خون کی کمی کے لئے اور حاملہ خواتین کے لئے بہترین ہے ۔ذیابیطس کے مریضوں کے لئے آم نقصان دے نہیں بلکہ فائدہ مند ہے۔الغرض موسم کے لحاظ سے سبزیوں اور پھلوں کا استعمال نہایت ہی مفید اور فائدہ مند ہے۔اسی طرح دوپہر کھانے میں یخنی، سوپ، سلاد اور سبز سبزیاں مثلا پھول گوبھی، بند گوبھی، پتوں والے شلجم، پالک، بھنڈی، ہرے پتے والی مولی، ساگ وغیرہ، شوربے والے سالن، مختلف دالیں، سی فوڈز، چپاتی اور آخر میں پھر فروٹ ضرور کھائیں۔ چاول کا کم سے کم استعمال کریں۔یہی رات کے کھانا میں ہلکی غذائیں پیٹ بھر کر کھائیں ۔مگر کھانے سے پہلے جو ایک گھنٹہ بچا تھا پھر واک کریں، یا ورزش، کھیل جو آپ کو پسند ہو، ہر حال میں جاری رکھیں ۔ قارئین جب میں سنگاپور گیا تھا تو اس وقت میرا وزن 85 کلو، ہائیٹ 5فٹ 10انچ تھی۔آج میرا وزن 72 کلو ہے میں نے 40 سال میں یہ پابندی سے آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔الحمداللہ کوئی دوائی کی ضرورت نہیں پڑی، جبکہ میرے 90فیصد ہم عمر دوست کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا

ہیں اور دواؤں کے زیر اثر جا چکے ہیں۔مگر صرف 2 گھنٹے اپنے لئے نہیں نکال سکتے۔حتیٰ کہ بہت سے تو نیند کی بھی گولی کے بغیر سو نہیں سکتے۔ بہت سے دل اور گردوں کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔اگر آپ آج سے تہیہ کریں کہ 1 گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام اور جو غذا کا چارٹ اوپر لکھا ہے۔اُس پر عمل کریں، نیز فاسٹ فوڈ، پیزا اور ٹھنڈی کولڈ ڈرنک وغیرہ سے دور رہیں اور انرجی ڈرنک البتہ ہر موسم میں گھر کا بنا ہوا جوس استعمال کریں۔ (میں نے اپنے آپ کو آج تک ان سب چیزوں سے دور رکھا ہوا ہے)۔تو زندگی میں آپ کو فرق محسوس ہونا شروع ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ آپ سے دوائیں کم ہونا شروع ہو جائیں گیں اور آپ صحت مند زندگی کی طرف رواں دواں ہونگے۔

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	سب سے پہلا شرقی پاکستان کا سفر	01
2	پہلا غیر ملکی ہوائی سفر ہانگ کانگ بذریعہ چائنا	04
3	جاپان	06
4	امریکہ کا پہلا سفر	09
5	برطانیہ کا پہلا سفر	12
6	پہلا عالمی دورہ (Round The World Trip)	17
7	ترکی کا سفر	19
8	بیروت کا سفر	20
9	سعودی عرب کا سفر	23
10	یورپی ممالک کا سفر	28
11	سوئٹزرلینڈ کا سفر	31
12	جرمنی کا سفر	33
13	فرانس کا سفر	35
14	بھارت کا پہلا سفر	40
15	سری لنکا کا دورہ	43
16	مالدیپ	45
17	یورپی ممالک	46
18	ہنگری کا سفر	47
19	تائیوان کوریا کا سفر	48
20	صومالی لینڈ، جبوتی، ایتھوپیا	49
21	مصر	51
22	ترکی	52
23	کینیڈا	53
24	یو۔اے۔ای	55
25	یہ ہی ہماری سارک کانفرنس تھی	59
26	امریکہ میں دو ہفتے	63
27	پاک چین دوستی زندہ باد	67
28	دو براعظموں کے پڑوسی ملکوں کی کہانی	72
29	سلی کونچن (بیوقوفی کا سوال)	77
30	س۔ش۔عزیز	81
31	ہندوستان کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے	85
32	مصر کے انقلاب کے بعد؟	89
33	بنگلہ دیش میں صرف تین دن کا قیام	93
34	ہماری ڈرگ پالیسی اور بنگلہ دیش کی پالیسی	98
35	پونٹا کانا (Puntacana)	103
36	بھارت کا دورہ اور پولیس رپورٹنگ	107
37	کاش ہم چین سے کچھ سیکھیں	112
38	دنیا کا غریب ترین صدر	116
39	کینیڈا میں جنت کے مزے اور عید	119
40	کینیڈا کے ایک دوست کا مشورہ	123
41	برف سے بنا ہوا ہوٹل	126

42	پاپا گویا بیچ (Papa Goya Beach)	130
43	ایک بھارتی شادی صرف ایک ارب روپے کی	135
44	سوازی لینڈ کے بادشاہ کو چودھویں ملکہ کی تلاش	140
45	جرمنی میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت	143
46	کوسٹاریکا میں 6 دن	147
47	ایک انجکشن کی کہانی	151
48	ایک ہفتہ تھائی لینڈ میں	155
49	ہوائی جزیروں کی سیر	159
50	شرم الشیخ کی کہانی	162
51	کینیڈا میں ایک ہفتہ	168
52	کینیڈا کی سیر	173
53	استنبول کی سیر	178
54	ایک امیر ترین ملک	182
55	ایک مسلمان ملک ملائیشیا میں کیا دیکھا	185
56	شام کے دارالخلافہ دمشق میں 5 دن	190
57	سری لنکا سے تجارت	196
58	صومالی لینڈ کے حکمران	199
59	کینیڈا میں مذہبی آزادی	205
60	کینیڈا میں پاکستانیوں کی خدمات	209
61	کینیڈا میں بچوں کا ہسپتال	213
62	کینیڈا کے شب و روز	217
63	ترکی کے سمندر اور پہاڑی علاقے جہاں سرکاری بجلی نہیں ہے	221
64	کینیڈا کی پتھریلی پہاڑیوں کا سفر	226
65	دنیا کا امیر ترین صدر؟	230
66	ایک ہفتہ آذربائیجان کی سیر	234
67	صومالی لینڈ سے تجارت کریں	239
68	اُردن میں ایک ہفتہ	243
69	ترکی کے شہر بُرسا (BURSA) کی سیر	248
70	یورپ کی ترقی کا راز	252
71	امارات کی 40 سالہ جشنِ آزادی	256
72	یورپ میں گزرے اذیت ناک پانچ دن	260
73	نویں ورلڈ کانفرنس اعزازی قونصلر	263
74	سب سے بڑی لندن میں واردات	267
75	لندن کا افسوس ناک واقعہ	271
76	اس کالم کو کیا عنوان دوں؟	276
77	مراکش اور اسپین میں مسجد قرطبہ کی سیر	280

سب سے پہلا مشرقی پاکستان کا سفر

1966ء میں سب سے پہلا سفر کراچی سے مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر بھی تجارتی سفر تھا۔ ڈھاکہ بھی بہت صاف ستھرا شہر تھا۔ خاص طور پر جھیل کا علاقہ کمرشل ایریا تھا۔ یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں۔ یعنی مغربی پاکستان کے برعکس جہاں کبھی کبھی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہاں تقریباً روز ہی بارش ہوتی تھی۔ پہلے تو بہت مزا آیا مگر جب روز ہی روز بارش ہو تو کام کیسے ہوتا۔ آئے دن ہڑتالیں کرنا ان کا مسئلہ تھا۔ 2 فیصد غیر بنگالی لوگ تھے جن میں مغربی پاکستان کے اور بھارت سے ہجرت کرنے والے اُردو اسپیکنگ تھے جنہیں عرف عام بہاری کہا جاتا تھا۔ یعنی غیر بنگالی خواہ وہ مہاجر ہو، پنجابی یا پٹھان ہو بہاری سمجھا اور کہا جاتا تھا۔ کاروبار انہی 2 فیصد افراد کے پاس تھا یا پھر ہندو بنیوں کے پاس تھا۔ 90 فیصد عوام انتہائی غربت کی زندگی گزارتے تھے۔ مشرقی پاکستان بار بار تجارت کیلئے آتا جاتا رہا۔ 1969ء سے بہاریوں اور بنگالیوں میں کشیدگی شروع ہو چکی تھی۔ خصوصاً سیاست دانوں کی چپقلش اور مجیب الرحمان کی اگرتلہ سازش کیس کے بعد سے بنگالی مسلمان ہندو بنگالی کی باتوں میں آکر مغربی پاکستانیوں کے خلاف ہو رہے تھے۔ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے چونکہ مشرقی پاکستان میں ایک سیٹ کے علاوہ تمام پر کامیابی حاصل کر لی تھی اس لئے اب وہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی

جماعت بن کر ابھری تھی۔ اس لئے وہ حکومت بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صدر یحییٰ خان نے 3 مارچ 1971ء کو اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا تھا۔ اتفاق سے میں 3 مارچ کو ڈھاکہ میں تھا۔ کہ یکا یک ایک بجے کے قریب عوام سڑکوں پر نکل آئے اور حکومت کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام بازار بند ہو گئے میں اُس وقت موتی جھیل میں پی آئی اے کے دفتر میں تھا۔ کہ پی آئی اے کے دفتر میں دونوں شٹر گرا کر ہم اندر ہی بیٹھے رہے۔ یکا یک شٹروں پر پتھروں کی بارش ہو گئی بہ مشکل تمام پچھلے راستے سے ہم جان بچا کر نکلے اور سیدھے ہوٹل کی راہ لی۔ یحییٰ خان نے دراصل بغیر کسی صلاح مشورہ کئے 3 مارچ کا اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔ جو مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کو منظور نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے ہڑتال کی کال دی اور یہ موثر ترین ہڑتال ثابت ہوئی جس سے عوامی لیگیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اب وہ عوام کو بغاوت پر اُکسا رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس تنظیمیں، مزدور تنظیمیں، مکتی باہنی سب مل کر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ 23 مارچ کو پاکستان کا جھنڈا جلایا گیا۔ اور پہلی مرتبہ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ مجبوراً مغربی پاکستان سے فوج منگوا کر اس کے خلاف فوجی آپریشن کیا گیا۔ لاکھوں ہندو مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ کاروبار ٹھپ پڑ گئے۔ میں نے جو کمپنی میڈیسن سپلائی ایجنسی چٹاگانگ میں 1967ء میں خریدی تھی۔ مجھے مجبوراً چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔ بہت سے اُردو بولنے والے مارے گئے زیادہ افراد کو نقصان پہنچایا گیا۔ جون میں جا کر کچھ امن ہوا۔ واپس چٹاگانگ گیا ہندو ڈرے ہوئے تھے مگر حالات بدستور خراب تھے۔ یہاں تک کہ بھارت نے نومبر 1971ء میں چٹاگانگ ڈھاکہ پر فضائی حملہ شروع کر دیا اور اب مشرقی پاکستان میں دست بہ دست لڑائی شروع ہو گئی۔ اور اس طرح 16 دسمبر کو ڈھاکہ خالی ہو گیا۔ اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اس زمانے کے حساب سے تقریباً 4 لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ کیونکہ میڈیسن سپلائی ایجنسی میں اتنی ہی مالیت کا مال رکھا ہوا تھا، جو وہیں رہ گیا خوش قسمتی

سے ہم سب لوگ مغربی پاکستان میں تھے ۔لہذا جانی نقصان نہیں ہوا ۔یہ بھی اللہ کا بہت شکر تھا کہ ہم لوگ رمضان المبارک کی بدولت بچ گئے ۔بہت دُکھ ہوا کہ ہمارا ملک بھارت نے دولخت کر دیا،

اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

پہلا غیر ملکی ہوائی سفر ہانگ کانگ بذریعہ چائنا

18 مارچ 1967ء کو پہلا غیر ملکی سفر کیا کراچی سے ہانگ کانگ جانے کے لئے پی آئی اے کے جہاز سے کینٹن پہنچے کیونکہ کراچی سے ڈائریکٹ کوئی فلائٹ ہانگ کانگ نہیں جاتی تھی ۔یہ میرا پہلا غیر ملکی سفر تھا عمر بھی صرف 23 سال تھی ۔چائنا پہنچا تو ایک رات پی آئی اے نے کینٹن میں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا 800 کمروں کا بہت بڑا ہوٹل تھا ۔اور ہم صرف 50 مسافر تھے ۔سارا ہوٹل خالی تھا ۔بہت بڑے بڑے کمرے تھے ۔ان میں لاک سسٹم نہیں تھا صرف آپ اندر سے چٹخنی لگا سکتے تھے ۔چینی عملہ ایک لفظ بھی انگریزی سے واقف نہیں تھا ۔ریسٹورنٹ میں بھی ہم لوگ ہوتے تھے ۔پی آئی اے کا عملہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا ۔باہر جانے کی اجازت نہیں تھی ۔بڑی بڑی سڑکوں پہ صرف سائیکل سوار نظر آتے تھے ۔کسی کا کوئی ذاتی کاروبار نہیں تھا ۔سب کمیونسٹ پارٹی کا راج تھا ۔ہر دیوار، ہر چوراہے، ہر بس ٹرین سب جگہ ماؤزے تنگ کی تصویریں تھیں ۔حتیٰ کہ وہاں حضور ﷺ کے صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا مزار تھا ۔وہاں بھی ماؤ کی تصویر کنندہ تھی ۔دوسرے دن ٹرین سے ہانگ کانگ پہنچے بہت خوبصورت شہر تھا بڑی بڑی عمارتیں تھیں ۔ان دنوں ہانگ کانگ ڈالر ہم سے بھی سستا تھا ۔یعنی 62 پیسے میں ایک ہانگ کانگ ڈالر تھا ۔جو آج تقریباً 8 روپے کا ہو چکا ہے ۔صرف 5 دن قیام کیا جو مال خریدنا تھا ۔وہ بُک کرایا ۔ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کو بہت بڑا آرڈر دیا ۔جس سے کافی منافع ہوا ۔دوسری ٹرین

سے 5 دن بعد پھر کینٹن جانا پڑا۔ کیونکہ آنے جانے کے لئے صرف چائنا سے ہی ایک راستہ تھا کینٹن سے 24 مارچ کو واپس کراچی براستہ ڈھاکہ پہنچے خوب سیر کی اور خوب شاپنگ کی کیونکہ ہانگ کانگ کراچی کی نسبت بہت سستا تھا۔ جہاں دنیا جہان کی چیزیں بہت ارزاں ملتی تھی۔ خاص طور پر کپڑے، پرفیوم، کاسمیٹکس بہت سستا تھا۔ اسی طرح الیکٹرونک کے آئٹم بھی بہت سستے تھے۔ ریڈیو، ٹی وی، گھڑیاں سب ہی سستی تھیں۔ کیونکہ ہانگ کانگ ڈیوٹی فری ملک تھا۔ اس وجہ سے یہاں ایشیائی باشندے شاپنگ کے لئے آتے تھے۔ کوئی ویزہ نہیں تھا۔ بڑے بڑے ہوٹل، کیسینو، بڑی بڑی عمارتیں، تجارتی مراکز تھے۔ عوام چینی بولتے تھے۔ اس سے ملا ہوا ایک جزیرہ تھا۔ اس کا نام مکاؤ تھا یہ پرتگیزیوں کی کالونی سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح ہانگ کانگ برطانیہ کی کالونی تھا۔ مکاؤ میں 90 فیصد صرف کیسینو تھے۔ یہی اس کا ذریعہء معاش تھا۔ یہاں بلی کتوں مرغیوں کی بھی ریس ہوتی تھی۔ ہر گلی جوئے خانے اور ریسٹورنٹوں ہوٹلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ بھی بہت خوب صورت شہر تھا۔ جس میں چینی بولی جاتی تھی۔ عیاشیوں کے اڈے عام تھے۔ اسی وجہ سے ٹورسٹ بھرے رہتے تھے۔ جس فارماسیوٹیکل کمپنی سے ہم نے تجارت کی اور کافی آڈر دیئے ایک دن اس کی فیکٹری بغیر اُس کو بتائے (کیونکہ ہم نے یہ پتہ ٹیلیفون ڈائریکٹری سے لیا تھا) وہاں پہنچ گیا وہ ایک انڈسٹریل بلڈنگ تھی۔ اور اس میں ایسی 5 فیکٹریاں کام کر رہی تھیں۔ جو کسی بھی طرح سے فارماسیوٹیکل فیکٹری کہلانے کی مستحق نہیں تھیں۔

Ok\Book Images\001 Hang Kong.tif not found.

ہانگ کانگ کے دورہ کی چند یادگار تصاویر

جاپان

1968ء میں جاپان کا تجارتی دورہ کیا۔ بہت خوبصورت شہر ٹوکیو میں پہلی مرتبہ گیا۔ بہت نفیس لوگ ہوتے تھے۔ بہت پڑھے لکھے خاموش طبیعت انتہائی مہنگا ملک تھا۔ ایک ڈالر میں 500 ین ملتے تھے۔ ایک وقت کا کھانا اس زمانے میں 25 ڈالر میں اور ایک کمرہ 150 ڈالر میں ملتا تھا۔ جاپانی دوستوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت صاف ستھرا چھوٹا گھر زمین پر چٹائیاں ہوتی ہیں۔ جوتے، چپل باہر ہی اتارتے ہیں۔ 18 گھنٹے کام کرتے ہیں۔ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ کیونکہ ٹوکیو دنیا میں سب سے زیادہ مہنگے شہروں میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ یہاں مذاق میں لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ میں رات ہوتے ہی عوام کو لوٹا جاتا ہے۔ اور جاپان میں صبح ہوتے ہی لوٹنا شروع کر دیا جاتا تھا۔ اس سے مراد جاپان کی مہنگائی کی طرف ہے۔ جاپان میں 2 واقعات پیش آئے۔ اتفاق سے پاسپورٹ کی مدت ختم ہو رہی تھی اور امریکہ جانا تھا تو ہم پاکستان ایمبیسی پہنچے، بہت دکھ ہوا یہ دیکھ کر کہ ایمبیسڈر صاحب کا مکان تو بہت خوبصورت تھا مگر ایمبیسی بہت تھرڈ کلاس تھی۔ ہم نے ایمبیسڈر سے ملاقات کا وقت مانگا۔ بڑی مشکل سے پاکستان ایمبیسی کا عملہ راضی ہوا۔ جب ایمبیسڈر صاحب سے دفتر اور رہائش گاہ کے فرق پر بحث کی تو ہمارے ایمبیسڈر ناراض ہو گئے پوچھنے لگے آپ کس لئے آئے تھے ہم نے بتایا کہ ہم آئے تو پاسپورٹ کی تجدید کروانے آئے تھے مگر ایمبیسی کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہنے لگے ہم

2برس سے حکومت سے فنڈ مانگ رہے ہیں۔مگر فنڈ نہیں مل رہا ہے۔میں نے اعتراض کیا کہ جب فنڈ ملے تھے تو پہلے رہائش گاہ کے بجائے دفتر کو درست کرنا چاہئے تھا۔ایمبیسیڈر صاحب نے آئیں بائیں شائیں کی پھر بولے جناب آپ پاسپورٹ کی تجدید کرالیں اور ہمیں معاف کریں۔اُس زمانے میں پاسپورٹ پر حج کے زمانے میں سعودی عرب داخلے پر پابندی کی مہر لگائی جاتی تھی۔میں نے کہا کہ نئے پاسپورٹ میں یہ مہر نہ لگائیں تو مہربانی ہوگی بادلِ ناخواستہ ایمبیسیڈر صاحب نے یہ مہر لگانے سے منع کر دیا تاکہ میں حج کے لئے جاسکوں۔مگر افسوس کہ میں حج اور عمرہ کیلئے نہیں جاسکا۔ان کی مہربانی بھی بے کار گئی۔کیونکہ لندن میں سعودی ایمبیسی ویزہ لینے گئے تو شاہ خالد کے انتقال کی وجہ سے ایمبیسی بند تھی۔

جاپان بھی تقریباً سال میں 2 تین تجارتی دورے ہوتے ہیں۔دوسرا اہم واقعہ امریکن ایمبیسی میں پیش آیا۔یہ بھی ٹوکیو میں امریکن ایمبیسی میں گیا تاکہ وہاں سے امریکہ کا ویزہ لے کر جاؤں کیونکہ اتفاق سے ٹوکیو میں ایک امریکن کمپنی جس کا نام کریمر اربن کارپوریشن تھا۔اُس کی ایجنسی ہم نے چاس اے مینڈوزا کے ساتھ خریدی تھی۔اس نے امریکہ آنے کی دعوت دی ہم چونکہ کراچی سے ٹوکیو آچکے تھے لہذا وہ دعوت نامہ ہم کو بذریعہ فیکس ٹوکیو میں ملا ہم اس فیکس کو لے کر امریکن ایمبیسی گئے۔امریکن قونصل نے صرف اس وجہ سے کہ ہم بار بار چائنا جاتے رہے ہیں۔ویزہ دینے سے انکار کر دیا۔اور پاسپورٹ کو کاؤنٹر سے جان بوجھ کر نیچے گرادیا۔ہم نے بہت بُرا مانا ایک تو اس نے ویزہ دینے سے انکار کیا اور دوسرا ہمارے پاسپورٹ کی توہین کی۔جس کا ہم نے احتجاج کیا اور کہا کہ ہم اُس کے قونصل جنرل سے ملنا چاہتے ہیں۔پہلے تو اُس نے ٹالا مگر ہم بھی اڑے رہے تب جاکر اس نے قونصل جنرل سے ملنے کا وقت لے کر دیا۔سارا دن ہم ایمبیسی کے سامنے بیٹھے رہے کیونکہ وقت شام 3 بجے کا تھا۔اور ہم صبح گیارہ بجے پہنچے تھے۔اللہ اللہ کر کے شام 3 بجے ہم جنرل قونصل سے ملنے اس کے کمرے میں گئے اُس سے شکایت کی کہ ہمارے ساتھ پاسپورٹ کی بے عزتی ہوئی کا واقعہ جان بوجھ

کر کیا گیا ہے۔جس کا اس نے بھی نوٹس لے لیا اور اُس قونصل کو بلوایا اس نے کہا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا اس نے معذرت کی اور پوچھا کہ آپ امریکہ کیوں جانا چاہتے ہیں۔میں نے وہ دعوت نامہ نکال کر دکھایا اس نے پوچھا کہ آپ چائنا کیوں جاتے رہے ہیں۔میں نے اس کی وجہ بتائی کہ وہاں کیمیکل اور دیگر ادویات امریکہ کی نسبت سستی ہیں۔اس لئے ہم وہاں جاتے رہے ہیں۔اس نے ہم سے کافی سوالات اور کئے اور ہمیں امریکہ کا ویزہ دے دیا۔اور کہا کہ آپ پہلے پاکستانی ہیں جنہیں پاکستان کے باہر امریکہ کا ویزہ مل رہا ہے۔خاص طور جو بار بار چائنا کا دورہ بھی کرتا رہا ہو۔خیر وہاں سے بھی کامیاب واپس لوٹا اور پھر ٹوکیو سے امریکہ روانہ ہوگیا۔

Ok\Book Images\002 Japan.tif not found.

جاپان کے دورے کے موقع پر یادگار تصاویر

امریکہ کا پہلا سفر

پاسپورٹ پر امریکہ کا ویزہ ملا جو C.1 تھا۔یعنی صرف ایک وزٹ کا ویزہ تھا 30 دن کی اجازت تھی کی ہم وہاں گھوم پھر سکیں۔چونکہ کاروباری دعوت ملی تھی لہذا شکاگو کے پاس ایک دوسرے شہر ملوا کی جانا تھا وہاں اُس امریکن کمپنی کریمر ار بن انٹرنیشنل جس کا لوگو یعنی مونوگرام کے یو کے نام سے مشہور ادویات سازی کا مرکزی دفتر تھا۔اس کمپنی کی مارکیٹنگ چاس اے مینڈوزا جو کمپنی ہم نے 1967ء میں خریدی تھی وہی پاکستان میں کرتی تھی۔درمیانی قسم کی کمپنی تھی۔نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی البتہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اس کمپنی کی ادویات ایکسپورٹ ہوتی تھیں۔شربت، کیپسول، گولیاں اور انجکشن کے آٹومیٹک پلانٹ لگے ہوئے تھے۔تمام ادویات چھوٹی پیکنگ میں ایکسپورٹ کرتے تھے۔جس کی وجہ سے کافی مہنگی ثابت ہوتی تھی۔لہذا میرا موقف یہ تھا کہ ہم بلک (Bulk) پیک یعنی ہزار ہزار گولیاں، کیپسولوں کی پیکنگ کروا کر یہاں پاکستان میں (Repack) دوبارہ چھوٹی پیکنگ میں کریں اسی طرح شربت کے گیلن پیک امپورٹ کر کے ہم چھوٹی بوتلوں میں دوبارہ پیک کریں تو کافی قیمتوں میں کمی ہوسکتی ہے۔کئی روز تک میٹنگیں چلتی رہیں کیونکہ اس کمپنی نے ابھی تک بلک سپلائی کا سوچا تک نہیں تھا۔بہر حال پانچویں دن ان کو بلک پیکنگ منظور کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ماضی میں چاس اے مینڈوزا کے پہلے مالکان نے سالانہ جتنا مال امپورٹ کیا تھا اُس

سے کم از کم 2 گنا مال میں بلک میں امپورٹ کروں گا۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسرے سال 5 گنا مال امپورٹ ہوگیا تو میں دوبارہ امریکہ گیا اب کے میں نے پاکستان سے 5 سال کا B-1 ویزہ لیا تھا دوسرے سال میں نے ان کا مال پاکستان میں مینوفیکچر کرنے کی اجازت مانگی تا کہ قیمت اور کم ہو سکے انہوں نے ایک امریکن کمپنی کی معرفت کیپسول اور ٹیبلٹ بنوانے کی اجازت دے دی۔1972ء میں انہوں نے ہماری کمپنی کو بھی مال بنانے کی اجازت دے دی کیونکہ اب وہ ہم سے کافی مطمئن ہو چکے تھے۔بدقسمتی سے 1973ء میں وزارت صحت نے ڈرگ ایکٹ 1953ء منسوخ کر کے جینرک ایکٹ 1973ء نافذ کر دیا جس کی رو سے اب ادویات صرف جینرک نام سے بنیں گی۔بیشتر غیر ملکی کمپنیوں نے جینرک نام سے ادویات بنانے سے انکار کر دیا اور اپنی فیکٹریاں بند کر دیں۔اُس کا فائدہ مقامی کمپنیوں کو ہوا۔اسی طرح اس امریکن کمپنی نے بھی جینرک ایکٹ کے تحت مال بنانا بند کر دیا۔مگر اُس وقت تک الحمدللہ چاس اے مینڈوزا نے اپنی ادویات اور KU کی ادویات جنرک نام سے رجسٹرڈ کروا کر بنانے کی اجازت لے لی تھی تو اب تمام مال مینڈوزا فیکٹری میں بننا شروع ہوگیا اور اُس امریکن کمپنی سے معاہدہ ختم کرنا پڑا۔جب سے آج تک مینڈوزا کی ادویات تمام پاکستان میں فروخت ہوتی ہیں۔اس کے بعد بھی امریکہ جاتا رہا۔مگر 1967ء میں جب ملوا کی سے پہلی مرتبہ نیویارک گیا تو KU کے چیئرمین نے خصوصی طور پر مجھے ڈنر پر مدعو کیا اور کہا کہ تم پہلی مرتبہ نیویارک جا رہے ہو۔اپنا خیال رکھنا رات دیر تک باہر نہ رہنا نہ 10 بجے کے بعد انڈر گراؤنڈ ٹرین میں سفر کرنا، کوشش کرنا کہ اکیلے گھومنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ گھومنا۔کیونکہ عموماً یہ کالے امریکن غیر ملکیوں کو لوٹ لیتے ہیں۔خاص طور پر جب ہمیشہ 50 سے 100 ڈالر تک ضرور رکھنا۔زیادہ بھی نہیں رکھنا۔اُس زمانے میں کوئی کریڈٹ کارڈ کا پاکستان میں سسٹم نہیں تھا۔بلکہ ٹریولر چیک یا نقد کا رواج تھا آج بھی مجھے اس کی اس نصیحت پر بڑا تعجب ہوا تھا کہ ہم تو پاکستان کو نسبتاً کم محفوظ سمجھتے تھے یہاں تو دنیا کا سب سے بڑا سپر

پاور ملک خود امریکہ غیر محفوظ تھا۔ کم از کم کراچی میں تو رات گئے تک لوگ گھومتے پھرتے تھے۔ یہ نیو یارک جس کا بڑا چرچا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اتنا غیر محفوظ ہو سکتا تھا۔ یعنی 40 سال قبل امریکہ کے شہر غیر محفوظ تھے۔ مگر آج بالکل اس کے برعکس ہو چکا ہے کراچی غیر محفوظ ہو چکا ہے اور نیو یارک میں آپ آزادی سے گھوم سکتے ہیں۔ ایک شام 6 بجے نیو یارک میں اچانک بجلی چلی گئی میں 17 ویں فلور پر ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ میرا ہوٹل بھی مین ہٹن پر واقع تھا۔ جوں جوں رات بڑھتی جا رہی تھی براڈوے ڈراؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک دوکانوں کے شٹر ٹوٹنا شروع ہو گئے۔ ہوٹل کے مین گیٹ پر سیکورٹی والے آ گئے اور صرف ہوٹل میں ٹھہرے مسافروں کو رُکنے کی اجازت تھی۔ لفٹ بند ہو چکی تھی باہر جانا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ رات بھر ہوٹل میں جو بھی سامان تھا۔ پانی، کولڈ ڈرنک سب ختم ہو چکا تھا۔ باتھ روم میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ نلوں میں بھی پانی ختم ہو چکا تھا صبح منرل واٹر سے کام چلایا دوسرے دن پولیس نے کالوں اور لوٹنے والوں کو قابو کیا۔ پولیس اسٹیشن بھر گئے۔ حتیٰ کہ ان مجرموں کو جو دوکانیں لوٹ رہے تھے۔ پکڑ پکڑ کر اسکولوں کی عمارتوں میں بند کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بہت سی لڑکیوں کو اغوا کر کے ان سے کالوں نے زیادتی کی۔ میری فلائٹ دوسرے دن تھی میں دوپہر بہ مشکل ایئر پورٹ پہنچا۔ اُس وقت تک ایئر پورٹ پر ایمرجنسی لائٹ کام کر رہی تھی پھر نیو یارک کی بجلی بھی جزوی طور پر بحال ہو چکی تھی جہاز سے بیلجیم روانہ ہو گیا۔ بار بار امریکہ جانے کا اتفاق رہا۔ بہت شہر گھومے جن میں شگاگو، ملواکی، نیو یارک، اورلینڈو، لاس ویگاس، ڈیلاس، نیو جرسی، فی نیکس، میامی، ڈزنی ورلڈ، واشنگٹن فلوریڈا قابل ذکر ہیں۔

برطانیہ کا پہلا سفر

پاکستان سے پہلی مرتبہ کراچی ائرپورٹ سے پی آئی اے کے ذریعے لندن روانہ ہوا۔ 1968ء ماہ جون یا جولائی کا مہینہ تھا۔ لندن ایئرپورٹ پر اترا بہت سردی تھی۔ اُس زمانے میں برطانیہ کا ویزہ ایئرپورٹ پر ہی مل جاتا تھا۔ سامان کلیئر کروا کر باہر آیا سردی سے دانت بج رہے تھے۔ ایک پاکستانی جن کا نام اب یاد نہیں رہا میرے پاس آیا پوچھا کیا پہلی بار لندن آنا ہوا ہے۔ میں نے جواب دیا جی ہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں پوچھا کہاں ٹھہرو گے میں نے بتایا سنٹرل لندن میں کسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہروں گا۔ انہوں نے کہا چونکہ آپ نئے ہو اگر آپ چاہیں تو میرا غریب خانہ حاضر ہے مگر وہ لندن سے ذرا باہر ہے اُس جگہ کا نام اسٹیرنگ کامن ہے وہاں ٹیوب اسٹیشن تو نہیں ہے مگر ہر آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین لندن آتی جاتی ہے۔ ہم نے لندن ایئرپورٹ سے شہر جانے والی بس لی جس کا کرایہ صرف 1/2 پونڈ تھا۔ اُس زمانے میں 10 روپے کا پونڈ آتا تھا۔ اگر ٹیکسی لیتے تو کم از کم 5 پونڈ لگتے تھے۔ ہم دونوں نے بس کا ٹکٹ لیا۔ پیسے بھی اُس اللہ کے نیک بندے نے دیئے۔ سنٹرل لندن میں وکٹوریہ آخری اسٹاپ تھا۔ وہاں ہم اتر گئے۔ وکٹوریہ بس اسٹینڈ کے اندر ہی وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن اور وکٹوریہ ٹیوب اسٹیشن تھا۔ ٹیوب اسٹیشن لندن کی زبان میں زمین دوز ٹرینوں کو کہتے ہیں جو تمام لندن میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی ہیں۔ میں چونکہ بالکل واقف نہیں تھا، لہذا اُن کی مہمان داری قبول کر لی۔ ٹرین سے ہم دونوں

اسٹیرلنگ کامن پہنچ گئے۔اُن کا گھر اسٹیشن کے سامنے ہی گلی میں تھا۔پیدل ہم سامان اُٹھا کر گھر پہنچ گئے۔اُن کے مکان میں ایک کمرہ اور ڈرائنگ روم تھا۔اوپر اُن کی فیملی رہتی تھی۔لندن کا ٹائم پاکستان سے تقریباً 5 گھنٹے پیچھے تھا۔اس لئے 8 گھنٹے کی پرواز صرف 3 گھنٹوں کے فرق سے دن میں ہی اتری تھی۔اس لئے دوپہر کا کھانا کھا کر سوگیا۔بہت تھکن تھی اس لئے لیٹتے ہی نیند آگئی۔رات کو آنکھ کھلی کسی نے نہیں جگایا۔معلوم ہوا میرے میزبان صاحب کام پر چلے گئے ہیں۔اکیلے رات کا کھانا کھایا اب چونکہ نیند پوری ہو چکی تھی۔لہذا باہر ٹہلنے نکلا تو سردی کی وجہ سے سڑکیں سنسان تھی۔ایک آدھ ریسٹورنٹ کھلا تھا اور ایک آدھ بار کھلا تھا۔اکیلے کا خوف بھی غالب تھا۔لہذا گھر واپس آگیا کیونکہ یہاں زیادہ آبادی بھی نہیں تھی۔نہ کوئی پاکستانی نظر آیا۔کافی رات گئے تک جاگتا رہا پھر سوگیا۔دس بجے صبح ہمارے میزبان تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں جہاں 12 گھنٹے کام ہوتا ہے جس میں 4 گھنٹے اوور ٹائم ہے۔رات کی ڈیوٹی کرتے تھے۔جس سے تقریباً 2 تنخواہوں کے برابر معاوضہ مل جاتا تھا۔جس سے وہ جس مکان میں رہتے تھے اُس کا قرضہ اتر رہا تھا اور یہ مکان انہوں نے 5 ہزار پونڈ میں خریدا تھا۔جس کی قسطیں اتارنے کے لئے وہ رات کی ڈیوٹی اور اوور ٹائم کرتے تھے۔صرف ہفتہ اور اتوار کی چھٹی کرتے تھے۔لہذا انہوں نے دن میں بھی معذرت کر لی تھی۔کیونکہ تمام دن وہ سوتے تھے۔میں نے اُن سے کہا کہ ہفتہ کے دن وہ مجھے لندن گھما دیں تاکہ میں لندن سے واقف بھی ہو جاؤں۔چنانچہ انہوں نے ہفتہ اور اتوار خوب لندن کی سیر کروائی۔یہاں میں نے پہلی انڈین فلم مغل اعظم دیکھی۔وہ آدھے پونڈ کا ٹکٹ تھا جس میں انٹرویل میں 2 عدد سموسے بھی ملے۔یہ علاقہ ایسٹ لندن کا تھا یہاں بھارتی اور پاکستانی کافی تعداد میں رہتے تھے۔بالکل لی مارکیٹ کی طرح (بیک ورڈ) قدیم علاقہ تھا دو شو دیکھے، رات ایک ملباری کے ہوٹل سے پاکستانی کھانا کھایا بالکل پاکستان کے طرز پر جب کاؤنٹر پر پہنچا تو اُس نے آواز لگائی دو بھائی سے ایک پونڈ لو۔میرے میزبان

نے پھر پیسے دینے چاہے تو میں نے ناراضگی سے کہا کہ اب آپ خرچ نہیں کریں گے میں خرچ کرونگا ورنہ میں آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔بڑی مشکل سے وہ مجھ سے پیسے لینے پر راضی ہوئے۔ایک آدھ کاروباری کام بھی تھا پیر کو ملنے کے لئے سنٹرل لندن کے وکٹوریہ ہوٹل جس کا نام گروونر ہوٹل تھا۔اُس میں ٹھہر گیا بہت بڑا ہوٹل تھا بڑے بڑے کمرے تھے۔مگر کرایہ صرف 3 پونڈ 3 شلنگ تھا۔ناشتے کا بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ایک ہفتہ تک لندن میں ٹھہرا رہا کئی پاکستانی دوست بن گئے۔ان دنوں بہت کم لوگ پاکستان سے باہر جاتے تھے۔کیونکہ پاسپورٹ کا حصول اتنا ہی مشکل تھا جتنا آج کل ویزوں کا حصول یعنی پہلے ویزے تھے تو پاسپورٹ نہیں ہوتا تھا۔اب پاسپورٹ ہیں تو ویزے نہیں ملتے۔انتہائی سستا زمانہ تھا۔حکومت پاکستان صرف 200 سو ڈالر فارن ایکسچینج دیتی تھی۔جو 2 سال کے بعد ہی ملتا تھا۔بقایا کام آپ کو ہنڈی کے ذریعے کرانا پڑتا تھا۔ڈالر حکومت کے ذریعے 4 روپے بارہ آنے (475 پیسے) میں ملتا تھا۔جبکہ ہنڈی میں 9 روپے ملتا تھا۔یعنی ہر کرنسی تقریباً ڈگنے داموں بلیک سے ملتی تھی۔لہذا بچا بچا کر خرچ کرنا پڑتا تھا۔بلکہ اگر آپ اس کو کنجوسی سے خرچ کرنا کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔اُس کے بعد بہت مرتبہ لندن آتا رہا۔پھر مانچسٹر، لیک ڈسٹرکٹ، برسٹل جاتا رہا۔بہت خوبصورت علاقہ تھا ایک مرتبہ ہمارے مشہور کرکٹر ظہیر عباس کا بھی مہمان رہا۔وہ برسٹل سے مجھے لینے آئے۔اُن کی میزبانی بہت پُرخلوص تھی۔ایک ہفتے اُن کے گھر برسٹل میں مقیم رہا۔دن بھر اُن کا میچ دیکھتا رہا۔رات اُن کے ساتھ گھومتا تھا۔بڑے یادگار دن تھے آج 30 سال گزر چکے ہیں مگر گزرا ہوا کل لگ رہا ہے۔خاص طور پر جب میں امریکہ سے 1976ء میں لندن پہنچا تو امریکہ سے میں نے اُن کو فون کر دیا تھا۔ائرپورٹ پر وہ اپنی بیگم نجمہ کے ساتھ تشریف لائے واپسی پر نجمہ نے مجھ سے کہا کہ بھائی آپ گاڑی چلا لیں کیونکہ رات کا وقت ہے اور 2 ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے یہ میچ کھیل کر آئے ہیں کافی تھکے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی یہ گاڑی چلاتے ہوئے نیند بھی لے لیتے ہیں۔میں گھبرا گیا کیونکہ نیویارک

سے 8 گھنٹے کی فلائٹ سے لندن پہنچا تھا۔لہذا میں خود بھی تھکا ہوا تھا۔مگر جب میں نے یہ سُنا کہ موصوف گاڑی چلاتے ہیں اور نیند بھی لے لیتے ہیں۔تو بادلِ ناخواستہ حامی بھر لی راستہ میں ایک پیٹرول پمپ پر گاڑی روک کر گیس لینے کے لئے رُکے۔ظہیر عباس نے شیشہ اتار کر پیٹرول بھرنے کا آڈر دیا۔تو وہ پیٹرل ڈالنے والا بار بار ظہیر عباس کو غور سے دیکھ رہا تھا جب پیٹرول سے فارغ ہوا۔تو اس نے پوچھا کیا آپ ہی "زیڈ" ہو ظہیر عباس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ بہت خوش ہوا اس نے ظہیر عباس سے ہاتھ ملایا۔اپنی طرف سے کولڈ ڈرنک بھی ہم سب کو پیش کی۔جب مجھے معلوم ہوا انگریزوں نے ظہیر عباس کا نام زیڈ رکھا ہوا ہے اور وہ ہمارے کھلاڑیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔راستہ چونکہ ہائی وے تھا ٹریفک رات کی وجہ سے زیادہ نہیں تھی لہذا 2 گھنٹوں میں ہم پہنچ گئے۔ظہیر اور نجمہ دونوں نے میری ڈرائیونگ کی تعریف کی۔جب میں نے انہیں بتایا کہ پہلی مرتبہ میں نے پاکستان کے باہر گاڑی ڈرائیو کی ہے۔اور میرے پاس لائسنس بھی نہیں تھا۔کیونکہ پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس غیر ممالک میں کارآمد نہیں ہوتا اس لئے میں ساتھ نہیں رکھتا تھا۔یہ سُن کر دونوں اُچھل پڑے اگر پولیس خدانخواستہ کہیں روک لیتی تو سزا بھی ہو سکتی تھی۔میں نے کہا موت کے منہ میں جانے سے بہتر تھا کہ جیل جاتے، کیونکہ ہائی وے پر اگر آپ نیند فرما جاتے اور گاڑی ٹکرا دیتے تو موت یقینی تھی۔لہذا میں نے یہ رسک لینا زیادہ بہتر سمجھا تھا جس سے تین افراد کو فائدہ تھا۔خیر مذاق میں وہ مجھے کئی دن تک چھیڑتے بھی رہے۔لندن ہمیشہ سے بڑا غریب نواز شہر ہے یہاں دنیا کی تمام قومیں آباد ہیں۔یہاں پہلے بالکل تعصب نہیں ہوتا تھا۔ہر انگریز دوسری قوموں کا احترام کرتا تھا۔نوکریاں، پاسپورٹ، شادیاں ایک عام بات تھی۔اُس زمانے میں چند ہزار پاکستانی رہتے تھے۔آج لاکھوں پاکستانی معہ اپنے خاندانوں کے ساتھ آباد ہیں۔اب یہاں کے شہری بن چکے ہیں جن میں تاجر، ڈاکٹر، لیبر، انجینئر، ٹیچر زغرض ہر شعبہ میں وہ نظر آتے ہیں۔پاکستانی کھانے برطانیہ میں بہت مشہور ہیں۔

خاص طور پر بار بی کیو تو انگریزوں کا من بھاتا کھانا ہے۔ویک اینڈ پر پاکستانی ریسٹورنٹ اُن سے بھرے ہوتے ہیں۔انگریز عوام دوست ہوتے تھے۔کالے گورے کا فرق نہیں ہوتا تھا۔برابری کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے یہ لوگ بہت ملنسار تھے۔برطانیہ کے لوگ آج بھی ایشیائی باشندوں سے مل جل کر رہتے ہیں۔نسل رنگ وقوم کا بہت کم فرق ہے۔حالانکہ اُن کی خوراک تہذیب وتمدن میں بہت فرق ہے مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وہ اپنے کلچر کو فروغ دے سکتے ہیں۔مسلمانوں کی مساجد آج برطانیہ کے کونے کونے میں واقع ہیں اور اسی طرح ایشیائی ریسٹورنٹس بھی ہر چھوٹے بڑے شہروں میں عام ہیں۔ان میں زیادہ تر برطانوی نوجوان اور عمر رسیدہ افراد بڑے شوق سے جاتے ہیں۔خاص طور پر بار بی کیو جس کو وہ تندوری کے نام سے جانتے ہیں اُن کی مرغوب غذا بن چکی ہے۔ہمارے بیشتر ریسٹورنٹس میں ویک اینڈ پر جگہ ہی نہیں ملتی۔اور تو اور انہوں نے اپنے چرچ بھی مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں اور آج اُن کی جگہ پر مساجد بن چکی ہیں۔

پہلا عالمی دورہ(Round The World Trip)

1970ء میں پہلا عالمی دورہ افغانستان سے شروع کیا۔وہاں سے ایران ،ترکی سے ہوتے ہوئے ہم ایتھنز پہنچے افغانستان میں بھارت کی فلمیں دیکھیں۔کابل میں پختونستان کا جھنڈا دیکھا۔چونکہ ہم پاکستان،ایران،افغانستان کے امریکی ادویات کریمیرار بن کارپوریشن KUC کے ایجنٹ تھے۔لہذا کاروباری دورہ تھا۔اُس زمانے میں Red Pass پر بھی پاکستانی عوام آجاسکتے تھے۔خاص طور پر پشاور کے پٹھان تو انہی ریڈ پاس پر سفر کرتے تھے۔افغانستان کے عوام پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ مگر حکومت شاہ ظاہر شاہ کے بھارت سے اچھے تعلقات تھے۔اسی طرح ایران کے عوام پاکستانی عوام سے محبت نہیں کرتے تھے۔اُن کو غالباً کسی خاص مصلحت کے تحت پاکستان دشمنی کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ مگر شاہ ایران کے پاکستان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ایران میں ایک دن جمعہ کی نماز کے لئے پاکستان ایمبیسی جانا تھا۔کیونکہ صرف پاکستان ایمبیسی میں مسجد تھی۔بقایا جگہ شیعہ حضرات کے لئے امام بارگاہ ہوتی تھی۔ٹیکسی کے ذریعہ پاکستان ایمبیسی پہنچا تو ڈرائیور نے اُسی سڑک پر 1/2 کلومیٹر دور اتار دیا کہ سڑک کا نام یہی ہے۔مجھے اب ایمبیسی تلاش کرنی تھی۔ایک شخص نزدیک سے گزرا تو میں نے اُس سے کہا کہ پاکستانی سفارت خانہ کہاں ہے۔اُس نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے آؤ۔میں اس کے پیچھے چل پڑا کوئی پانچ منٹ بعد مجھے ایک عمارت پر پاکستانی جھنڈا نظر آیا۔میں نے اس شخص کا

شکریہ ادا کیا اور ایمبیسی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔اُس ایرانی شخص نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا یہی وہ جگہ ہے۔جہاں تم نے جانا تھا میں اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے کہا کہ 10 ایرانی ریال دو، میں نے تمہیں یہ جگہ دکھائی ہے میں نے جیب سے ایرانی کرنسی میں سے اسے راستہ دکھانے کی قیمت ادا کی جو نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد مجھے ایسے واقعہ کا سابقہ پڑا تھا۔

افغانستان کے لوگ پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے تھے جس سے بھی ملاقات ہوتی تھی وہ کھانے کی دعوت ضرور دیتے تھے مگر ایرانی ایسے خلوص کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔میں نے اپنا ہنی مون بھی افغانستان کے شہر مزار شریف میں شادی کے 4 سال بعد منایا تھا۔

ترکی کا سفر

اس زمانے میں ترکی اور چائنا کے عوام کو پاکستان کے عوام سے بڑھ کر محبت کرتے دیکھا، ترکی کے عوام تو پاکستانیوں کی خاطر و مدارت میں خود پاکستان کے اپنے دوست احباب سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ایک ڈالر کے عوض 14 ترکش لیرا ملتے تھے۔ زیادہ مہنگائی نہیں ہوتی تھی اب تو ایک ڈالر کئی لاکھ لیرے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ مگر ترکی کے عوام کی پاکستانی عوام سے محبت آج بھی سب سے بہتر ہے۔

بیروت کا سفر

1972ء میں یورپ کے دورے سے واپسی پر بیروت ایئر پورٹ جانا تھا۔ کیونکہ وہاں سے جدہ ایئر پورٹ جا کر عمرہ ادا کرنا تھا۔ صرف ایک رات کا STAY تھا جو برٹش اورسیز ائرلائنز کارپوریشن نے مجھے ایک دن ٹھہرنے کے لئے ائیر پورٹ سے ٹیکسی اور ہوٹل میں ٹھہرانے کا واؤچر دیا۔ باہر سامان کے ساتھ آیا تو ٹیکسی والے نے واؤچر لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ 10 ڈالر ادا کرنا ہوگا۔ وہاں پولیس والا کھڑا تھا میں نے اُس سے شکایت کی تو اُس نے کہا کہ واپس جا کر BOAC کے عملہ سے رابطہ کریں انہیں اُس کی شکایت کریں میں نے اپنا سامان پولیس والے کے پاس چھوڑا اور واپس ائیر پورٹ کی عمارت میں BOAC والوں کے پاس پہنچا تو سب سے پہلے خاتون نے مجھ سے پوچھا تمہارا سامان کہاں ہے میں نے کہا وہ میں باہر ایک پولیس والے کے حوالے کر آیا ہوں۔ اُس نے کہا جلدی کرو اور واپس اُس پولیس والے سے اپنا سامان واپس لاؤ ساتھ ہی وہ میرے ہمراہ کاؤنٹر سے نکل کر ایئر پورٹ کے باہر بھاگی، ہم دونوں بھاگتے ہوئے واپس ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر آئے دیکھا تو وہاں کوئی پولیس والا نہیں تھا اور نہ ہمارا سامان تھا۔ اُس نے اپنے واکی ٹاکی سے کسی سے بات کی تو 10 منٹ بعد ایک پولیس والا ہمارا سامان واپس لے کر آ گیا۔ اُس نے کہا خدا کا شکر کرو کہ تمہارا سامان مل گیا۔ دراصل یہاں پولیس والے بھی مسافروں سے ایسی حرکت کر لیتے ہیں۔ آئندہ کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا۔

وہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے ہمارے عملے نے اس پولیس والے کو سامان لیجاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔تو انہوں نے اس سے واپس دلوادیا چونکہ ایک رات بیروت میں ٹھہرنا تھا لہذا ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو فون کیا تو کسی نے اٹینڈ نہیں کیا سوچا جا کر خود مل کر آجاتا ہوں۔رات کے سات بجے تھے ہوٹل سے باہر آکر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے جو پتہ میرے پاس لکھا تھا اُس کو دکھایا اُس نے کہا کہ صرف جانا ہے یا واپس بھی آنا ہے میں نے کہا جانا ہے اور واپس بھی آنا ہے اُس نے 10 ڈالر مانگے میں نے اس سے مول تول کئے تو وہ 8 ڈالر پر راضی ہوگیا۔بیروت سے میں بالکل ناواقف تھا ٹیکسی میں بیٹھ گیا دس، 15 منٹ بعد میں اُس جگہ پر پہنچا تو وہ دوست نہیں تھا۔میں نے اس کے نام خط لکھ کر دیا کہ میں فلاں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور دوسرے دن شام میں میری جدہ فلائٹ ہے اگر مجھ سے ملنا ہے تو مجھے ہوٹل پر فون کرلو۔دوسرے دن اُس کا صبح ہی صبح فون آیا کہ میں رات کو بہت دیر سے آیا تھا سوچا کہ تمہیں رات تکلیف نہ دوں لہذا اب صبح تم مجھ سے ملنے آجاؤ۔میں نے سوچا پھر 10 ڈالر خرچ ہونگے تو میں نے کہا تم کیوں مجھ سے ملنے نہیں آجاتے تو وہ بہت ہنسا کہ میرا دفتر تو تمہارے ہوٹل کی صرف دوسری بلڈنگ سے ملحق ہے اور تم رات بھی آچکے ہو تو میں نے سوچا کہ تم 1/2 منٹ میں ہی آجاؤ گے۔میں نے اُس کو رات کا ٹیکسی ڈرائیور کا واقعہ سُنایا کہ اُس نے 10 پندرہ منٹ میں تمہارے گھر پر چھوڑا تھا اور واپسی پر بھی اتنا ہی ٹائم لگایا تھا وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا بھائی یہ لبنان ہے یہاں ہر فراڈ ہوسکتا ہے تم ہمیشہ جب بھی لبنان آؤ تو کسی پر بھی بھروسہ نہ کرو، بیروت میں صرف ایک سڑک ہے جو ائیر پورٹ سے شروع ہوتی اور بیروت کے آخری سرے تک جا کر ختم ہوتی ہے۔اس کا نام الحمرہ اسٹریٹ ہے آپ کسی بھی ٹیکسی میں بیٹھیں یہ صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی 25 سینٹ (لبنانی پاؤنڈ) لیتے ہیں جو ایک ڈالر میں تین آتے ہیں۔اُس کا بھی ایک چوتھائی سکہ بنتا ہے۔اُس ڈرائیور نے آپ کے ساتھ فراڈ کیا کہ آدھے گھنٹے تک وہ آپ کو سڑکوں پر گھماتا رہا وہ سمجھ گیا ہوگا کہ آپ اجنبی ہیں ورنہ یہ

بلڈنگ تو اسی ہوٹل سے ملحق ہے۔یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ بیروت کے لوگ اتنے چالاک تھے اور ثابت بھی ہوا کہ اسی ایک سڑک پر پورا شہر آباد تھا۔ہزاروں شراب خانے، جوا خانے اور کھانے کے ریسٹورنٹ تھے جہاں لوگوں کا اژدھام ہوتا تھا۔رات کے 2 بجے تک سڑکیں، گلیاں عوام سے بھری ہوتی تھیں اسی وجہ سے عوام عیاش، چالاک اور فراڈ میں بہت آگے ہوتے تھے۔اسی وجہ سے 15 سال بعد بیروت اپنے ان ہی بُرے کاموں کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔اُس کے بعد میں نے کبھی بیروت جانے کی ہمت نہیں کی۔

سعودی عرب کا سفر

1972ء میں بیروت سے سعودی عرب پہنچا۔ پہلا عمرہ کیا اس وقت جدہ بہت ہی چھوٹا شہر ہوا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو پاکستان سے جدہ میں اسی BOAC میں کام کرتے تھے۔انہوں نے اپنے گھر ٹھہرایا اور رات جدہ سے مکہ عمرہ کے لئے میری مدد کی اور عمرہ کرایا بہت ہی نفیس آدمی تھے، مجھے ان کا پورا نام یاد نہیں البتہ ان کا نک نام قدوائی تھا عمرہ ادا کرنے کے بعد واپس انہوں نے مجھے جدہ سے کراچی روانہ کردیا۔عمرہ کی سعادت کے بعد اگلے سال حج کی ادائیگی کے ارادے سے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر 1973ء میں پھر سعودی عرب آ گیا۔عمرہ کیا پھر حج کے زمانے میں حج ادا کیا۔اُس زمانے میں ٹرانسپورٹ بہت خراب ہوتی تھی۔جدہ ائیر پورٹ نان ائیر کنڈیشن ہوتا تھا اور مسافروں کو بھی واپسی یا سفر کے لئے ایک دن پہلے ائر پورٹ پر بلایا جاتا۔بسیں بھی پرانی اور نان ائیر کنڈیشن ہوتی تھیں گرمی کا زمانہ تھا۔حج بہت ہی تکلیف دہ تھا نہ ہوٹل ہوتے تھے نہ سہولتیں تھیں۔ معمولی سرائیں یا ہوٹل بغیر ائر کنڈیشن ہوتے تھے۔جدہ کا کُل رقبہ شاہراہ عبدالعزیز ہوتا تھا جو تین کلومیٹر کے اندر تھا۔مکانات کچے ہوتے تھے اسی طرح مکہ 2 ڈھائی کلومیٹر پر مشتمل تھا۔حجاج مقامی لوگوں کے گھروں کو حج کے لئے کرایہ پر لے لیتے تھے جس کا کل حج کا ایک ماہ کا کرایہ 300 ریال ہوتا تھا۔ ایک ریال اُس زمانے میں تین روپے میں ملتا تھا۔5,4,3,2 اسٹار ہوٹلوں کا کوئی تصور نہیں تھا کچے

پکے مکانات ہوتے تھے۔حجاج انہی گھروں میں قیام کرتے تھے۔مکہ میں جنت المعلی یعنی قبرستان شہر سے باہر ہوتا تھا۔میرے ایک عزیز جو حج پر آئے تھے۔حج سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا تھا انہیں دفنانے رات جب جنت المعلی پہنچا تو سنسان جگہ پر واقع تھا۔سڑکیں بھی کچی تھیں لائیٹیں بھی مدہم تھیں نماز جنازہ حرم میں پڑھایا گیا اور پھر حکومت ہی ان کی تجہیز وتدفین کرتی تھی قبرستان میں ایک بہت بڑا گھڑھا تھا۔اُس کے سرے سے پتھر ہٹا کر لاش اس کے اندر پھینک دی گئی یہ تھی تدفین جو میں نے دیکھی حج سے واپسی پر ایک دن قبل ائر پورٹ پہنچا کاؤنٹر پر میرا پاسپورٹ جو 24 گھنٹے پہلے لیا گیا تھا۔ PIA والوں نے بتایا ان کو معلم نے واپس نہیں دیا اس کی معلومات کے لئے سامنے الگ کاؤنٹر تھا۔ وہاں میں پہنچا تو اس شخص نے کہا کہ ہاں تمہارا پاسپوٹ میرے پاس ہے۔کیونکہ تم نے اپنے آنے اور جانے کا اندراج پولیس میں نہیں کرایا تھا لہذا 100 ریال جرمانہ ادا کرو۔اتفاق سے میں نے تمام رقم خرچ کر ڈالی تھی۔میرے پاس چند ریال بچے تھے کیونکہ اب صرف واپسی تھی۔خاندان والوں کے لئے تحائف وغیرہ خرید لئے تھے۔میں نے اُس سے کہا کہ میرے پاس اب دینے کے لئے 100 ریال نہیں۔لہذا میرا پاسپورٹ واپس کردو۔اس نے انکار کردیا مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا تم کیسے مسلمان ہو کہ ایک دوسرے مسلمان سے جزیہ لیتے ہو شرم نہیں آتی جبکہ میں بتا چکا ہوں میرے پاس نقد رقم نہیں ہے۔تمام ریال اور ڈالر خرچ کر چکا ہوں وہ بھی غصے میں آ گیا کہنے لگا تم نے حج کیا ہے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ 100 ریال دو گے تو میں تمہارا پاسپورٹ واپس کروں گا۔چونکہ PIA کی فلائٹ لیٹ ہو رہی تھی۔ پی آئی اے کا ایک نمائندہ میری طرف آیا مجھ سے پوچھا تمہارا نام یہی ہے تو میں نے کہا ہاں کہنے لگا چلو جہاز پر تمہارا سامان جا چکا ہے۔تم یہاں کیا کر رہے ہو میں نے تمام واقعہ سُنایا اُس نے بھی اس شخص سے درخواست کی ان کو جانے دو اس نے کہا 100 ریال کے بغیر جانے نہیں دونگا۔ اس شریف پاکستانی نے اس کو اپنی جیب سے 100 ریال دیئے اور میرا پاسپورٹ لے کر مجھے جہاز پر

چڑھادیا۔میں نے اس سے پتہ مانگا کہ کراچی میں اس کے گھروالوں کو 100 ریال کے برابر رقم ادا کردونگا۔اس نے کہا آپ بھی پاکستانی ہیں میں بھی پاکستانی ہوں کوئی بات نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے۔اس طرح میں جہاز میں سوار ہوااور آئندہ کے لئے سعودی عرب آنے کی توبہ کرلی کہ جو کام غیر مسلم نہیں کرتے ہمارے مسلمان کس طریقے سے جرمانے لے کر کرتے ہیں۔اس طرح تقریباً 20 سال تک سعودی عرب نہیں گیا۔میرے چھوٹے بھائی عبداللہ مینی تال والا کوجگر کی بیماری لاحق ہوگئی تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔اُن کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے ایک حج کرلیا جائے۔حالانکہ وہ پہلے حج کر چکے تھے میں نے اُن سے وعدہ کیا انشاءاللہ وہ حج ضرور کریں گے۔اللہ نے ان کی زندگی زیادہ نہیں لکھی تھی حج کے موقع سے پہلے وہ انتقال کر گئے۔اُن کا وعدہ نبھانے کے لئے میں نے 1992ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کیا۔پھر الحمد اللہ ہر سال حج کی سعادت ملتی رہی۔اسی طرح رمضان المبارک میں متواتر عمرہ کی سعادت ملتی رہی اور اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ ہر سال 1992ء کے بعد سے عمرہ کی سعادت ہر رمضان میں ملتی ہے۔اور ہر سال ایک عمرہ اپنے مرحوم بھائی کی طرف سے میں ادا کرتا ہوں۔شاید چھوٹے بھائی کی وجہ سے میں نے سعودی عرب نہ جانے کا ارادہ ختم کردیا تھا۔ورنہ جس طرح سے اُس پہلے حج میں میرے ساتھ واقعات ہوئے تھے کوئی بھی شخص دوبارہ اس سرزمین پر جانے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ان کا اخلاق بالخصوص بنگلہ دیشی،پاکستانی اور بھارتی ممالک کے حاجیوں کے ساتھ بہت خراب ہوتا تھا۔اکثر دوکاندار تو ان کی شکل دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے تھے۔مگر اب نئی نسل جواب جوان ہوچکی پڑھی لکھی سمجھدار بھی ہے۔اس کو معلوم ہے کہ اب معیشت ہی سب کچھ ہے اس لئے ان کی زندگی تبدیل ہوچکی ہے پھر سعودی حکومت نے بھی زراعت صنعت و حرفت میں کافی ترقی کرلی ہے۔رہن سہن تبدیل ہو چکا ہے ہر سال رمضان شعبان میں تقریباً 25 لاکھ عازمین عمرہ پوری دنیا سے آتے ہیں۔اسی طرح چند لاکھ حجاج کے بجائے 30 لاکھ تک مسلمان تقریباً

دنیا کے ہر ملک سے حج کرنے آتے ہیں۔خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں بہت توسیع ہوچکی ہے عبادت گزاروں کا مجمع ہوتا ہے نئے نئے ہوٹل بن چکے ہیں چند کلومیٹر مکہ کا رقبہ پھیل کر شہر سے باہر جاچکا ہے ہوٹل کے کرائے نزدیک حرم بہت مہنگے ہو چکے ہیں۔خصوصاً حج اور رمضان میں 10 دس گنا زیادہ ہوجاتے ہیں یوں عام آدمی کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔اس لئے ایرانی،ترکی،سوڈانی،بنگلہ دیشی حجاج یا زائرین (حرم) سے دور ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔اگرچہ بھارتی اور پاکستانی حجاج وزائرین حدود حرم میں ٹھہرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس طرح وہ پانچ وقتہ نمازیں باآسانی ادا کر لیتے ہیں۔البتہ کھانے پینے کی چیزیں اُسی قیمتوں میں ٹھہری ہوئی ہیں۔مگر آج کا ریال 16 روپے ہے جبکہ 1973ء میں صرف تین روپے کا ہوتا تھا۔صرف تین سال کے مختصر عرصہ میں سعودی عرب نے ہر میدان میں خواہ زراعت ہو معاشیات انجینئر،بینکنگ،کنسٹرکشن،ہوائی جہاز،ٹیلیفون،آئی ٹی سب شعبوں میں ہم سے آگے ہیں۔باوجود اس حقیقت کے ہمارے پاکستانیوں نے انہیں بینکنگ،ہوائی جہاز،بجلی،کنسٹرکشن، معاشیات سب ہی عہدوں پر رہ کر اُن کی مدد کی تھی۔80 فیصد ڈاکٹر،پروفیسر صاحبان کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔70 فیصد مزدور بھی پاکستانی تھے۔پھر سعودی عرب کو حج اور عمرہ کے زائرین کی وجہ سے بھی زبردست ترقی ہوئی۔جبکہ ابتدائی دور میں بہ مشکل چند لاکھ عازمین حج آتے تھے۔عمرہ زائرین کی تعداد تو ایک لاکھ سالانہ بھی نہیں تھی جو مستقل بڑھ رہی ہے اُسی لحاظ سے یہاں کے حکمرانوں نے جن میں شاہ فہد بن عبدالعزیز مرحوم اور شاہ فیصل شہید نے توسیع خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے۔آج بیک وقت خانہ کعبہ میں 25 لاکھ افراد حدود حرم میں نماز ادا کرسکتے ہیں اور تقریباً 5 لاکھ افراد فریضہ حج کے دوران طواف ادا کرسکتے ہیں۔خانہ کعبہ میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ تک حدیث مبارک میں ذکر آیا ہے اور مسجد نبوی میں ایک ہزار سے پچاس ہزار تک کے متعلق ذکر پایا جاتا ہے۔حج اور عمرہ کے لئے مشہور ہے کہ جب تک وہاں سے بلاوا نہیں آتا مسلمان اس فریضہ سے

مستفیض نہیں ہوسکتے ۔حج اہل ثروت کے لئے صرف ایک لازمی ہے اس کے بعد تمام نفل حج ادا ہونگے ۔عمرہ فرض نہیں ہے البتہ موکدہ ہے ۔نمازوں کا ثواب اگر جمع کرلیا جائے تو ایک مسلمان کو جس کی عمر 60 اور 70 سال پہنچنے تک ہزاروں سال پر مشتمل ثواب کما سکتا ہے ۔البتہ ایک خیال ضرور رکھنا ہوگا۔ کہ سعودی عرب کے لوگ بہت غصہ ور Short Tamper ہوتے ہیں ۔اُن کا رویہ غیر سعودیوں خصوصاً پاکستان، بھارت، بنگلہ دیشیوں سے اچھا نہیں ہوتا ۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے ۔کہ سعودی عرب کی تعمیر میں انہی تین قوموں نے حصہ لیا تھا وہ ہر ایک کو مزدوروں کی نگاہ سے دیکھتے ہونگے ۔حالانکہ خود سعودی عرب میں پاکستان کی طرح غربت بھی پائی جاتی ہے ۔امیر طبقہ بہت امیر ہے اور غریب طبقہ بہت غریب ہے اب البتہ درمیانی طبقہ بھی ظہور پذیر ہو چکا ہے اس میں نوجوان پڑھے لکھے شامل ہیں ۔سعودی عرب کی ایک عجیب وغریب پالیسی بھی ہے کہ آپ ایک شہر سے دوسرے شہر صرف اجازت نامہ سے آجاسکتے ہیں ۔عمرہ اور حج جدہ، مکہ اور مدینہ تک محدود ہے بقایا شہروں کے لئے اجازت نامے ضروری ہیں ۔حتی کہ ایک شہر سے دوسرے شہر داخل ہوتے وقت پاسپورٹ یا اقامہ پولیس چوکی پر چیک کیا جاتا ہے جو کسی اور ملک میں نہیں ہوتا ۔تیل معدنیات سے بھی سعودی عرب خود کفیل ہے ۔

یورپی ممالک کا سفر

یورپی ممالک جن میں ہالینڈ، بیلجیئم، سوئیڈن، اٹلی، ڈنمارک شامل ہیں بہت مختصر قیام رہا۔مجموعی طور پر صرف سیاحت تک محدود رہا۔ان ممالک سے میرے ذاتی کاروباری مراسم نہیں تھے ۔کئی مرتبہ کوشش بھی کی مگر ان ممالک کی درآمدی اشیاء بہت مہنگی ہوتی تھیں ۔ہمارا چونکہ ادویات یا اس سے متعلق کیمیکل یا پیکنگ میٹریل ہوتا تھا وہ چائنا، یا کمیونسٹ ممالک کی نسبت بہت مہنگا ہوتا ہے ۔جس کی وجہ سے تجارتی دورے 2 یا تین ہی ہوسکے ۔سوائے اس خوبی کے بہت خوبصورت نظارے جن میں دریا، پہاڑ، پھل، پھولوں سے لدے درخت بہترین اور جدید ترین سفری نظام خواہ سڑکوں کے ذریعے ہو یا سمندری یا ہوائی راستوں سے ہو ایک سے ایک عمدہ تجربہ ہوتا تھا ۔لوگ بھی بہت ملنسار خوبصورت پڑھے لکھے ہوتے ہیں ۔ایک سے ایک بڑھ کر اسکول، کالج، ہوٹل عمارتیں، شاہی قلعہ، چڑیا گھر، کیسینو، عجائب گھر سب قابل دید ہوتے ہیں ۔بندہ اکیلا بھی بور نہیں ہوتا اوپر سے موسم اتنا خوشگوار کہ جنت کا گمان ہوتا ہے ۔سڑکیں انتہائی صاف ستھری ۔ٹریفک اتنی ڈسپلن میں ہوتی ہے کہ اگر رات کے 12 بجے ہوں تو کوئی سگنل توڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا ۔پولیس بھی بہت با اخلاق ہے اگر آپ راستہ بھول جائیں یا راستہ پوچھیں تو ایک عام آدمی بھی آپ کی مدد کے لئے تیار ملے گا۔ریلوے اسٹیشن اتنے صاف ستھرے ہونگے کہ آپ کو ٹرین کے انتظار میں بوریت نہیں ہوگی ۔تمام ضروری کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال

ہونگے ۔بیت الخلاء صاف ستھرے ہونگے ہر بڑے ریلوے اسٹیشن کے باہر تین سے چار اسٹار ہوٹل ہونگے خود ریلوے کے اپنے بھی زیر انتظام ہوٹل ہوتے ہیں جو درمیانی درجہ کے کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ یہ صاف ستھرے ہوادار ہوتے ہیں ۔سرد ممالک ہونے کی وجہ سے اکثر ہوٹلوں میں ایئر کنڈیشن نہیں لگے ہوتے ہیں ۔پاکستان کی نسبت بہت مہنگائی ہے ۔عام طور پر ایک روٹی 100 روپے تک ایک کھانے کی پلیٹ 600 روپے سے لے کر ایک ہزار روپے تک ہوسکتی ہے۔ مجھے 100,100 روپے میں عام سموسے کی پلیٹ جس میں صرف تین عدد ہوتے ہیں کھانے کا اتفاق رہا ہے۔ گوشت البتہ حلال بہت مشکل سے ملے گا۔صرف پاکستانی یا مسلمان ممالک کے ریسٹورنٹس جن میں ترکی سرفہرست ہے۔وہاں مختلف کبابوں کی شکل میں ملے گا۔مگر جیب خالی کرالے گا۔بہتر ہے کہ دام دیکھ کر ہی آڈر دیں تو اس میں عافیت رہے گی ورنہ بل آنے پر پسینہ بھی آنے کا امکان ہے۔ دراصل 30 سال میں ہی کرنسی 5 روپے کے ڈالر سے 60 روپے یعنی 12 گنا گر چکی ہے۔تو ہماری قیمتوں سے کم از کم 12 گنا تو قیمت ویسے ہی زیادہ ہوگی ۔پھر بعض ممالک کی کرنسی 30 گنا تک بڑھ چکی ہے۔تو اسی لحاظ سے اس ملک کی قیمت خرید بڑھے گی ۔وہاں مہنگائی کی ایک وجہ مزدوروں کی تنخواہیں،جگہ کا کرایہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہاں ٹیکس کی شرح بھی بہت زیادہ ہے ہر چیز جو آپ خریدتے ہیں اُس پر ٹیکس ہے۔مگر اسی طرح اس کے بدلے عوام کو بے پناہ سہولتیں بھی میسر ہیں ۔سوشل سیکورٹی ،مفت تعلیم،علاج و معالجہ، بے روزگاری الاؤنس،عوامی پارکس،بہترین سڑکیں ہی ان کا نعم البدل ہیں۔یعنی اگر آپ بھر پور ٹیکس دے رہے ہیں ۔تو بھرپور آسائشی لوازمات سے مستفیض ہوسکتے ہیں ۔بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی بہت ٹیکس تو نافذ ہیں ۔مگر اس کے مقابلے میں عوام کو سہولتیں بہت کم ہیں بس یہی فرق ہے یورپین سسٹم اور پاکستانی سسٹم کا،وہ ٹیکس عوام سے وصول کر کے عوام پر خرچ کرتے ہیں ۔جبکہ ہم عوام سے ٹیکس وصول کر کے حکمرانوں، غیر معمولی افواج،پولیس، رینجرز،سرکاری اہلکاروں کی بھرمار پر خرچ

کر ڈالتے ہیں ۔جبکہ تعلیم جیسی اہم ضرورت کو نظر انداز کر کے بہ مشکل بجٹ کا 2 فیصد بھی خرچ نہیں کرتے ۔اسی وجہ سے ہماری شرح تعلیم بہ مشکل 20 فیصد تک پہنچتی ہے وہ بھی شہروں کی حد تک محدود ہے۔

سوئٹزرلینڈ کا سفر

سب سے پہلے 1970ء میں سوئٹزرلینڈ اکیلے جانے کا اتفاق ہوا۔جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے زیورخ پہنچا۔بہت ہی چھوٹا ائرپورٹ تھا یعنی کراچی سے بھی چھوٹا تھا۔ایک چھوٹی سی خوبصورت کول بلڈنگ تھی ۔غالباً ایک یا 2 منزل ہوگی لیکن کاؤنٹر تھے میں نے پاسپورٹ رکھا اس نے پوچھا اس میں تو سوئٹزرلینڈ کا ویزہ نہیں ہے۔میں نے کہا تمام یورپ گھوم کر آرہا ہوں کسی نے بھی ویزے کا نہیں پوچھا اس نے جواباً کہا یہ سوئٹزرلینڈ ہے یہاں ویزہ درکار ہے میں نے کہا میں تو گھومنے نکلا ہوں اگر آپ اجازت دیں گے تو میں سوئٹزرلینڈ گھوم لوں گا۔اور آئندہ آتے ہوئے اس کا خیال رکھوں گا۔اس آفیسر نے کہا اگر آپ اپنا پاسپورٹ جمع کرادیں تو میں آپ کو اجازت نامہ بنا دوں گا۔واپسی پر آپ کو اسی ایئرپورٹ پر آنا پڑے گا تو آپ اپنا پاسپورٹ واپس لے سکتے ہیں۔میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے دراز سے ایک فارم نکالا۔اس کو بھرا میرے دستخط لئے اور وہ کاغذ میرے حوالے کردیا۔اور میرا پاسپورٹ مجھ سے لے کر دراز میں ڈال دیا۔ائرپورٹ سے باہر آیا تو بہت دلکش نظارہ تھا۔ٹیکسی کی اور زیورخ شہر روانہ ہوگیا۔سوئٹزرلینڈ کا سکہ فرانک صرف ایک روپیہ 25 پیسے کا تھا۔یعنی ہمارے سکے سے صرف 25% فیصد زیادہ تھا۔چند دن دوسرے شہر بازل،جنیوا بذریعہ ریل خوب سیر کی پہاڑی گاؤں بھی دیکھے۔بہت ہی خوبصورت ملک تھا۔جس میں دریا، پہاڑ، جنگل، ہریالی یعنی چھوٹی سی جنت کا نمونہ

کہہ سکتے ہیں۔یورپ کا سب سے صاف ستھرا اور خوبصورت ترین ملک سوئٹزرلینڈ کو کہتے ہیں۔اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔اُس کے دس سال بعد 1980ء میں اپنی فیملی کے ساتھ پہلی مرتبہ آیا اور پھر متعدد بار آنا جانا ہوتا رہا، ہر مرتبہ سوئٹزرلینڈ پہلے سے بھی زیادہ ماڈرن لگتا تھا۔نئی نئی جگہیں ڈیویلپ کر کے انہوں نے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔بہت سلیقہ مند قوم ہے یورپ میں ہٹلر بھی سوئس لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ یہاں ہر مرد کو فوج میں نوکری کرنی پڑتی تھی۔خواہ وہ کتنا بڑا صنعتکار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔پھر ہر سال تین ہفتے اُس کو لازمی ڈیوٹی دینا ہوتی ہے۔سوئٹزرلینڈ کا ایک حصہ جرمنی دوسرا حصہ فرانس تیسرا حصہ اٹلی سے ملتا تھا۔یعنی تین سرحدیں ہیں جن سے یہ ملک گھرا ہوا ہے۔اسی وجہ سے یہاں جرمن باڈر پر جرمن، فرنچ اور اٹلی کے باڈر پر اٹالین زبان بولی جاتی ہے۔انگریزی میں بھی یہاں اضافی زبان ہے البتہ اب سوئٹز زبان بھی ایجاد کرلی گئی ہے۔جو ان تمام چاروں زبانوں کا مرکب کہہ سکتے ہیں۔اب تو اس ملک کا سکہ تقریباً 43 روپے کے برابر ہو چکا ہے تو آپ پھر اس ملک کی مہنگائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کتنی بڑھ چکی ہوگی۔اس کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگر کسی پہاڑی پر دو مکان بنے ہوں تو وہاں سڑکیں، بجلی، گیس، ٹیلیفون، موبائل سمیت ہر چیز کی سہولت موجود ہوگی۔خودکار نظام کے تحت اُن دو مکانوں کو پولیس کا تحفظ بھی حاصل ہوگا۔نفاست تعلیم، خوش لباسی، مدد کا جذبہ یہی اس قوم کے زریں اصول ہیں۔دنیا کی کامیاب ترین قوموں میں سوئٹزرباشندے سب سے نمایاں ملیں گے۔بنک، گھڑیاں، چاکلیٹ ان کا مشہور ترین شعبوں میں درجہ اول کا مقام ہے۔جس نے سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا تو یوں سمجھیں اُس نے کچھ نہیں دیکھا۔اگرچہ آبادی کے لحاظ سے تو یہ کراچی سے بھی ایک تہائی ہے۔یعنی 70,60 لاکھ کی آبادی کا ملک ہے مگر دنیا کی تمام چیزیں یہ ملک بناتا ہے۔اور ایکسپورٹ بھی کرتا ہے۔مضبوطی پائیداری ان کا طرہ امتیاز ہے۔اگر آپ نے ایک سوئس گھڑی خرید لی تو تمام عمر کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔بشرطیکہ آپ اس کو صحیح طریقہ سے استعمال میں لائیں۔

جرمنی کا سفر

یورپ کے سفر کے دوران جرمنی جانا تو لازم ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دیگر یورپین ممالک سے ان کی سرحدیں ملتی ہیں۔جرمن جفاکش،محنتی قوم ہے صنعت وحرفت، زراعت،بڑی بڑی مشینریز، جہاز سازی الغرض تمام میدان میں یہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔1970ء میں جب پہلی مرتبہ گیا تھا تو فرینکفرٹ ایئر پورٹ بھی بہت چھوٹا تھا۔یعنی آج کل کے مقابلے میں 10 فیصد حصے پر واقع تھا۔ایک ہی ٹرمینل تھا جرمن مارک صرف ایک روپے کے برابر تھا۔ویزہ بھی ضروری نہیں تھا۔ائیر پورٹ پر صرف واپسی کا ٹکٹ پوچھتے تھے۔اور پاسپورٹ پر مہر بھی نہیں لگاتے تھے۔1978ء تک کوئی خاص کاروباری مراسم نہیں ہو سکے۔سوائے گھومنے گھمانے کے۔ٹکٹ بہت سستے ملتے تھے۔درمیان میں جتنے بھی شہر چاہیں اضافہ کرلیں یعنی اگر کراچی سے لندن کا ٹکٹ لیا ہے۔تو ان کے درمیان آنے والے شہروں میں آپ بغیر اضافی کرایہ ادا کئے سیر کر سکتے تھے۔1978ء میں جب ادویات کے کاروبار سے بڑھ کر کاسمیٹکس کا کاروبار شروع کیا تو سب سے پہلے جرمن کمپنی سے پرفیوم کی خریداری سے ابتداء کی۔ایک جاپانی کمپنی (SIBOLEY) سے معاہدہ کیا۔ایک ماہ کا کاسمیٹکس بنانے کی ٹریننگ لی۔یہ اوساکا شہر سے 50 کلومیٹر دور فیکٹری میں جو (SIBOLEY) جاپانی کمپنی تھی۔پرفیوم اور کریم بنانے والی درمیانی کمپنی تھی۔جاپانی اسٹائل ہوٹل میں جس میں بیڈ کے بجائے ہماری طرح میٹریس پر ہی سونا پڑا

جس کی مجھے عادت نہیں تھی۔اور چونکہ بہت چھوٹا سا شہر تھا وہاں انگلش اسٹائل ہوٹل نہیں تھا۔گزارا کرنا پڑا۔فارمولا جاپانی تھا پرفیوم یورپین اسٹائل جرمنی کی بنی ہوئی تھی۔مگر بہت کوششوں اور پبلسٹی کے باوجود سبولی فرام جاپان کی کاسمیٹکس پاکستانی مارکیٹ میں مقبول نہیں ہوسکی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔جیسا کہ میں نے شروع میں سرسری سا ذکر بھی کیا تھا۔الغرض آج زیادہ پرفیومز جرمنی سے امپورٹ کرتے ہیں۔جرمنی کے جن شہروں میں جانے کا اتفاق رہا ان میں سرفہرست فرینکفرٹ کے علاوہ ہمبرگ،اسٹڈ گارڈ،میونخ،فرائی برگ،ہالذمنڈن،ڈوزال ڈوف،بون وغیرہ شامل ہیں۔

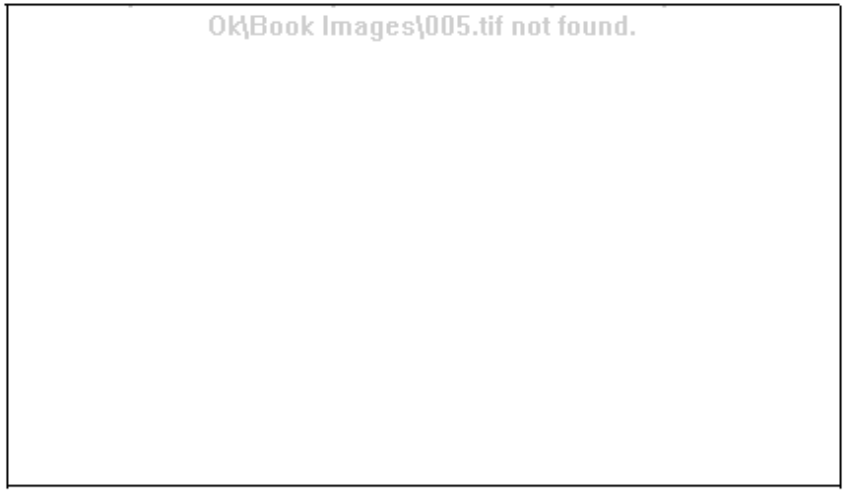

جرمنی میں دوستوں کے ہمراہ یادگار تصاویر

جرمنی میں خیالات لکھتے ہوئے یادگار تصاویر

فرانس کا سفر

جرمنی کی طرح فرانس بھی گیا خصوصاً 1971ء میں پیرس سے ٹولوس شہر گیا۔ اُس شہر کی خصوصیت وہاں جا کر معلوم ہوئی یہاں برٹش فرانسیسی کمپنی مل کر ایک نیا جہاز CONCORD بنانے کا تجربہ کر رہی تھیں۔ غالباً میں پہلا پاکستانی تھا جس نے جہاز کا ٹکارڈ کی آزمائشی پرواز دیکھی۔ یہ ہمارے کاروباری دوست جو ایک ادویات بنانے والی کمپنی کے مالک تھے بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ اُن کی بہت اپروچ تھی، ریس کورس بھی تھا گھوڑوں کے بہت شوقین تھے۔ نامور گھوڑوں کی ریس میں بھی ان کا بڑا مقام تھا۔ لہذا مجھے وہ ائیر پورٹ پر لے گئے اور وی آئی پی کی حیثیت سے ہم نے اس انوکھے جہاز کی آزمائشی پروازیں دیکھیں۔ جہاز اترتا تو زمین کانپتی تھی جیٹ انجن تھے آواز سے زیادہ تیز رفتار تھی۔ دراصل یہ پیرس، نیویارک فلائٹ کے لئے بنایا گیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جس وقت آپ اس جہاز میں سوار ہونگے۔ ٹھیک اسی ٹائم آپ نیویارک پہنچ جائیں گے۔ پیرس نیویارک صرف 5 گھنٹوں میں سفر طے ہوگا۔ اور پھر پیرس نیویارک ٹائم کا فرق بھی پانچ گھنٹوں کا تھا۔ نیویارک پیرس سے 5 گھنٹے پیچھے تھا۔ صرف ایک ہی کلاس جہاز میں آپریٹ ہوتی تھی۔ کرایہ فرسٹ کلاس کا چارج ہوتا تھا، یہ معلومات ہمارے دوست نے ایئر پورٹ پر بریفنگ دی تھی۔ ٹولوس شہر ہمارے حیدرآباد سے بھی چھوٹا تھا۔ اگر آپ شہر سے ائر پورٹ جائیں گے تو آپ کو آنے جانے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ آزمائشی

ائرپورٹ زیادہ تھا۔ عوامی جہاز کم ہی اترتے تھے۔ اسی وجہ سے ٹیکسی ڈرائیور ڈبل کرایہ چارج کرتے تھے۔ دوسرے دن ہمارے دوست نے ہم سے پوچھا کہ آپ کو گھوڑے کی سواری کا شوق ہے۔ ہم نے سوچا اگر ہم نے نہیں کہا تو وہ کیا سمجھے گا۔ ہماری عمر صرف 27 سال تھی۔ کسرتی جسم تھا خود کرکٹ بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، جو اسکول اور کالج کے درمیان کھیلتے تھے سوچا چلو گھوڑے کی بھی سواری کر لیتے ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ مری میں گھڑ سواری کی تھی مگر کوچوان کے ساتھ، اُس دوست نے دوسرے دن صبح 6 بجے گھڑ سواری کی تجویز دی ہم نے حامی بھر لی۔ دوسرے دن صبح وہ ہمارے ہوٹل پر آ کر مجھے اپنے ریس کورس میں لے گئے۔ گھوڑا تو ریس کورس کا تھا۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ گھوڑا بہت تیز رفتار ثابت ہوگا۔ اللہ کا نام لے کر اُس کے سائیس نے سوار کرا دیا۔ مجھے تو گھڑ سواری آتی نہیں تھی۔ گھوڑے پر سوار تو ہو گیا۔ گھوڑے نے دوڑنا شروع کیا بہت کوشش کی مگر گھوڑا تیز دوڑنے لگا تو ہم نے نزدیک ہی ساتھ دوڑنے والے گھڑ سوار سے انگریزی میں کہا کہ میری مدد کرو یعنی Help me , Help me فرانس میں لوگ انگریزی نہیں جانتے اُن کو اپنی فرانسیسی زبان پر بہت فخر ہے بلکہ انگریزی زبان بولنا پسند بھی نہیں کرتے۔ چونکہ میں بہت گھبرایا ہوا تھا اور گھوڑا مجھے اُچھال رہا تھا میں نے لگام مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں وہ سمجھا میں گھوڑے سے کھیل رہا ہوں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر میں اور گھبرا گیا اب گھوڑا بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ریس کورس کے سنہرے والے باڑ میں موڑ کر روکنے کی کوشش کی میری خوش قسمتی ایک گھڑ سوار جو انگریزی جانتا تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ میں اناڑی ہوں اور گھوڑے کو نہیں سنبھال سکتا تو اس نے آگے آ کر میرے گھوڑے کی لگام تھام کر دوڑتے ہوئے گھوڑے کو روک کر مجھ سے پوچھا کیا پرابلم ہے۔ میں نے کہا گھوڑا میرے قابو سے باہر ہے اُس کو روک کر مجھے واپس پویلین تک لے چلو۔ اُس دوران آدھا ریس کورس میں پار کر چکا تھا۔ اُس کو بڑا تعجب ہوا جب پویلین میں مجھے اس نے گھوڑے سے اتارا اور میں نے بتایا میں آج تک ریس کورس کے گھوڑے پر کبھی

نہیں بیٹھا،اس نے اسی گھوڑے کے مالک نے بڑی تعجب سے کہا تم بہت خوش قسمت ہو یہ گھوڑا تو بہت تیز دوڑنے والا گھوڑا تھا میں سمجھا تم ایسے گھوڑوں کی سواری کر چکے ہو گے۔اس لئے میں نے تم کو یہ سب سے تیز دوڑنے والا گھوڑا دیا تھا۔مگر تم نے کیسے اس گھوڑے کو قابو کیا۔یہ تمہارا ہی کمال ہے۔آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانا،گھوڑے سے اتر کر میں نے سکون کا سانس لیا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔الغرض 2 دن بعد ٹولوس سے پیرس چلا گیا۔پھر 1979ء میں فرانس آیا۔اس مرتبہ اپنی ٹچ می کمپنی کے لئے پرفیوم کی خریداری کے لئے نیز (Nice) آیا یہاں اکیلے گراس (Grass) کے شہر میں پرفیوم کی بہت سی کمپنیاں ہیں۔یہیں سے میں نے ٹچ می ٹالک کے لئے پرفیوم پسند کی اللہ کی مہربانی سے وہ خوشبو اتنی پسند کی گئی کی تمام ٹالکم پاؤڈر میں پاکستان کی تاریخ میں سپر ہٹ ہوگئی۔اور ٹچ می ٹالکم پاؤڈر مارکیٹ میں نمبر 1 کی پوزیشن حاصل کر کے صرف 2 سال کے قلیل عرصہ میں چھا گیا۔یہی پرفیوم میں نے ٹچ می شیونگ کریم میں استعمال کی یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیونکہ یہ خواتین کی پرفیوم تھی۔آج تک شیونگ کریم میں مردانہ پرفیوم استعمال کی جاتی ہے مگر میں نے ایک نیا تجربہ کیا کہ صبح صبح مردوں والی خوشبو کی بجائے بھینی بھینی Floral خوشبو بہت اچھی ثابت ہو سکتی ہے۔الحمدللہ وہی ہوا یہ خوشبو بھی عوام نے اتنی پسند کی آج 25 سال گزرنے کے باوجود ٹچ می شیونگ کریم کے خریدار اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔اور وہ بھی پاکستان میں سب سے زیادہ بکتی ہے۔فرانس میں مجھے ایک رات دانت میں سخت درد ہوا۔اتفاق سے صبح اتوار تھا تمام ڈینٹسٹ کلینک بند ہوتے ہیں۔میرے میزبان کا بیٹا اتفاق سے ڈینٹسٹ تھا۔اُس نے میرے دانتوں کو صاف کر کے ایک ٹوتھ پیسٹ تجویز کیا جو بہت ہی کڑوا تھا۔میں نے جب اُس ٹوتھ پیسٹ کو صبح استعمال کیا تو مجھے الٹی آ گئی اور میں نے تھوک دیا۔مگر چونکہ ڈاکٹر نے دن میں تین بار استعمال کرنے کے لئے کہا تھا۔تو میں نے مجبوراً تین مرتبہ استعمال کیا۔پاکستان میں بھی اکثر تکلیف ہوتی رہتی تھی تو میں نے ایک درجن ٹوتھ پیسٹ خرید لئے۔ایک ہفتے میں میرے دانت سے خون آنا بھی

بند ہو گیا اور درد بھی ختم ہو گیا تو میں نے سوچا کیوں نہ یہ ٹوتھ پیسٹ پاکستان میں متعارف کرایا جائے۔اُس وقت تک ہم نے نیچرل ٹوتھ پیسٹ مارکیٹ کر دیا تھا۔جو کافی مقبول ہو چکا تھا اُس ٹوتھ پیسٹ کو متعارف کرانے کیلئے ہم نے سوئٹزرلینڈ کی کمپنی کو خط لکھا اُس کا جواب بہت ہی تضحیک آمیز تھا کہ ہم پاکستان جیسی چھوٹی مارکیٹ میں اس ٹوتھ پیسٹ کو نہیں متعارف کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔مجھے اس کمپنی کا جواب بہت ہی بُرا لگا۔چنانچہ اس کو چیلنج سمجھ کر میں نے اُس ٹوتھ پیسٹ کی اپنی چاس اے مینڈوزا لیبارٹری میں ٹیسٹ کروا کر فارمولے کو (DISCOVER) حاصل تو کر لیا مگر صحیح مقدار کا پھر بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ اس کی کڑواہٹ اور اس کا بدذائقہ ہونا تھا جسے دور کرنا ضروری تھا۔الحمدللہ صرف 3 ماہ کی کوششوں سے نہ صرف ہم نے فارمولا نکال لیا بلکہ اُس کی کڑواہٹ بھی ختم کر لی اور اس نئے میڈیکیٹڈ ٹوتھ پیسٹ کو میڈی کیم MEDICAM کے نام سے متعارف کروایا۔میڈی کیم کا نام خود میں نے تجویز کیا یہ میڈی سے مراد میڈیکیٹڈ اور کیم سے CAM سے چاس اے مینڈوزا کا مخفف نام بنتا ہے۔اس ٹوتھ پیسٹ کو شروع میں ڈاکٹر صاحبان کے ذریعے ہم نے متعارف کروایا۔مگر ہمارے ڈاکٹروں نے اُس کو خاطر توجہ نہیں سمجھا ان کے خیال میں غیر ملکی میڈیکیٹڈ ٹوتھ پیسٹ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ایک پاکستانی کمپنی چاس اے مینڈوزا اچھا ٹوتھ پیسٹ بنانے کی اہلیت نہیں رکھتی بلکہ ڈاکٹروں کو جب ہم نے دعوے کے ساتھ یہ کہا کہ یہ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے سے دانتوں سے خون آنا اور درد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔جب تک یہ مریض استعمال کرتا رہے گا۔انہوں نے مذاقاً کہا کہ تو ہمارے کلینک میں پھر یہ مریض واپس کیوں آئیں گے۔ایسا ٹوتھ پیسٹ ہم مریض کو دے کر ہمیشہ کے لئے اس مریض سے محروم ہو جائیں گے۔ہم یہ Prescribe نہیں کریں گے۔اور ایسا ہی ہوا ڈاکٹر صاحبان ہمارے سیمپل تو لے لیتے تھے مگر اکثر مریضوں کو استعمال کرنے کا مشورہ نہیں دیتے تھے تو مجبوراً مجھے فیصلہ کرنا پڑا کہ میڈی کیم کو عوام سے متعارف کرانے کے

لئے ٹی وی اور اخبارات کا سہارا لیا جائے ۔جب ہم نے اخبارات اور ٹی وی سے میڈی کیم کو متعارف کرانا شروع کیا تو اس ٹوتھ پیسٹ نے جادوئی اثر دکھایا جیسا کہ میرے ساتھ فرانس میں پہلے ہی پیش آچکا تھا۔آج الحمداللہ میڈی کیم غیر ملکی ٹوتھ پیسٹوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ مقبول اور بکنے والا پاکستانی ٹوتھ پیسٹ بن چکا ہے گویا فرانس کے سفر سے مجھے میڈی کیم ٹوتھ پیسٹ بنانے کا موقعہ ملا۔جو ہماری کمپنی کی تاریخ کا سب سے سنہرا باب بن کر طلوع ہوا۔اور آج ہم اسے میڈی کیم کے بنائے ہوئے ٹوتھ پیسٹ کریم ،ہیر کلر،شیمپو بہت فخر سے کہتے ہیں کہ پاکستانی پروڈکٹس اب غیر ملکی کمپنیوں سے معیار میں کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں اور قیمتوں میں بھی کم ہے جس پر آپ بھروسہ کرسکتے ہیں۔

Ok\Book Images\006.tif not found.

Ok\Book Images\007.tif not found.

فرانس کے وفد کے اراکین کے سراہی گئی مختلف تصاویر

بھارت کا پہلا سفر

جب ہندوستان کا ویزہ ملنا شروع ہوا تو میں نے سوچا اب ہندوستان کا سفر بھی شروع کیا جائے۔میں اپنے ایک دوست جو میرے کزن بھی تھے اُن کے ساتھ بمبئی گیا اُن کا نام شفیع فیروز تھا۔بمبئی میں ہمارے میزبان (اُس زمانے میں غالباً 1988ء کا سال تھا۔) بمبئی کی بہت بڑی فارماسیوٹیکل کمپنی کے مالک رامو دیہوراء تھے ان سے ہمارے کاروباری معاملات تھے۔بمبئی سے تفریح کے لئے کھنڈالہ جو بمبئی سے کافی دور پہاڑی علاقہ تھا جہاں ہمارے قائداعظم محمد علی جناح بھی رہائش پذیر رہے تھے۔ جس کا نام جناح ہاؤس تھا جس دن ہم وہاں پہنچے تو پاکستان اور بھارت کا کرکٹ میچ آرہا تھا جو حیدرآباد میں پاکستان کا پانچ روزہ میچ تھا۔جس میں ہمارے ہیرو جاوید میاں داد اور مدثر نذر کی اہم پارٹنرشپ دکھائی جارہی تھی۔مگر بھارتی ٹیم اس پارٹنرشپ کو توڑنے کے لئے پوری کوشش کرچکے تھے۔ مگر صرف چند منٹ اُسی دن کے میچ ختم ہونے سے پہلے مدثر نذر آؤٹ ہوگئے اُس وقت جاوید میاں داد 280 پر کھیل رہے تھے تو امید بندھی تھی کہ عمران خان جو اس وقت پاکستان ٹیم کے کپتان تھے جاوید میاں داد کو صرف آدھے گھنٹے ضرور کھیلنے دیں گے تاکہ پاکستان کا یہ کھلاڑی بھی چند منٹ میں 300 رنز بنالیگا ۔مگر ایسا نہیں ہوا۔صبح عمران خان نے اننگ ڈیکلیئر کردی۔جو میاں داد کے لئے یقیناً صدمہ تو تھا مگر پاکستان کے لئے ایک اعزاز بھی ختم ہوگیا۔کاش عمران خان ایسا فیصلہ نہ کرتے

کیونکہ تین دن کرکٹ کے باقی تھے۔جہاں وہ پاکستان کوجتوا سکتے تھے۔مگرانہوں نے ایسا فیصلہ کیا کہ نہ ہماری قوم آج تک سمجھ سکی اور نہ ہی جاوید میاں داد اس واقعہ کو اپنی کرکٹ کی زندگی سے بھلا سکے۔بھارت میں جہاں بہت ہی زندگی کے ابھار دیکھے مگرایک بات جو میں نے محسوس کی کہ بھارتی عوام پاکستان سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں اوراسی طرح پاکستانی عوام بھی بھارتی عوام سے بہت محبت کرتے ہیں۔اگر چہ بھارتی اور ہماری حکومت آپس میں ایک دوسرے سے محبت کے بجائے نفرت کی پالیسی رکھتے ہیں۔دونوں بڑے دعویٰ تو کرتے ہیں۔یہ میں نے کئی مرتبہ بھارت جا کرخود دیکھ لیا ہے۔اگر آپ کسی بھی ملک کا ویزہ لیتے ہیں علاوہ سعودی عرب تو آپ اس ملک میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھوم سکتے ہیں۔مگر بھارت میں آپ کو جس شہر میں جانا ہوتا ہے تو آپ کو اسی شہر کا ویزہ ملتا ہے۔اوراگر آپ بغیر بتائے دوسرے شہر میں گئے تو وہاں کی پولیس آپ کو گرفتار کر کے جیل بھیج سکتی ہے۔اور آپ کو سزا بھی ہوسکتی ہے اس لئے بھارت آپ جس جس شہر کے ویزے لیتے ہیں آپ انہیں شہروں تک محدود رہ سکتے ہیں۔پھر اس دورے کے بعد کئی مرتبہ منی تال، گوا، دھلی، بنگور، بمبئی، میسور، اوٹی، گڈ گاؤں، آگرہ جا کر بھارت میں مسلمان، عیسائی، ہندو تہذیب کا بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔مگر بھارتی عوام خواہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ بھارتی قومیت کے پرستار ہیں۔خصوصاً ہندو واقعی ہندوستانی ہیں وہ ہر طرح اپنے آپ کو ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔دل میں وہ پاکستانیوں کے لئے جو بھی محسوس کریں مگر اندرونی طور پر پاکستانی اشیاء کو خریدنے سے گریز کرتے ہیں۔اُن کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بھارتی اشیاء خریدیں۔ہم پاکستان ایسی تفریق نہیں کرتے مگران کے قومی جذبے کو بہر حال ہمیں ماننا پڑے گا۔یہی وجہ تھی مجھے بار بار بھارت جانے کے باوجود ان کی پاکستان سے غیر فطری دوری پسند نہیں آئی۔مگر شاباش کہ وہ ہماری طرح بات نہیں کرتے مگر دل ہی دل میں اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔وہ اگر لاہور آئیں گے تو بڑی ہی خوش دلی سے کہیں گے ہم پاکستان سے دوستی چاہتے ہیں مگر جب ان کی

حکومت کوئی سیاسی بیان جاری کرتی ہے تو اسکا رویہ کچھ اور ہوتا ہے اگر بھارت میں کوئی حادثہ ہوجائے تو فوراً پاکستان پر الزام آجاتا ہے۔خواہ وہ بمبئی میں یا دلی میں ہو تو فوراً آئی ایس آئی پر الزام آجاتا ہے اور میرا خیال ہے ہماری حکومت بھی جب پاکستان میں کوئی حادثہ ہوتا ہے تو وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے بھارت کے "را" پر الزام لگا کر اپنی جان چھڑا لیتی ہے۔مگر آج تک نہ "را" نے آئی ایس آئی پر یا ہماری پاکستانی آئی ایس آئی نے بھارت کی را پر ملوث ہونے کا ثبوت پیش کیا۔مگر ایک بات صاف ہے کہ بھارتی عوام اور پاکستانی عوام ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔اور وہ اس دوری کو ختم کرنے کے لئے اپنی اپنی حکومتوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں جبکہ ہمارے سیاست دان اُن کے جذبات سے کھیلتے رہتے ہیں اور آج تک کھیل رہے ہیں تا کہ ان کی سیاست چمکتی رہے مگر ایک دن یہ سیاست ختم ہوجائے گی۔اور ہماری عوام پاکستان بھارت میں ایک دوسرے سے آسانی سے مل سکیں گے۔

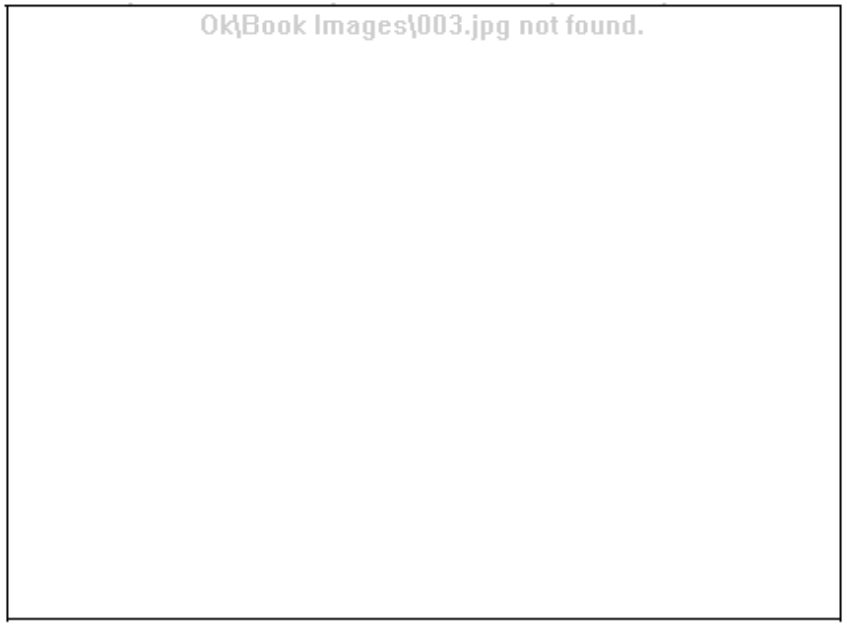

بھارت کے دورے کے موقع پر چند یادگار تصاویر

سری لنکا کا دورہ

پاکستان کے بعد سری لنکا ان چند واحد ملکوں میں شامل ہے جہاں ہم کو ویزہ کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ سری لنکن کو ہمارے ملک میں آنے جانے کے لئے ویزے کی ضرورت ہے، میں تقریباً 20 سال تک سری لنکا آتا جاتا رہا۔سری لنکا کا سب سے بڑا ذریعہ معاش ٹورزم ہے۔یعنی سمندری سیاح تمام ممالک سے سری لنکا آتے ہیں۔بہت ہی سستا ملک ہے اور پھر وہاں کے عوام بہت ہی خوش اخلاق ہیں ۔ہوٹل، خوراک، ٹرانسپورٹ بہت ہی سستا ملک ہے تقریباً ہر شہر کے ساتھ سمندر اور ہوٹلوں کا کا وسیع جال ہے۔البتہ ایک چیز جو سری لنکا کی ترقی میں رکاوٹ ہے وہ تامل ٹائیگروں کی جنگ ہے جو گزشتہ 20، تیس سال سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جاری ہے یہ سری لنکا میں رہنے کے باوجود اس کے شہری تو ہیں مگر ان کو سری لنکا میں ووٹ کا حق حاصل نہیں ہے۔بھارت ان کی تحریک کو ہمیشہ ہوا دیتا رہا ہے۔وہی ان کو ہتھیار، پیسہ اور پناہ دیتا رہا ہے ان کے باشندے مدراس اور اس کے نواح میں پناہ لیتے رہے ہیں۔سری لنکا کی دوسری سب سے بڑی ایکسپورٹ چائے ہے۔کینڈی شہر تو چائے کے باغات سے بھرا پڑا ہے۔یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں بکثرت بارش ہوتی ہے۔تقریباً 40 سال کی ٹریولنگ میں مجھے صرف ایک مرتبہ جوتوں کی چوری کا حادثہ کولمبو سے مالدیپ جاتے ہوئے پیش آیا۔میں نے اپنا جوتا جو بالی برانڈ کا سوئٹزرلینڈ کا بنا ہوا تھا وہ کھلے بیگ میں اُتار کر

نائیکی (NIKE) کے اسپورٹ جوتے سے تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔مگر جب میں مالدیپ پہنچا تو مجھے بڑا تعجب ہو کہ میرا BALLY کا جوتا غائب تھا اور اس کی جگہ ایک معمولی کالا ربڑ کا جوتا رکھا ہوا تھا۔ایسا جوتا عام طور پر ہوٹل کے معمولی ورکر استعمال کرتے ہیں۔سری لنکا سے روانگی کے وقت انہوں نے میرا BALLY کا جوتا نکال کر اپنا استعمال شدہ معمولی جوتا رکھ دیا یہ غیر معمولی واقعہ میری زندگی میں بھی یادگار بن گیا۔مگر سری لنکا کے لئے اچھے اور خوش گوار تاثرات کے بجائے ایک بُرا تاثر چھوڑ گیا گویا سری لنکن جوتے بھی نہیں چھوڑتے اس کے بعد میں جب بھی سری لنکا گیا ہر چیز کی حفاظت کی اور عوام کے لئے بھی اچھی رائے نہیں رکھی۔میرے نزدیک ایک Five Star ہوٹل کے ملازمین اگر ایسی حرکت کریں۔تو عام ہوٹلوں میں کیا ہوتا ہوگا۔حالانکہ سری لنکن کرکٹ کے کھلاڑی بہت ہی ڈسپلن کھلاڑی مانے جاتے ہیں۔دراصل مجھے انڈونیشیا جانا تھا اور ایسا جوتا مالدیپ میں نہیں ملتا تھا مجبوراً مجھے NIKE کے جوتے میں انڈونیشیا جانا پڑا اور پھر میں نے وہاں جا کر ایسا کاروباری جوتا خریدا۔

مالدیپ

سری لنکا سے ہماری فیملی مالدیپ روانہ ہوئی جیسا کہ میں نے سری لنکا میں جوتا چوری ہونے کا واقعہ لکھا تھا۔مالدیپ دراصل 2000 سے زائد جزائر ISLAND پر مشتمل مسلمان ملک ہے اور ہر جزیرہ پر ایک دو ہوٹل واقع ہیں۔ بہت خوبصورت جزیرے ہیں بہت مناسب داموں میں ہوٹل کرائے پر مل جاتے ہیں۔یہاں صرف شراب لانے کی ممانعت ہے مگر ہر ہوٹل میں بہت ہی مہنگے داموں میں شراب مل جاتی ہے غالباً حکومت نے ٹورسٹوں (سیاحوں) کو سستے دام ہوٹل اور کھانے فراہم کر کے اس کی کسر شراب کے بہت ہی مہنگے داموں میں فراہم کر کے غیر ملکی کرنسی کمانے کا آسان راستہ دریافت کرلیا ہے۔ ائرپورٹ پر سیاحوں سے صرف ایک ہی سوال کیا جاتا ہے کیا آپ کے پاس شراب ہے اگر آپ نے کہا ہاں تو کسٹم کا عملہ فوراً وہ بوتل اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔اگر آپ نے کہا نہیں اور شراب کی بوتل تلاشی میں نکل آئے تو وہ بوتل قابل ضبط ہوجاتی ہے جبکہ ہاں کی صورت میں وہ آپ کو آپ کی بوتل جاتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں۔یہاں آپ مچھلی کا شکار بوٹ میں کر سکتے ہیں۔اگر چہ بہت ہی چھوٹا ملک ہے مگر سیاحوں کے لئے بہت یادگار ٹورسٹ رسٹ ہاؤس ہے۔وہاں آپ کو بہت ہی سستی تفریح ملے گی اور عوام بھی بہت خوش اخلاق ہیں اگر چہ غربت بھی بہت نمایاں ہے۔سمندر بہت صاف ستھرا ہے۔

یورپی ممالک

اپنی سفری زندگی کے آغاز میں بیلجیئم ،ہالینڈ، ڈنمارک،سوئٹزرلینڈ ،اٹلی،نیدرلینڈ جانے کا اتفاق رہا یہ محض ایک سفری تجربے تو تھے مگر وہاں کوئی خاص کاروباری منافع بخش واقعہ نہیں ہوا۔ماسوائے چند دن گزارنے کے بعد اگلے سفر پر روانہ ہوجانا اور چونکہ یہ ممالک ایک دوسرے سے بہت ہی ملے ہوئے ہیں۔لہذا ٹرین اور کار سے ان کا سفر بہت ہی آسان ہوتا ہے۔چونکہ اُس زمانے میں ویزے کی سہولیات تھیں تو ان میں آنا جانا اتنا ہی آسان ہوتا تھا جیسے یہ ایک ہی ملک کے حصے ہوں اب جبکہ ویزے کا حصول بہت ہی مشکل بنادیا گیا ہے تو اب یہ خیال خام ہے۔آپ ایک دوسرے ملک میں اس طرح سفر نہیں کر سکتے ہیں۔البتہ یورپی یونین کے ملنے کے بعد ان ممالک میں شینگین ویزہ بھی مروج ہے (ان یورپین ممالک کا مشترک ویزہ) اگر آپ کو مل جائے تو آپ ان 20،پچیس ممالک میں سفر کر سکتے ہیں البتہ سوئٹزرلینڈ کا ویزہ آپ کو الگ حاصل کرنا پڑے گا۔سوئٹزرلینڈ ان ممالک میں سب سے نمایاں ہے اس ملک میں پہاڑ، دریا اتنے بہتات سے پائے جاتے ہیں گویا جنت کا گمان ہوتا ہے۔ بہت ہی صاف ستھرا ملک ہے البتہ مہنگائی کے معاملے میں یہ یورپ میں سب سے آگے ہے اگر یورپ میں سوئٹزرلینڈ نہیں دیکھا تو سمجھیں آپ نے یورپ نہیں دیکھا۔

ہنگری کا سفر

زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہنگری جانے کا اتفاق ہوا۔ترکی سے ہنگری کے شہر بوڈا پیسٹ BUDAPEST جا رہا تھا۔آدھی رات یعنی 12 بجے کا وقت تھا جہاز کے کپتان نے اعلان کیا ہم بخا ریسٹ BUKHA REST یعنی رومانیہ کے شہر میں اتر رہے ہیں۔میں ہڑبڑا کر اُٹھا اور بخا ریسٹ کے ائیر پورٹ پر اتر گیا۔جب ایئر پورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا تو اُس نے کیا تمہارے پاس رومانیہ کا ویزہ ہے تم کیسے آ گئے میں نے کہا مجھے تو ہنگری کے شہر بوڈا پیسٹ جانا ہے۔اُس نے پولیس کو آواز دی اس بندے کو فوراً جہاز پر چڑھاؤ یہ غالباً 1974ء کا واقعہ ہے جو مجھے یاد رہ گیا۔اُس پولیس والے نے مجھے بھگا کر واپس جہاز پر چڑھایا غالباً اُس نے وا کی ٹا کی سے جہاز کو بھی رکوایا تھا۔کیونکہ جب میں واپس جہاز میں پہنچا تو اُس کی ایئر ہوسٹس کافی نا راض لگ رہی تھی اس نے شکایت کہا کہ تم کیوں اتر گئے تھے ہم ایک مسافر کم ہونے کی وجہ سے پریشان تھے اور دوسرا واقعہ ہنگری میں ہی پیش آیا کہ میری فلائٹ جو صبح 7 بجے تھی میرے میزبان کے نہ آنے پر چھوٹ گئی وہ بے چارہ 7 بجے ہوٹل پہنچا جبکہ فلائٹ کا ٹائم 7 بجے تھا وہ مجھے لے کر ائیر پورٹ گیا اور 11 بجے دوسری فلائٹ سے اُس نے آسٹریا یعنی VIEANA روانہ کیا بس میری زندگی کی یہ واحد فلائٹ تھی جو میں اپنے میزبان کی وجہ سے نہیں پکڑ سکا۔اس کا بھی مجھے قلق ہے ایسا واحد واقعہ میری زندگی میں کیوں ہوا۔

تائیوان کوریا کا سفر

پاکستان کی حکومت تائیوان کو نہیں مانتی مگر تائیوان والے ہر ملک سے تجارت کرتے ہیں چونکہ تائیوان چائنا کا حصہ تھا اور پاکستان کے چائنا سے بہت برادرانہ تعلقات ہیں اور تائیوان امریکہ کا حصہ دار ہے جس نے چائنا سے الگ کر کے ایک آزاد ملک بنا دیا ہے اس وجہ سے وہ پاکستان سے اچھے تعلقات کی توقع نہیں کرتے مگر تائیوانی سے پاکستان بہت مال آتا ہے۔لہذا وہ ہر پاکستانی کو تائیوان کا ویزہ دے دیتے ہیں تا کہ اس کا کاروبار چل سکے،تائیوان کے ویزے کے لئے ہانگ کانگ میں اُس کے دفتر سے ویزہ ملتا ہے اور مقامی تائیوانی کا ویزے پر گارنٹی دینا ضروری ہے کہ وہ اس پاکستانی کی نہ صرف دیکھ بھال کرے گا بلکہ واپس بھی جانے کی ذمہ داری لے گا۔صرف 3 مرتبہ تائیوان جانے کا اتفاق ہوا اور اسی طرح صرف 3 ہی مرتبہ کوریا (جنوبی) جانے کا اتفاق رہا۔دونوں ہی کاروباری ممالک ہیں۔ جاپان کی طرز پر ہر مشین کا سستا نعم البدل بنانے میں ماہر ہیں۔ہانگ کانگ کی طرح غیر معیاری نہیں بناتے البتہ مہنگے داموں پر بناتے ہیں جس طرح جاپان کی مشینیں دیرپا ہوتی ہے ان کی مشینیں بھی دیرپا ہوتی ہے یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

صومالی لینڈ ،جبوتی ،ایتھوپیا

2005ء میں صومالی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ایک مسلمان دوست عثمان جو دبئی میں رہتے تھے۔انہوں نے صومالی لینڈ جس کے وہ باشندے تھے کہا کہ یہ ایک مسلمان ملک ہے۔صومالیہ سے الگ ہوکر صومالی لینڈ بن چکا ہے مگر کوئی بھی ملک اس کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔بہت غریب ملک ہے اس کی مدد کی جائے تو اُس کے معدنیات اور سمندری ذخائر اتنے زیادہ ہیں کہ آگے چل کر یہ ملک بھی مالا مال ہوسکتا ہے چنانچہ ہم بھی سیاحت کے شوق میں دبئی سے روانہ ہو گئے۔دبئی سے ایتھوپیا کے ذریعے صومالی لینڈ کے شہر ہرگیسا پہنچ گئے۔وہاں عثمان نے ہم کو صومالی لینڈ کے صدر سے ملوایا بہت ہی سادہ طبیعت صدر نے بہت متاثر کیا،معمولی شہر تھا غربت بھی بہت تھی کھیتی باڑی مویشی پالنا بس یہی صومالی لینڈ کی اہم آمدنی کا ذریعہ تھا۔صومالی لینڈ کے صدر کی سادگی دل میں اتر گئی بہت ہی عام سے گھر میں رہائش اور عام سادہ زندگی۔بغیر پروٹوکول اس زمانے میں ناممکن ہے جو میں نے ان سے مل کر محسوس کیا۔رات کے کھانے پر بغیر پروٹوکول کھانا کھایا،اور میرے صاحبزادے سلمان خلیل کو انہوں نے بخوشی قونصل جنرل اعزازی نامزد کردیا۔اگر چہ سفر بہت کٹھن ہے جبوتی یا ادیس ابابا سے بہت ہی چھوٹے اور پرانے جہازوں میں سفر کر کے صومالی لینڈ کے شہر ہرگیسا جانا پڑتا ہے۔مگر میرے خیال میں آنے والے سالوں میں صومالی لینڈ جو صومالیہ سے الگ ہوکر صومالی لینڈ بن چکا ہے۔اور یواین او جو

آج اس کو تسلیم نہیں کر رہی ہے مگر آنے والے کل میں بھی بہت زرخیز ملک ثابت ہوگا۔اس ملک میں بہت قیمتی دھاتیں،زمرد کے علاوہ سمندری ذخائر مچھلی،جھینگے لابسٹر موجود ہیں۔اگر کسی بھی اچھی فشری کرنے والے کی کمپنی نے اس پر ہاتھ رکھا تو بہت جلد یہ ترقی کر کے جبوتی سے بھی آگے آجائے گا۔جبکہ جبوتی کی صرف ذرائع آمدنی سمندر بندرگاہ کا استعمال ہے جو صومالیہ اور ایتھوپیا کے ذریعہ قائم ہے ایک خاص بات جوان ممالک میں عام ہے۔وہ گھاس کی بنی ہوئی ایک بوٹی سب کھاتے ہیں جسے چاڈ کہتے ہیں۔جس طرح ہم پان کھاتے ہیں یہ دوپہر ایک بجے سے 5 بجے تک زمین پر بیٹھ کر چباتے ہیں۔یہ ایتھوپیا میں پیدا ہوتی ہے۔اس کا نشہ بقول ان کے حرام نہیں ہے صرف سکون دیتا ہے جو صدر سے لے کر ایک معمولی انسان کھا کر سکون حاصل کرتا ہے۔یہ بالکل ایک عام کھانوں کی طرح فروخت ہوتی ہے۔جو صومالی لینڈ،جبوتی،صومالیہ،یمن اور اس سے ملحقہ ممالک میں بہت مقبول ہے۔

مصر

2006ء میں مصر جانے کا اتفاق ہوا، دریائے نیل پر قاہرہ کے ہلٹن ہوٹل پر رہائش تھی۔ بہت ہی خوبصورت یادگار تفریح تھی۔ نیچے دریا بہہ رہا تھا جہاں فرعون غرق ہوا تھا۔ دو دن تک قاہرہ کا دورہ رہا اس میں وہ PYRAMIDS اور قاہرہ کے میوزیم کا دورہ کافی معلوماتی تھا۔ فرعون کی ممی اور اونچا پہاڑی سلسلہ PYRAMIDS دیکھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہاں سے ایک شہر جس کو شرم الشیخ کہتے ہیں وہ بھی دیکھنے کا موقع ملا، بالکل بیروت کی طرز پر یہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ اس میں نائٹ کلب ہی کلب ہیں دراصل عیاشی کی بندرگاہ ہے۔ نوجوان لڑکیاں ڈانسر ہیں کھلی BOATS پر آپ تمام دن رات تفریح کر سکتے ہیں۔ سیاحوں کی جنت کی مثال یہ ہے کہ آپ صرف 100 ڈالر میں تمام دن ہوٹل میں رہ کر کھانا، پینا اور ڈانس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہر ہوٹل میں 4، پانچ سو کمرے سوئمنگ پول، کلب بار سب ہی سمندر کے کنارے آباد ہیں آپ ان میں رہ کر دن گزار سکتے ہیں۔ نئے بیروت کو شرم الشیخ کہہ سکتے ہیں۔

ترکی

سب سے پہلے مجھے 1973ء میں حج کے بعد ترکی جانے کا موقع ملا۔ اُس زمانے میں ترکی کی کرنسی لیرا ایک ڈالر میں صرف 14 لیرا ملتے تھے۔ اب ایک ڈالر میں ڈیڑھ سے 2 ملین لیرا ملتے ہیں۔ ترکی کے عوام پاکستانی عوام سے بہت متاثر ہیں اور اُن کی بہت عزت کرتے ہیں، میں چونکہ حج کر کے گیا تھا۔ سو جو بھی مجھے ملتا تھا (چونکہ حج کی وجہ سے سر منڈوایا تھا) وہ میرا ہاتھ چومتا تھا 1973ء میں مہنگائی بھی اتنی نہیں تھی اور ترکی کے لئے ویزہ بھی نہیں ہوتا تھا تو جدہ سے سیدھا استنبول گیا۔ وہاں میرے ایک دوست سے شناسائی تھی ایک گلاس کمپنی سے ہم نے امپورٹ کے ذریعے دوستی بھی کر لی تھی۔ لہذا استنبول کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر 2004ء یعنی تقریباً 30 سال بعد دیکھنے کا موقع ملا، یہاں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار اور دیگر مساجد بہت ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اسلامی روایات تازہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ ترک اب بہت ہی ماڈرن طرزِ زندگی گزارتے ہیں۔ اور یورپی یونین میں شمولیت کے لئے بے تاب ہیں نہ جانے کہاں تک یورپ کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر ایک بات ترکوں میں خاص ہے جس کو وہ پسند کرتے ہیں اُن سے محبت کرتے ہیں اور جس سے نفرت کرتے ہیں اُن کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے پاکستان اُن کے لئے ایک برادر ملک سے کم نہیں ہے جسے آخری حد تک پسند کرتے ہیں۔

کینیڈا

امریکہ کے ساتھ ہی ملا ہوا ملک کینیڈا ہے یہاں لاکھوں پاکستانی رہتے ہیں۔ 1982ء تک تو ویزہ اس ملک میں ایئر پورٹ پر ہی مل جاتا تھا۔ میں کئی مرتبہ کینیڈا گیا اور ہمیشہ ایئر پورٹ پر ویزہ ہونے کی وجہ سے امریکہ سے ٹورنٹو شہر جاتا رہا ہوں۔ وہاں میرے قریبی رشتہ دار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہاں ایڈوانس ویزہ لینا ضروری ہو چکا تھا۔ مگر امریکہ کینیڈا سفر میں وہ ویزہ نہیں چیک کرتے لہٰذا میں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو پہنچ گیا۔ ائیر پورٹ پر مجھے امیگریشن والوں نے پوچھا تمہارے پاس تو ویزہ نہیں ہے پھر تم کیسے کینیڈا میں داخل ہو سکتے ہو میں نے بہت بھول پن سے کہا میں پچھلے سال آیا تھا تو مجھے کسی نے نہیں روکا تھا آپ میرے پاسپورٹ سے تصدیق کر سکتی ہیں۔ اُس خاتون نے جس کی عمر 60 سال سے بھی زائد تھی۔ میرے طرف دیکھا اور کہا واقعی آپ پچھلے سال آئے تھے میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا اُس پر کینیڈا کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اُس نے پوچھا تم کتنے دن رکو گے میں نے کہا 7 دن (One week) اُس نے مجھے صرف 7 دن کا ویزہ جاری کر دیا اور کہا اگر کوئی مشکل حالات کا سامنا پڑے اور مزید رکنا پڑے تو ایک کاغذ مجھے پکڑا دیا اور کہا اس دفتر میں چلے جانا وہ تمہارا ویزہ بڑھا دیں گے۔ مگر خبردار آئندہ ویزہ لے کر ہی ہمارے ملک آنا یہ تمہاری پہلی بھول تھی اس لئے میں نے خصوصی اختیارات کے تحت تمہیں ویزہ دیا ہے آئندہ دوسرا کوئی ویزہ نہیں دے گا۔ میں نے کمپیوٹر میں لکھ دیا

ہے۔ خیر اُس کے بعد میں جب کینیڈا گیا ہمیشہ ویزہ لے کر ہی گیا کینیڈین عوام امریکہ سے بہت مختلف لوگ ہیں بے حد ملنسار دکھ درد میں تو وہ ایسے شامل ہوتے ہیں جیسے وہ آپ کے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ اس ملک کی پالیسی بھی بہت ہی بہتر ہے وہ انسانیت کے علمبردار بھی ہیں۔ اُن کے ملک میں کوئی بھوکا نہیں مر سکتا نہ سو سکتا ہے اگر کسی کے پاس کام نہیں ہے اور کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے خواہ وہ غیر قانونی طور پر ہی کینیڈا میں رہتا ہے تو حکومت اس کا بے روزگاری الاؤنس جاری کر دے گی۔ ملک بدر بھی نہیں کرے گی۔ یہی وجہ ہے 9/11 کے بعد جو غیر قانونی پاکستانی امریکہ میں رہتے تھے وہ امریکی پولیس کے خوف سے کینیڈا چلے گئے اور وہاں انہوں نے قانونی پناہ لے لی۔ اور شاباش کینیڈین حکومت کی کہ انہوں نے بلا امتیاز ہزاروں بھارتی، پاکستانی، بنگلہ دیشی لوگوں کو اپنے ملک میں نہ صرف آنے دیا بلکہ اُن کی مالی معاونت بھی کی۔ اسلامی نقطہ نظر سے کینیڈا فلاح و بہبودی کے کاموں میں ہمارے مسلمان ملکوں سے بہت آگے ہے۔ وہاں انسانیت کی قدر ہوتی ہے۔ مذہب دوسرے نمبر پر شمار ہوتا ہے اگر مجھے دنیا میں کسی دوسرے ملک میں رہنے کو کہا جائے تو میرا سب سے پسندیدہ ملک کینیڈا ہی ہوگا۔ حالانکہ اس ملک میں صرف 4 مرتبہ ہی جا سکا ہوں مگر ان کا خلوص اور سادگی میں بھول نہیں سکتا۔

یو اے ای

یہ خلیجی ریاست ہے اس میں دبئی ،ابوظہبی ،شارجہ ،راس الخیمہ ،عجمان العین،فجیرہ ،ام القیوین مل کر اس کو یونائیٹڈ عرب امارت کا نام دیا گیا ہے۔ابوظہبی میں تیل پیدا ہوتا ہے بقایا ریاستوں میں کاروبار ہوتا ہے جس میں دبئی سرفہرست ہے۔1973ء میں لندن جاتے ہوئے (ہماری قومی ایئر لائن پی آئی اے) دبئی میں رُکا بہت چھوٹا ایئر پورٹ تھا یہاں صرف اردو بولی جاتی تھی حتیٰ کی ایئر پورٹ پر اُردو اور انگریزی میں اناؤنسمنٹ ہوتا تھا،گرمی اتنی شدید تھی کہ جہاز سے ایئر پورٹ تک آتے ہوئے پسینے چھوٹ گئے ،اور غربت کا یہ عالم کہ ایئر پورٹ بھی ایئر کنڈیشن نہیں تھا جبکہ ہمارا کراچی ایئر پورٹ ایئر کنڈیشن ہوتا تھا۔ایک گھنٹہ ٹھہرنا بہت ہی گراں گزرا جیسے ہی روانگی کا اعلان ہوا تو دوڑ کر غیر ایئر کنڈیشن بس میں سوار ہو گیا صحرا ہی صحرا تھا۔معمولی مکانات جہاز سے میں نے دیکھے تھے۔ہریالی تو نام کو نہیں تھی پھر آہستہ آہستہ اسی خطہ نے اتنی ترقی کی کہ آج ہم عش عش کر سکتے ہیں۔یورپ کی تمام قومیں یہاں آباد ہو چکی ہیں۔آپ کو رہائشی پرمٹ بھی مل سکتا ہے اگر آپ کوئی جائیداد خرید لیں یا ٹیکس فری زون میں اپنی فیکٹری لگالیں تو تین سال کا ویزہ تو فوراً مل جائے گا۔اور آپ اس ویزہ کو بغیر کسی کفیل کے بڑھا سکتے ہیں دراصل یو۔اے۔ای میں کاروبار یا رہنے کے لئے کفیل کی ضرورت لازمی ہے یہ کفیل یو اے ای کا باشندہ ہوتا ہے جو آپ کی ،حکومت یو اے ای کو ضمانت دیتا ہے کہ یہ میرا نمائندہ

ہے اور میرے کاروبار کو سنبھالتا ہے حالانکہ تمام سرمایہ تو اس بے چارے غیر ملکی کا ہوتا ہے مگر قانونی طور پر آپ اس کے نام کے بغیر کاروبار نہیں کر سکتے اور آپ کا سرمایا بھی اس عربی کے نام ہی تصور کیا جاتا ہے۔مگر جب ان غیر ملکیوں نے ان کے نام سے فائدہ اٹھا کر قرضے لینے شروع کر دیئے اور بعد میں ادا بھی نہیں کئے تو یو اے ای نے آہستہ آہستہ ان غیر ملکیوں کو اور دوسری جگہوں پر خود مختار بنا دیا کہ اُن کے شہری اس دھوکہ دہی سے دور رہیں۔آج یو اے ای کی تمام ریاستیں ڈائریکٹ ویزہ پالیسی اپنا چکی ہیں۔اُن کی کوشش یہی ہے کہ اب تاجر یا صنعت کار صرف دبئی میں اپنی فیکٹری نہ لگائیں بلکہ دیگر ریاستوں میں بھی لگائیں اور وہ بہت خصوصی مراعات بھی دینے کے لئے تیار ہیں یہی وجہ ہے کہ دبئی کے بعد شارجہ پھر عجمان راس الخیمہ فجیرہ میں صنعتی علاقے تا حال قائم ہو چکے ہیں۔اور چونکہ دبئی بہت ہی مہنگا ہو چکا ہے اور دبئی کی ٹریفک اتنی گھمبیر ہو چکی ہے کہ لوگ اب شارجہ عجمان منتقل ہو رہے ہیں۔خصوصی طور پر کرائے تو دبئی میں آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ایسے میں تو دوسری ریاستوں میں جا کر تجارت یا صنعت سازی نہ صرف آسان ہے بلکہ سستی بھی ہے الغرض تجارت کے لحاظ سے دبئی ہی نہیں بلکہ پورا یو اے ای اب تجارتی مرکز بن چکا ہے خواہ بھارت یا پاکستانی تاجر ہوں وہ اس ریاست کو چلا رہے ہیں۔اگر چہ اُن کی اکثریت بھی ہے مگر آئندہ چند سالوں میں یو اے ای مغربی ممالک سے آنے والے صنعتکاروں،تاجروں اور ملازمین سے بھر جائے گا۔کیونکہ یورپ میں ٹیکس کا نظام بہت مہنگا ہے اور رہائش،خورد و نوش بھی بہت ہی مہنگی ہے اس کے برعکس یو اے ای علاوہ گرم موسم کے لحاظ سے سستا اور محفوظ ہے۔اور اب جانا اتنا آسان ہے کہ 20 سال پہلے کا دبئی اب کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔ہم پاکستانیوں نے اُس ملک کی آبیاری کی۔اُس کی ایئر لائنز ایمریٹس بنا کر دی۔شہر تعمیر کئے آج وہ کہاں ہیں ہم کہاں ہیں کاش ہمارے حکمران اس سے سبق حاصل کر لیں تو ہماری یہی پاکستانی قوم جو یو اے ای میں زندگی گزار رہی ہے وہ واپس پاکستان میں آ کر اُس کی ترقی میں حصہ دار بن سکتی ہے مگر

ہمارے پاس افسوس قائداعظم اور قائدملت کے بعد ایسا کوئی لیڈر ہی پیدا نہیں ہوسکا جو پاکستان کو اس کے پاؤں پر کھڑا کر سکے اور جس نے ایسی کوشش بھی کی تو وہ تختہ دار پر چڑھ گیا۔اس کے بعد کون رسک لے گا۔کہ ایسا کام کرے کہ پاکستان بھی ترقی کی راہ پر چل سکے؟ہم تو خود ایک دوسرے کے پاؤں کھینچنے میں مصروف ہیں۔بھلا ہم کیوں کسی کی ترقی پر خوش ہوں۔ایک بہت ہی پرانی یونانی کہاوت ہے کہ جب دشمن کی جیب میں آپ ہاتھ ڈال کر لوٹ سکتے ہیں تو پھر دوست کی جیب پر کیوں نظر رکھتے ہیں،کیا آپ کے دشمن ختم ہو چکے ہیں مگر افسوس مسلمان تو اپنے ہی دوست کی جیبوں پر نظر رکھتے ہیں اور اُن کی ہی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں ہمیں تو اپنے دشمن نظر ہی نہیں آتے جن کی جیبوں میں ہم سے بہت بڑھ کر مال جمع ہے۔میں کس کس شہر یا ملک کی بات لکھوں جو ہم سے بہت پیچھے تھے مگر آج وہ سب ہم سے آگے جا چکے ہیں۔ہم تو جہاں تھے وہاں سے بھی پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔مثلاً ہمارے ملک میں جرائم سب سے کم تھے۔قتل و غارت گری نہ ہونے کے برابر تھی۔بہت ہی سادہ اور سستا ملک تھا۔1978ء تک تو ڈرگ کلاشنکوف (ہتھیار وغیرہ)تو کوئی جانتا بھی نہیں تھا ہم نے افغانستان کی جنگ میں اپنے آپ کو اتنا ملوث کرلیا کہ آج ہم دہشتگردوں کی لسٹ میں آ چکے ہیں کہاں ہم پستول کی گولی سے بھی آشنا نہیں تھے کہاں آج ہم کلاشنکوف چلانے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔افغانستان کے راستے ہمارے ملک میں نہ صرف جرائم بڑھے بلکہ اسلحہ منشیات غیر قانونی کاروبار عورت بچوں کی اسمگلنگ اتنی عام اور آسان ہوگئی کہ ہمارہ پاسپورٹ پوری دنیا میں مشکوک ہو کر رہ گیا ہے ہم نے 40 لاکھ افغانی اپنے ملک میں کیا آنے دیئے کہ خود پاکستانیوں کی شہریت مشکوک ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ پشاور میں رہنے والے پٹھان اور افغانستان سے ہجرت کرنے والے افغانی میں تو کوئی تمیز نہیں کر سکتا اور آج اِن افغانیوں نے 25 سال میں پاکستان کے ہر شہر میں تجارتی مراکز پر قبضہ کر رکھا ہے۔وہ ہر تجارت میں آ چکے ہیں اگر چہ اب افغانستان روسیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔مگر اب وہ پاکستان کو

چھوڑنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ہمارے سابق صدر ضیاء الحق نے کیا سوچ کر انہیں یہاں آنے دیا تھا کہ وہ ہماری معیشت پر ہی نہیں بلکہ ہمارے کلچر کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔آج ڈرگ اتنی آسانی سے پاکستان میں مل سکتی ہے جتنی ہمارے پڑوسی ممالک میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔کابل سے چلا ہوا اسلحہ کراچی اس طرح پہنچ جاتا ہے جیسے اسلحہ نہیں بچوں کا کھلونا ہو۔ہمارے نوجوان اب تو اس کو اس طرح استعمال کر رہے ہیں کہ خود کراچی جو سب سے محفوظ ترین شہر سمجھا جاتا تھا آج سیکڑوں گاڑیاں،موبائل فون اور موٹر سائیکل کے چھیننے میں پورے ملک میں سب سے آگے جا چکا ہے۔یہ اسٹریٹ کرائم کہاں تک جائیں گے کوئی نہیں جانتا۔مگر خود حکومت کے اہلکاروں کے بغیر نہ یہ روکا جا سکتا ہے نہ ختم کیا جا سکتا ہے خصوصی طور پر جب ایک پولیس والے کی تنخواہ اتنی کم اور پاور اتنی زیادہ ہو کہ وہ وزیراعظم کے گھر میں داخل ہوسکتا ہے تو پھر تخریب کار تو ان کو استعمال کریں گے ہی جو آج تک ہو رہا ہے۔اللہ ہی جانے ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کب کھلیں گی وہ عوام سے کھیلنے کے بجائے پاکستان کو بچانے کی کوشش کریں گے ہمارے عوام تو اب عملی طور پر مردہ ہو چکے ہیں۔اُن پر ایک دس کلو وزن ڈالیں یا 100 کلو وزن ڈالیں وہ تو اُٹھانے اور ڈھونے کے عادی ہو چکے ہیں۔جب تک مشرقی پاکستان ہمارے ساتھ تھا تو حکمران ڈرتے تھے مگر جب سے یہ الگ ہوا ہے آج ہمارے حکمران مادر پدر آزاد ہو چکے ہیں اُس کی صاف وجہ عوام کی بے حسی ہے جو ہر چیز کو برداشت کرنے کی عادات اپنا چکی ہے۔بے حس قوم پر پھر ایسے حکمران آجائیں تو شکوہ کس سے کریں۔کاش ہمارے درمیان اب کوئی قائداعظم پیدا ہو جائے تو شاید پاکستان بھی ترقی کر سکے فی الحال "ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا"؟

یہ ہی ہماری سارک کانفرنس تھی

گزشتہ ہفتے پہلی سارک کانفرنس انٹرنیشنل برائے ادویات 26 جولائی تا 30 جولائی 1999 منعقد کی گئی پروگرام کے مطابق کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم نواز شریف کو کرنا تھا مگر آخری دن اعلان ہوا کہ وزیر اعظم اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکیں گے وزیر صحت جناب جاوید ہاشمی انکی نمائندگی کریں گے۔مگر کانفرنس والے دن صبح بتایا گیا کہ وہ بھی مصروف ہیں اور نہیں آسکیں گے،اس لیے سیکریٹری صحت جناب حسن رضا پاشا نے کانفرنس کا افتتاح کیا ادویات کی کانفرنس سارک ممالک یعنی بھارت، نیپال، بھوٹان، مالدیپ، سری لنکا، بنگلہ دیش اور پاکستان میں بننے والی اوویات کے تیار کنندگان کے لئے منعقد کی گئی تھی پاکستان اس کا میزبان تھا۔اطلاعات کے مطابق اس موقع پر تمام رکن ممالک کی دواؤں کے اسٹال لگائے جانے تھے مگر حیرت انگیز طور پر پاکستانی ادویہ سازوں کے سواء اوران کی وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے علاوہ تمام کی تمام پاکستانی کمپنیاں تھیں کسی ملک کے دوا سازاداروں نے اسٹال نہیں لگائے دوسری حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ پاکستان کے علاوہ دیگر تمام سارک ممالک کے کل تین مندوبین کانفرنس میں موجود تھے۔بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال، بھارت اور مالدیپ سے نہ تو کوئی مینوفیکچرار اور نہ ہی کوئی خریدار آیا۔صرف سری لنکا سے ایک مندوب آیا ایک نمائندہ چین نے بھیجا تھا۔ پانچوں دن اسٹیج سے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے نمائندے اور پاکستانی وزارت صحت کے عہدیدران

مقالے پڑھتے اور کانفرنس کی افادیت بتاتے رہے۔یہ اس نوعیت کی عجیب کانفرنس تھی جس میں سارک ممالک کے جھنڈے تو لہراتے رہے مگر نمائندگی صفر تھی۔پاکستان فارماسیوٹیکل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن، جو پاکستان کی واحد نمائندہ ایسوسی ایشن ہے اس کے ارکان، حیران پریشان پانچ روز تک سارک ممالک کے نمائندوں اور خریداروں کا انتظار کرتے رہے اور اپنا احتجاج رجسٹر کراتے رہے اگر چہ وزارت صحت کے تمام ذمہ داروں بشمول ڈائریکٹر جنرل غیور ایوب، ڈرگ کنٹرولر ڈاکٹر فرزانہ چودھری رؤف خالد، مقامی اسسٹنٹ کنٹرولر تنویر احمد، عبدالسمیع اور احمد جان اور سیکریٹری صحت حسن رضا پاشا صاحب پیش پیش رہے اور کانفرنس کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے مگر سارک کے ارکان کی غیر حاضری سب کے لئے حیران کن تھی۔پانچوں دن ناشتے، لنچ اور ڈنر کے علاوہ اس کانفرنس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ہاں کانفرنس کے پاکستانی منتظمین نے اسٹال ہولڈرز سے لاکھوں روپے وصول کر لیے یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مالدیپ، بھوٹان اور نیپال میں دوا سازی کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے پاکستانی دوا سازاداروں کو یقین تھا کہ وہ ان ممالک کے ساتھ مشترکہ منڈی بنا سکیں۔مگر ان ملکوں کی عدم دلچسپی حیرت انگیز ہی نہیں ہے بلکہ بعض شکوک وشبہات کو بھی جنم دے رہی ہے بنگلہ دیش میں چھوٹے چھوٹے دوا ساز کارخانے ہیں مگر پاکستان جیسی بڑی صنعت نہیں ہے بھارت کے حوالے سے معلوم ہوا کہ کارگل کی وجہ سے بھارتی دوا ساز کو ویزے نہیں ملے، اس وجہ سے وہ شرکت نہیں کر سکے سری لنکا کا واحد نمائندہ بھلا کیا کر سکتا تھا۔

حکومت کے ارباب اختیار کو اس کا نوٹس لینا چاہیے اور اس اہم کانفرنس میں سارک ممالک کی عدم دلچسپی کی وجوہات کا پتہ لگانا چاہیے خصوصاً اس بات کا کہ کہیں یہ بھارت کی اندرونی سازش تو نہیں جس نے دیگر ممالک کو اپنی عدم شمولیت سے آگاہ کر کے پاکستان کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہو۔اگر تجزیہ کیا جائے تو سارک تنظیم آج تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی یورپی ممالک نے مشترکہ تجارت، کونسل،

آسیان، کرنسی ایک کر کے کامیابی حاصل کی خلیجی ممالک جی ای سی کے ذریعے اپنے مسائل حل کر رہے ہیں سارک کی کارکردگی ابھی تک صرف نشستند و گفتند و برخاستند تک ہے اور اب تک چھوٹی چھوٹی کانفرنسوں کے علاوہ سربراہان کی بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کر چکی ہے جن پر اربوں روپے خرچ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک امید کی پہلی کرن بھی نہیں پھوٹی اور نہ ہی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ ہمارے اس خطے کے کیا مسائل ہیں اور ہم کس طرح انہیں حل کر سکتے ہیں بھارت ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو آگے کر دیتا ہے پاکستان اس کی ذمہ داری بھارت پر ڈالتا ہے۔ جب تک یہ دونوں ممالک سنجیدگی سے اس مسئلہ کا حل نہیں نکالینگے سارک کانفرنس ہوتی رہے گی اور نتیجہ صفر ہی رہے گا صفر کے آگے 10 صفر لگا لیجئے صفر ہمیشہ صفر ہی رہے گا۔ آج نہیں تو کل ہمیں احساس ہوگا کہ ہم کتنی بڑی غلطی دہرا دہرا کر اپنا اور اس خطے کا امن خراب کرتے رہے ہیں۔ ذرا سوچیں 50 سال پہلے فرانس اور انگلستان ایک دوسرے کے ازلی دشمن سمجھے جاتے تھے انگریزی بولنا فرانس میں گالی کے مترادف تھا مگر آج فرانس میں سب سے زیادہ زور انگریزی سیکھنے پر ہے کیونکہ ان ممالک نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ نفرت اور جنگ حماقت کے سوا کچھ نہیں اصل جنگ بھوک کے خلاف اور اقتصادی اور تعلیمی میدان میں کامیابیوں کے حصول کے لئے لڑنی چاہئیں، جب ہی قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی کرنسی اور تجارت ایک دوسرے سے منسلک کر دی ہے۔ اب وہ دوبارہ امریکہ، خلیج، سارک اور ایشین مارکیٹوں پر چھا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے اپنے داموں پر اپنا مال فروخت کر کے اپنی قوم کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ ان کے پاس ایٹمی ٹیکنالوجی بھی ہے اور صنعتی ٹیکنالوجی بھی ہے سب ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کرتے ہیں مگر ہم غربت میں مبتلا ہیں۔ ایک دوسرے کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں ہمارے عوام بنیادی سہولتوں پانی، بجلی، تعلیم اور آلودگی سے پاک ہوا تک سے محروم ہیں ہمارا بال بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمیں ابھی تک اپنے اصلی دشمن کا بھی پتہ نہیں ہے مگر

ہم دونوں آج بھی۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور دیگر دینے والے اداروں کی شرائط پر قرضے لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ قوم کو غربت کی طرف دھکیل رہے ہیں اور ایٹمی طاقت بننے پر خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ ہماری کرنسی دن بہ دن نیچے جا رہی ہے آخر ہم کب تک اپنی قوم کو بنیادی ضرورتوں سے دور رکھیں گے بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام جنگ نہیں چاہتے مگر کون ہے جو ہم کو پچاس سال گزرنے کے باوجود ایک دوسرے کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔ خدارا سارک ممالک اپنی سوچیں یورپی سوچ سے ہم آہنگ کر لیں ایک دوسرے کا احترام کریں اور اپنی اپنی قوم کو جہالت اور غربت سے نکالیں۔ اپنے اپنے مسائل کچھ لو کچھ دو کے طریقے سے حل کریں ورنہ کانفرنسیں ہوتی رہیں گی اور ہم پھر غلطیاں دھراتے رہینگے قوم کے پیسے پھونکتے رہیں گے اور فائدہ انہی کو پہنچے گا جو نہیں چاہتے کہ سارک ممالک ایک ہو جائیں۔

امریکہ میں دو ہفتے

پچھلے ہفتے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ویسے تو آنا جانا رہتا ہے مگر اس مرتبہ 14 اگست قریب تھا اور پاکستان کے جشن آزادی کے جلوس کا بڑا شہرہ سنا تھا تو سوچا چلو اس سال ہم اپنے وطن عزیز پاکستان کی آزادی کا یہ جلوس اپنی آنکھوں سے دیکھ چلیں خصوصاً اس لیے بھی کہ 15 اگست کو بھارت کی آزادی کا دن ہے اور اس روز بھارتی باشندے بھی اپنی آزادی کا جشن مناتے ہیں ان کا جلوس بھی دیکھا جائے اور اس کا پاکستان کے جلوس سے موازنہ کیا جائے۔ یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ امریکہ میں دنیا کی تقریباً ہر قوم آباد ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی ملک کا یوم آزادی منایا جاتا ہے مین ہٹن میں ان جلوسوں اور پریڈوں سے سیاح اور مقامی باشندے نہ صرف محفوظ ہوتے ہیں بلکہ اس سے انہیں متعلقہ ملک کی ثقافت، لبادہ اور رکھ رکھاؤ سے بھی آگاہی ہوتی ہے اس مرتبہ 14 اگست جو ہفتہ تھا اور 15 اگست کو اتوار اور یہ دونوں ہی دن چھٹی کے ہوتے ہیں لہٰذا امید تھی کہ دونوں دن ان پریڈوں اور جلوسوں میں گزرے گا۔ مگر بہت تعجب ہوا کہ پاکستانی سفارت خانے میں 14 اگست کے حوالے سے کوئی پروگرام نہیں رکھا۔ جبکہ اتوار کو ہندوستان نے اپنے جشن آزادی کی پریڈ اور طویل جلوس، رنگ برنگے جھنڈوں اور بڑے بڑے فلوٹوں سے امریکیوں کو متاثر کیا۔ اس جلوس میں عورتیں، مرد، بچے حتیٰ کہ بوڑھے بھی شامل تھے بڑی بڑی ہندوستانی کمپنیوں نے اس کے اخراجات برداشت کئے اور اپنے

اپنے رنگ برنگے فلوٹوں سے اپنی مصنوعات کی نمائش کی اس جلوس کی قیادت میں مشہور فلم اسٹار گووندا، گلوکارہ آشا بھونسلے پیش پیش تھے نام تو اور بھی فنکاروں کے تھے مگر میں کسی اور کو نہیں دیکھ سکا پبلک تھی کہ ٹوٹی پڑی تھی۔ شام تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پاکستان اگلے اتوار کو اپنا جشن آزادی اسی مین ہٹن میں منائے گا مجھے کیونکہ واپس پاکستان آنا تھا۔ اس لئے میں حسرت دل میں لئے واپس لوٹ آیا اسی وجہ سے پچھلے ہفتے کالم بھی نہیں لکھ سکا تھا۔ امریکہ میں بہت پاکستانی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے مگر اس مرتبہ کشمیر کی لڑائی کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنی اپنی جگہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ امریکہ ہی نہیں دنیا کے تمام دیگر ممالک میں ایک بڑی سچی اور اہم بات بتاتا چلوں کہ ہندوستانی اور پاکستانی ہی ایک دوسرے کے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ چھٹی والے دن گھروں میں ایک دوسرے کی دعوت کا عام رواج ہے امریکیوں تک سے جن کے ملک میں وہ رہ بس رہے ہیں۔ تعلق علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھتا ان کا کہنا ہے کہ ہمارے سیاستدانوں نے ہم کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے اور کشمیر کو فٹ بال کا کھیل سمجھ کر کھیل رہے ہیں اگر ہم دوست بن جائیں تو دنیا میں صنعتی انقلاب لا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری عوام انتہائی محنت کش ہیں 18 گھنٹے کام کر کے اپنے سستے لیبر کی وجہ سے ہم نہ صرف اپنے عوام کو غربت سے نجات دلا سکتے ہیں۔ بلکہ اپنے سکے کو دوبارہ ڈالر کے برابر لا کر ان سے آنکھ ملا کر بات کر سکتے ہیں۔ صرف ان دونوں ملکوں کی اپنی 125 کروڑ کی منڈی ہے جس سے کئی یورپ اور امریکہ بن سکتے ہیں۔ مگر ہم اپنی تمام صلاحیتیں لڑ لڑ کر ضائع کر رہے ہیں۔ ایک بہت بڑے ہندوستانی بزنس مین نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کی فیملی ہندوستان میں ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے بہن بھائیوں کے لئے کتنا پیسہ بھیجتے ہو۔ اس نے ہنس کر کہا پہلے تو میں ہر مہینے خاصی رقم بھیجا کرتا تھا۔ مگر اب بہت عرصہ سے بند کر دیا۔ کیونکہ بڑی محنت کر کے ڈالر کماتا ہوں۔ اور وہ آپس میں لڑ لڑ کر مر رہے ہیں۔ تو

کیوں نہ یہ بھوکے مر جائیں ۔جب ان کو عقل ہی نہیں ہے تو میں اپنا ڈالر کیوں ضائع کروں اچھے ہمسائے سے اگر تم دوستی نہیں رکھ سکتے تو کم از کم لڑائی مت کرو یہاں دیکھو میری دعوت میں ہندوستانی فیملی بھی ہیں اور پاکستانی فیملیاں بھی مدعو ہیں۔ ہمارا مرنا جینا امریکنوں کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ یہاں ہم ڈالر کمانے آئے ہیں ۔ ہماری زبان، کھانا پینا، رہنا سہنا ایک ہے تو ہم یہاں کیوں لڑیں امریکہ میں سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ اصول ہیں جو اسلام نے ہمیں بتائے ہیں ۔مگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا اور امریکنوں نے اپنالیا ۔مثلاً وہ جھوٹ نہیں بولتے ،جھوٹی گواہی نہیں دیتے ،خریدا ہوا مال اگر کسی کو پسند نہ آئے تو 30 دن کے اندر وہ رسید دکھا کر واپس لے لیتے ہیں ،انسانوں کے ساتھ ہی نہیں جانوروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں ۔اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ایشیائی باشندہ ہے یا امریکن آناً فاناً اس کو اسپتال پہنچا دیتے ہیں۔ اگر کسی کی نوکری ختم ہو جائے تو بے روزگاری الاؤنس دیتے ہیں مسلمانوں کو انہوں نے پوری مذہبی آزادی دے رکھی ہے جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں کاؤنٹی مسجدوں کے لیے پلاٹ دیتی ہے آپ آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی تہوار منا سکتے ہیں اس لیے کام کرنے والوں کو چھٹی دیتے ہیں دنیا کے تمام ممالک کو امداد دیتے ہیں ۔قرضے دیتے ہیں۔ اپنے ملازمین میں کوئی امتیاز نہیں برتتے ایک ہی ٹیبل پر مالک اور نوکر بیٹھ کر کھاتے ہیں یعنی ہم مسلمانوں نے اسلام کے ان سنہری اصولوں کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے آج ہم ان کے مقروض ہیں۔ اسلامی سلطنتیں ختم ہوگئی ہیں ۔ہم جہالت اور غربت میں گرفتار ہیں ۔اسی طرح ایک پاکستانی دوست کے گھر موعو تھا۔ اس نے مجھے ایک کونے پر لے جا کر درخواست کی کہ آپ اپنے کالم میں اس بات کا ضرور ذکر کریں کہ پاکستان میں جب کوئی بات ہوتی ہے وہ امریکن ایمبسی پر مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کا جھنڈا جلاتے ہیں ۔بھارت میں بڑے بڑے ٹی وی چینل سے ان مناظر کو دیکھایا جاتا ہے ۔جس کی وجہ سے امریکن کہتے ہیں ایک طرف ہمارے جھنڈے جلاتے ہو دوسری طرف ہم

سے قرضے اور امداد بھی مانگتے ہو۔ اس وجہ سے ہمارے سر ان کے سامنے جھک جاتے ہیں ۔وہ اس کا بڑا برا مناتے ہیں۔ اور ہم پر آواز کستے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں ۔اگر انہوں نے ہم پاکستانیوں کو امریکہ سے نکال دیا تو اس کا نقصان کس کو ہوگا۔ کبھی یہ سوچا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف قسط بند کر دے اور ہماری تجارت پر پابندیاں لگا دے تو اتنی بڑی منڈی بھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے پاس چلی جائے گی ۔لہذا ان جذباتی نعروں سے غریبوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے بلکہ بھوک اور افلاس میں اضافہ کر سکتے ہیں ۔ پہلے ہی ہم پر دہشتگردی کا الزام ہے کیا ہم عراق اور لیبیا کی طرح اپنے بچوں کو روٹی اور دوا کے بغیر مرتا دیکھ سکیں گے؟ ہم کو دوست بنانے چاہئیں نہ کہ روز ہم ایک دشمن بنا رہے ہیں ہماری فارن پالیسی میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی آنی چاہیئے ۔عرب ممالک اسرائیل سے تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ تقریباً سب نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے حتیٰ کی فلسطینیوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے، تو ہم کیوں اسرائیل سے بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے اسرائیل کو کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ پوری دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے ہم اس سے کیوں دشمنی پر تلے ہوئے ہیں؟ اس کی باتوں میں وزن تھا۔ میں اس وقت جہاز میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ ہم کب اپنی قوم کو غربت اور جہالت سے نجات دلا سکیں گے۔

پاک چین دوستی زندہ باد

پاکستان میں گزشتہ ہفتے حکومت اور پی ٹی وی نے چین کا خصوصی ہفتہ منایا۔ یہ ان کے 51 سالہ جشن آزادی کے موقع پر منایا گیا۔ اس ہفتہ پاک چین دوستی کا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور چینی بھائیوں کے جشن آزادی میں پاکستانیوں نے بھی بھرپور شرکت کی۔ جس سے یقیناً پاک چین دوستی میں مزید پیش رفت ہوگی۔ چین ہمارا قریب ترین اور عظیم پڑوسی ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ پاکستان پر جب بھی کوئی برا وقت پڑا چین نے بھرپور ساتھ دے کر اپنی مخلصانہ دوستی کا ثبوت دیا۔ جو ایک اچھے پڑوسی کی نشانی ہے۔ چین نے کئی مرتبہ پاکستان کو بیرونی خطرات سے قبل از وقت آگاہ بھی کیا اور ان سے نمٹنے کا نہ صرف حل بتایا بلکہ اکثر اوقات معاملات سے نمٹنے میں عملی مدد بھی کی۔ ایوب خان سے لے کر موجودہ حکومت تک سب سے بین الاقوامی تعلقات میں جس کی دوستی کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور ماؤزے تنگ اور چواین لائی سے لے کر چین کے موجودہ حکمرانوں تک سب سے پاکستان کے ساتھ بہترین اور خصوصی تعلقات استوار رکھے اور ان میں اضافے کے لئے کوشاں ہے اور آج پاک چین دوستی قوموں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے جس مقام پر ہے، اس کی مثالیں دنیا میں کم ہی کم ملیں گی اور عدیم المثال دوستی، دونوں کے دشمنوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ آج سے 32 سال قبل 1967ء میں پہلی بار بیرون ملک جانے کا اتفاق ہوا تو وہ پہلا غیر ملکی سفر چین کا تھا۔ اس زمانے میں

ہانگ کانگ کے لئے پی آئی اے کی پروازیں چین کے شہر کینٹون (Canton) کے راستے جاتی تھی۔ جہاں ایک رات ٹھہرا کر دوسرے دن بذریعے ہانگ کانگ جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ دوپہر میں کینٹون پہنچا بہت کھلا کھلا اور صاف ستھرا شہر تھا۔ اس زمانے میں کراچی اور کینٹون کی آبادی برابر تھی۔ یعنی 30، چالیس لاکھ مگر کینٹون میں صرف ایک ہوٹل تھا جس میں تقریباً 800 کمرے تھے۔ ہماری فلائٹ کے تقریباً 50 مسافر اس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے باقی تمام فلور خالی تھے۔ انکشاف ہوا کہ غیر ملکی فضائی کمپنیوں میں صرف پی آئی اے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ چین کی سرزمین کو استعمال کر سکتی ہے۔ باقی کسی بھی ایئر لائن کے چین آنے یا جانے پر پابندی تھی۔ کینٹون صنعتی شہر بھی تھا اور زرعی بھی۔ لہٰذا ایک طرف فیکٹریاں تھیں تو دوسری جانب سبزہ ہی سبزہ۔ ہم شام 5 بجے ہوٹل کے باہر کھڑے تھے کہ یکا یک سینکڑوں سائیکل سوار ہمارے ہوٹل کے آگے سے گزرے جن میں تقریباً ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ پی آئی اے کے عملے کے افراد نے ہمیں بتایا کہ نزدیکی فیکٹریوں کی چھٹی ہوئی ہے اور یہ تمام سائیکل سوار انہی فیکٹریوں کے ملازم تھے اور ہر روز صبح و شام اسی طرح آتے جاتے ہیں۔ ان سائیکل سواروں نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلائے اور ہم نے بھی ہاتھ ہلا کر ان کا جواب دیا۔ یہ پاکستان اور چین کے عوام کے درمیان دوستی کے جذبے کا ایک مخلصانہ اظہار تھا۔ چین کا ذکر ایک حدیث مبارک میں بھی آیا ہے یعنی ''علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے''۔ حدیث مبارک میں چین کے اس ذکر کے 2 پہلو ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس زمانے میں چین ایک دور افتادہ ملک تھا اور جہاں پہنچنا ایک دشوار ترین کام تھا لہٰذا حدیث پاک میں چین کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا کہ علم حاصل کرنے کے لئے کیسا ہی طویل اور دشوار سفر کرنا پڑے۔ اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی چین علم و ہنر اور تہذیب و تمدن میں اس قدر آگے تھا کہ وہاں کا سفر علم کے جویا لوگوں کے لئے ضروری تھا علاج معالجے کے لئے جڑی بوٹیوں۔ یوگا، ایکوپنکچر جیسی طبی

سہولتیں وہاں اس وقت بھی میسر تھیں یہ انکشاف کئی چین کا سفر کرنے والے کئی مسلمان اور غیر مسلم سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں کیا تھا۔چین کے زمانہ قدیم سے علم وہنر میں یکتائے روزگار ہونے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے تو آج بھی اور دیوار چین کی صورت میں موجود ہے جو دنیا کے سات عجائب میں شمار ہوتی ہے۔اس زمانے میں یعنی آج سے 30 سال پہلے الیکٹرک ٹرینیں شہروں میں آمدورفت کا ذریعہ تھیں اور بڑی بڑی ٹرینیں ایک شہر سے دوسرے شہر آتی جاتی تھیں چین چونکہ ایک کمیونسٹ ملک تھا اس لئے تمام کاروبار، صنعتیں حکومت کی ملکیت تھیں اور عوام اس میں کام کر کے اپنی اور ملک کی ضروریات پوری کرتے تھے اس طرح گویا ہر شخص سرکاری ملازم تھا۔کوئی چیز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی حکومت روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنے کی ذمہ دار تھی۔سرکاری طور پر چند ہی گاڑیاں دیکھنے میں آئیں معلوم ہوا کہ یہ غیر ملکی سفیروں اور سربراہوں کے آمدورفت کے وقت استعمال ہوتی ہیں باقی لوگ تمام سائیکلوں پر سفر کرتے ہیں یا پھر الیکٹرک کی بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے آتے جاتے ہیں۔

پھر چین میں صنعتی انقلاب آیا آہستہ آہستہ ڈی نیشنلائزیشن شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چین میں بڑی بڑی صنعتیں لگنے لگیں غیر ملکی بھی جن میں جاپان اور کوریا کے صنعتکار سرفہرست تھے چین کے شہروں میں صنعتیں لگانے لگے کیونکہ یہاں افرادی قوت وافر اور سستی تھی۔چینی عوام بہت محنتی اور ذہین ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ 10 پندرہ سال کے مختصر عرصے میں چین نے سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر چیز بنانے کی ٹیکنالوجی حاصل کرلی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بڑی سے بڑی چیز وہاں بنائی جارہی ہے، جو نہ صرف چینی عوام استعمال کر رہے ہیں بلکہ بڑے پیمانے پر سستے داموں یہ اشیاء دنیا بھر میں ایکسپورٹ کر کے بھاری زرمبادلہ بھی کما رہے ہیں۔معیاری اور کم قیمت ہونے کی وجہ سے اشیاء کی یورپ اور امریکہ میں بہت مانگ ہے اس صنعتی انقلاب میں دنیا کی تمام بڑی بڑی فیکٹریاں جن میں ادویات، چمڑا ٹیکسٹائل، کیمیکل پلانٹ وغیرہ سرفہرست ہیں تمام کی تمام چین میں جوائنٹ وینچر کی شکل

میں لگ چکی ہیں ۔ہانگ کانگ میں ان کے نمائندہ دفاتر ہیں اور چین میں ان کی فیکٹریاں ہیں۔ ہانگ کانگ بھی اپنی 100 سالہ مدت پوری کر کے واپس چین کا حصہ بن چکا ہے۔الغرض ہم کو چین سے سبق سیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اتنے کم وقت میں کیسے ترقی کی اور ہم کو غور کرنا چاہیے کہ صنعتی ترقی کرنے کے بجائے زوال پذیر کیوں ہیں؟

میرا خیال ہے کہ اگر ہماری حکومت چینی حکومت کے ساتھ بات چیت کرے تو چین اب اس پوزیشن میں ہے کہ وہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کر کے دونوں ممالک کے لئے روزگار کا موقع پیدا کرے۔چینی اور پاکستانی عوام میں کئی باتیں مشترک ہیں دونوں محنتی اور جفاکش ہیں دونوں ایثار و خلوص کے پیکر ہیں مگر ہم نے چینیوں کی دوستی سے وہ فوائد حاصل نہیں کئے جو ہم کر سکتے تھے۔صنعتی معاملات ہوں یا دفاعی معاملات ہمیں چین سے زیادہ مخلص اور قابل اعتماد دوست نہیں ملے گا ایسا دوست جو وقت پڑنے پر پیچھے نہ ہٹے 30 سال بعد دوبارہ چین جانے کا اتفاق ہوا تو اسی کیفون شہر میں جہاں صرف ایک ہوٹل تھا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گلی گلی میں فائیو اسٹار ہوٹل موجود ہیں۔اور ترقی یافتہ ممالک کی طرح چین کے ہوائی اڈہ پر تمام ائرلائنوں کے جہاز آرہے ہیں۔بلند وبالا طرز کی بلڈنگوں کی قطاریں ہیں جہاں چند گاڑیاں تھیں وہاں آج کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں پر گاڑیوں کی قطاریں ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں سرکاری اور نجی دونوں شعبوں میں خوب سرمایہ کاری ہورہی ہے نئی نئی صنعتیں لگ رہی ہیں مگر ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہم آئی ایم ایف، ورلڈ بینک لندن کلب، پیرس کلب سے امیدیں لگائے بیٹھے۔

جو یہودی سوچ کی اختراع ہے جو ایک ڈالر دے کر 10 دس ڈالر وصول کر کے ہندوبنیوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ہماری صنعتی ترقی میں نت نئی رکاوٹیں ڈال کر ہمیں اپنا دست نگر رکھنا چاہتے ہیں۔گذشتہ 15 سال سے کراچی میں چین کے جتنے بھی قونصل جنرل آئے پاکستان سے محبت ان کی قدر مشترک

رہی ہے۔مگر موجودہ قونصل جنرل کی بات جدا ہے موصوف نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان کی ہر چیز سے محبت دل سے کرتے ہیں،وہ پاکستان کی قومی زبان نہ صرف بولتے ہیں بلکہ لکھتے اور پڑھتے بھی ہیں علاوہ ازیں ان کے عملے کے افراد بھی متعدد اردو دان ہیں۔یہ سب پاکستان کی ترقی وخوشحالی کے دل سے خواہاں ہیں۔ان کا پاکستان کے بارے میں وسیع مطالعہ بھی ہے ہر پاکستانی سے وہ نہایت پرتپاک اور گرم جوشی سے ملتے ہیں۔چینی قونصل خانے میں اکثر مختلف تقریبات اور خصوصی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں کو دعوت دی جاتی ہے اور قونصل جنرل اور دیگر سفارتکاران نشستوں میں مختلف حوالوں سے پاکستان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔اور مفید مشورے اور تجاویز بھی پیش کرتے ہیں کاش ہم ان کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر پاکستان میں صنعتی اور زرعی انقلاب برپا کرنے کی توفیق پاسکیں اور غیر ملکی قرضوں سے جان چھڑا سکیں اے کاش!

دو براعظموں کے پڑوسی ملکوں کی کہانی

یورپ کے دو ممالک ایک ہی براعظم میں واقع ہیں اور ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ان کا نام انگلستان اور فرانس ہے دونوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔دونوں کی تہذیب وتمدن،رہنا سہنا،کھانا پینا،سیاسی شعور الغرض کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتی دونوں پڑوسی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے جانی دشمن سمجھتے جاتے ہیں۔ایک دوسرے کی زبان بولنا تو کجا پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے فرانسیسی انگلش زبان کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے اگر کوئی مسافر فرانس میں انگریزی میں کوئی پتہ پوچھتا تھا تو فرانسیسی اسے نفرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا اور بیچارا مسافر منہ دیکھتا رہ جاتا تھا یہ کوئی صدیوں پرانی بات نہیں صرف 10 پندرہ سال پہلے تک کی بات ہے۔ایک زمانے میں دونوں ملکوں میں بادشاہت تھی۔فرانس اپنے بادشاہوں سے نجات پاکر جمہوری ملک بن گیا مگر انگلستان میں آج بھی ملکہ کا راج ہے اور ساتھ ساتھ جمہوریت بھی ہے۔دونوں نے دیگر ممالک پر حکمرانی کی۔فرانس کی حکمرانی زیادہ تر عربوں کی خلیجی ریاستوں،افریقہ اور فرانس سے متصل سرحدی ممالک تک محدود رہی۔اسی وجہ سے اپنے آپ کو عظیم حکمران سمجھتے تھے اور انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ناپ تول کا نظام انگریزوں سے مختلف تھا۔انگریز اونس،پونڈ،گیلن،میل میں حساب کرتے تھے تو وہ کلوگرام،لیٹر اور کلومیٹر کے نظام سے کام چلاتے تھے یعنی کوئی بھی چیز ان میں مشترک نہیں تھی۔دونوں

ایک دوسرے پر برتری لے جانے کی کوشش کرتے تھے البتہ انگریزوں کا رویہ فرانسیسوں کے مقابلے میں اس قدر جارحانہ نہیں ہوتا تھا۔ان کی فتوحات فرانسیسوں سے بہت زیادہ تھیں۔وہ تقریباً ہر براعظم میں اپنی حکومت کو پھیلا چکے تھے اسی وجہ سے خود کو گریٹ برٹن (Great Britian) کہلواتے تھے۔ اور ان کا دعوی تھا کہ ان کے زیر اقتدار علاقے میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔مگر ان کی دشمنی ہمیشہ مثالی رہی ہے دونوں خوشحال تھے۔پڑھے لکھے صنعتی تجارتی طور پر ترقی یافتہ تھے۔موسم اور مذہب دونوں کے تقریباً دونوں کے ایک تھے۔سوائے کیتھولک مذہب یعنی عیسائیت میں کچھ بادشاہت کا دخل انگریزوں میں آچکا تھا کیونکہ عیسائی مذہب میں طلاق نہیں ہوتی تھی۔برطانیہ کے قانون میں مطلقہ سے بادشاہ کی شادی کی ممانعت تھی اسی وجہ سے پروٹیسٹنٹ وجود میں لائے گئے اور چند ترامیم بادشاہ نے کروالیں باقی تمام چیزیں وہی رہیں آہستہ آہستہ یورپ والوں نے دیکھا کہ ایشیا والے ان سے آگے بڑھ رہے ہیں وہاں تعلیم آچکی ہے ان کی تعداد آبادی کے لحاظ سے زیادہ ہے اور وہ خود سر بھی ہوتے جارہے ہیں انہوں نے سکیڑنا شروع کر دیا اور اپنی اپنی مملکت کو سمیٹنا شروع کر دیا۔جس کی وجہ سے قومیں آزاد ہونے لگیں اور نئے نئے ملک دنیا کے نقشے پر ابھرنے لگے۔انہی ملکوں میں ایک ملک بھارت بھی تھا جو 52 سال پہلے آزاد ہوا۔اس ملک میں کئی قومیں آباد تھیں جو ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں ان میں مسلمان اور ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد بھی باقی سکھ،عیسائی،یہودی اور پارسی بہت کم تھے اس ہندوستان پر ایک عرصہ تک مسلمان حکمران رہے دونوں کا مذہب اگرچہ الگ تھا مگر دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ دوست رہے دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے تھے دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے یعنی اردو زبان۔پھر کھانا پینا بھی تقریباً ایک جیسا تھا سوائے آپس میں مذہبی ممنوعہ اشیاء کے دونوں ایک جیسا ہی کھاتے تھے غربت بھی دونوں کی عام (Common) تھی۔ اگر کسی کو اردو نہیں آتی اور وہ دوسری زبان بولتا تھا تو بھی نفرتوں کا کوئی پہلو نہیں تھا ایک دوسرے کے

مذہبی تہواروں میں شرکت کرتے تھے الغرض ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں بھی شریک تھے ہمارے بزرگ بتاتے ہیں برس ہا برس ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے ناتے آپس میں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا تھا اگر کسی نے شر انگیزی کی کوشش کی تو بزرگوں نے آپس میں بیٹھ کر بیچ بچاؤ کرا کے معاملہ ہمیشہ کے لئے طے کرادیا۔

پھر ہندوستان آزاد ہوگیا تو دونوں قومیں آزاد ہوگئیں مگر افسوس شر پسندوں اور مفاد پرستوں کو موقع مل گیا نسلوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے راتوں رات ایک دوسرے کے نہ صرف دشمن بلکہ خون کے پیاسے ہوگئے۔ایک دوسرے کو قتل کر کے اس کے مال پر قابض ہوگئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھ کر لڑ رہے ہیں حالانکہ غربت آج بھی دونوں کا عام مسئلہ (Common Problem) ہے،انگریز جاتے جاتے کشمیر کی صورت میں دونوں کے درمیان دانستہ ایسا ناسور چھوڑ گیا جو دونوں کو کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دے گا۔بھارت چونکہ طاقتور تھا اور پاکستان بحیثیت نوزائیدہ ملک بے حد کمزور اس نے کشمیر پر جھگڑا کرنے کے بجائے یو،این او اور اس وقت بھارتی حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار کر کے دوبارہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر افسوس مغربی ممالک نے ہم کو ایک دوسرے سے کھنچاؤ اور تناؤ میں رکھ کر ہماری ساری اقتصادی جنگ اور دشمنی کی آگ میں جھونک رکھا ہے اور خود دور بیٹھے ہوا دیکھ رہا ہے۔

گزشتہ 52 برسوں میں دونوں طرف کے مالی اور جانی نقصانات کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ کھربوں ڈالر اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے دوسری طرف وہی ازلی دشمن انگلستان اور فرانس ایک دوسرے کے اتنے قریب قریب آچکے ہیں کہ ان کی کرنسی،پارلیمنٹ، ایکسپورٹ ایک ہوچکی ہے۔فرانس میں اب انگریزی بولنا فخر سمجھا جاتا ہے دونوں ایک دوسرے سے کھل کر تجارت کر رہے ہیں اور یورپ پھر سے ایشیاء کو من مانے داموں پر ٹیکنالوجی بیچ رہا ہے اور ہم

اپنے ازلی دشمن کو آج بھی نہیں پہچان سکے ہیں۔انہوں نے اپنی مفتوحہ مملکتیں آہستہ آہستہ آزاد کردی ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ آج کسی بھی ملک پر زبردستی اجارہ داری قائم نہیں رکھی جاسکتی،میں بھارتی حکمرانوں سے سوال کرتا ہوں کہ آپ نے باون (52) سال کشمیر پر بالجبر حکومت کر کے کیا حاصل کیا؟اور آئندہ یہ ہٹ دھرمی جاری رکھی تو آپ کیا حاصل کرسکیں گے؟کشمیر فطری طور پر بھارت سے الگ ہے،اسے بزور بھارت کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا لہٰذا بھارتی حکمرانوں کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے اور کشمیریوں کو ان کی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حق دیدینا چاہیے اسی میں بھارت سمیت سب کا بھلا ہے۔روس جیسا ملک افغانستان پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکا وہ عاقبت اندیش تھا اس نے جلد ہی سمجھ لیا کہ اب کوئی ملک دوسرے ملک پر زبردستی حکومت نہیں کرسکتا وہ اس محاذ آرائی میں اربوں روبل اور ہزاروں جانوں کا نذرانہ دے کر افغانستان سے دستبردار ہوگیا۔جبکہ بھارت کھربوں ڈالر خرچ کر کے اور لاکھوں جانوں کی بھینٹ دے کر وہیں کا وہیں ہے کشمیری آج 52 سال بعد بھی آزادی کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں اور بھارت کی حکمرانی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں امریکہ اور یورپ برادری صرف رسماً بھارت سے کہتی ہے کہ وہ کشمیر کا فیصلہ کرے درحقیقت وہ کبھی نہ چاہے گی کہ بھارت اور پاکستان آپس میں اچھے پڑوسی کی حیثیت سے رہیں اگر یہ دوست ہوگئے تو ان کا اسلحہ کون خریدے گا ان کا بنایا ہوا سامان کہاں کھپے گا،کیونکہ 125 کروڑ انسانوں کی منڈی صرف ہندوستان اور پاکستان کے عوام کی ہے جس میں 50 یورپی ممالک بن سکتے ہیں وہ کیسے انہیں دوست دیکھ سکتے ہیں انہوں نے انڈونیشیا میں کاروائی کر کے راتوں رات مشرقی تیمور کو ایک آزاد ملک بنوادیا اگر وہ پاکستان بھارت اور کشمیریوں سے مخلص ہیں تو کشمیر میں 52 برس سے کھیلی جانے والی خون کی ہولی پر خاموش کیوں ہیں کشمیریوں پر ظلم انہیں کیوں نظر نہیں آتا انہیں آزادی کا حق کیوں نہیں دلاتے؟افغانستان میں روس کی فوج کشی کے خلاف کیوں پاکستان کی مدد کی اور افغانستان کو آزاد کروایا؟ کیوں عراق سے کویت کو دوبارہ

آزاد کرایا؟ کیا وہ ہندوستان کی جارحیت کے خلاف خود میدان میں نہیں آسکتے تھے۔یقیناً یہ ان کے مفادات کی جنگ ہندوستانی حکمرانوں نے اگر آج کشمیر کو آزاد نہیں کیا تو کل وہ مزید قیمت ادا کر کے بھی اس پر مسلط نہیں رہ سکتے اور ایک دن ان کو کشمیر کو آزاد کرنا ہوگا بہتر یہی ہے کہ مذاکرات کے ذریعے عزت کے ساتھ کشمیر کو آزاد کر کے ہندوستانی عوام کی خوشحالی کے لئے کام کریں۔اور پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کر کے ایشیا کے دو اچھے پڑوسیوں کی طرح شیروشکر ہوجائیں۔بھارتی عوام کشمیر کی لاحاصل جنگ سے اکتا چکے ہیں آج ریفرنڈم کرالیں کشمیری وہی فیصلہ کریں گے جو 52 سال پہلے کیا تھا۔

سلی کوئسچن (بیوقوفی کا سوال)

بھارت کے ایک چیف آف اسٹاف فیلڈ مارشل مانک شاہ سے ایک صحافی نے انٹرویو کے لئے وقت مانگا کئی دن تک مانک شاہ اس صحافی کو ٹالتا رہا۔ کیونکہ وہ بہت بڑے اخبار کا رپورٹر تھا۔ اس لئے وہ صاف انکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صحافی چونکہ غیر ملک کے اخبار کا رپورٹر تھا اور وہ آیا ہی بھارت سیاستدانوں اور چند دیگر افراد جن میں مانک شاہ بھی شامل تھا۔ انٹرویو لئے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا۔ تمام سیاستدانوں اور دیگر افراد تو پہلے ہی فون میں ٹائم دیتے رہے اور وہ انٹرویو لیتا گیا مگر مانک شاہ جان بوجھ کر گریز (Avoid) کرتا رہا۔ مگر رپورٹر نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ آخر کار ایک دن مانک شاہ انکار کرتے کرتے تھک گیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ صحافی انٹرویو لئے بغیر بھارت سے نہیں جائے گا تو اس نے کہا اچھا اگر تم کو انٹرویو چاہئے تو فلاں دن فلاں وقت دہلی ایئر پورٹ پر آجانا مجھے اپنے ایک سرکاری مہمان کو الوداع (See off) کرنا ہے۔ واپسی میں تم میری ہی گاڑی میں جاؤ گے۔ جتنا وقت ایئر پورٹ سے میرے دفتر تک آنے میں لگے گا صرف اتنے ہی وقت میں تم کو اپنا انٹرویو مکمل کرنا پڑے گا۔ اس سے ایک منٹ نہ کم نہ زیادہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ رپورٹر نے بہت کہا کہ چلتی گاڑی میں انٹرویو میں یکسانیت اور تسلسل نہیں رہتا۔ لہٰذا اتنا ہی ٹائم وہ اپنے دفتر میں دے دیں۔ مگر مانک شاہ نے صاف انکار کر دیا۔ دفتر کے ٹائم کی قیمت مجھے سرکار کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا سرکار کا ٹائم میں تمہیں

ہرگز نہیں دے سکتا۔ اول تو میں فوجی ہوں۔ میں انٹرویو نہیں دیتا چونکہ تم نے اصرار کیا ہے اور میرے تمام انٹرویو نہ دینے کے دلائل بھی ختم ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اگر تمہیں انٹرویو لینا ہے تو میرے پاس صرف ائیر پورٹ سے دفتر تک کا وقت ہو سکتا ہے۔ رپورٹر نے آخری حربہ استعمال کیا اچھا گھر کا کوئی وقت چھٹی کے بعد کا ہی دے دیں۔ اس نے کہا کہ میں گھر پر گھریلو زندگی میں خلل نہیں ڈالتا۔ بولو تم کو منظور ہے یا میں فون بند کر دوں۔ رپورٹر آخر کار مان گیا اور مقررہ دن اور وقت پر ائیر پورٹ پہنچ گیا۔ مانک شاہ نے اپنے سرکاری مہمانوں کو الوداع کر کے رپورٹر کو اپنی جیپ میں جو سامنے کھڑی تھی اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اور خود ڈرائیو والی سیٹ پر بیٹھ کر جیپ اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔

رپورٹر کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے بڑے ملک کا سی این سی اور نہ ڈرائیور نہ آگے پیچھے ہوٹر۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مگر اس کو اپنی آنکھوں پر یقین کرنا پڑا۔ مانک شاہ نے رپورٹر کو کہا کہ جو پوچھنا ہے جلدی کرو۔ راستہ بھر رپورٹر طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ مانک شاہ اس کو دھیمے انداز میں جیپ چلاتے ہوئے جوابات دیتا رہا۔ رپورٹر بھی ہوشیار تھا اس نے گھما گھما کر سوالات کئے مگر مانک شاہ خندہ پیشانی سے اس کے جوابات دیتا رہا۔ مگر جب بھی رپورٹر اس کو سیاست میں مداخلت اور عوام سے دور رہنے کی وجہ پوچھتا تو مانک شاہ کا ایک ہی جواب ہوتا وہ یہ کہ ہمارا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے، ہمارا سیاست سے کیا کام یہ سیاستدانوں کا کام ہے۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا۔ رپورٹر اس سے کوئی ایسا جملہ نکلوا لے گا جس سے اس کے انٹرویو میں جان پڑ جائے۔ مگر مانک شاہ اس کو لاجواب کئے رہا۔ جب دفتر قریب آنے لگا تو مانک شاہ نے رپورٹر کو کہا اب میرے دفتر آنے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ اب صرف آخری سوال پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ رپورٹر نے پوچھا۔ آپ اتنے بڑے جرنیل ہیں آپ خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا، کوئی آپ کو جان سے نہ مار دے۔

مانک شاہ پہلے ہنسا پھر کہنے لگا یہ کیا سلی کوئسچن (Silly Question) کر دیا۔تم نے میرا سارا موڈ خراب کر دیا اور پھر بولا ہم قوم کی حفاظت کے لئے ہیں ۔جس دن ہم کو خود اپنی حفاظت کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ہم کو اپنی وردی اتار دینی چاہئے ۔کیونکہ رکھوالے کی حفاظت کے لئے دوسرا رکھوالا نہیں چاہئے ۔بھلا چوکیدار کو بھی چوکیدار کی ضرورت ہے۔اتنے میں گاڑی گیٹ پر پہنچی ۔سلوٹ کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئی۔ مانک شاہ نے جیپ کے اسٹینڈ پر جیپ ترتیب سے کھڑی کی ۔رپورٹر سے ہاتھ ملایا۔بائے بائے کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف اکیلے ہی بڑھ گیا۔رپورٹر ہکا بکا اس کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔یاد رہے مانک شاہ ایک پارسی فوجی تھا۔

یہ واقعہ آج سے 50 سال پہلے سنا تھا۔آج میں شاہراہ فیصل پر خود اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔پیچھے سے ایک پولیس موبائل مسلسل ہارن بجا کر اوورٹیک کرنا چاہتی تھی ۔میں اپنی لین میں مقررہ رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔میرے برابر والی لین خالی تھی ۔قانون کے مطابق اگر آپ کو اوورٹیک کرنا ہو تو آپ برابر کی لین خالی ہو تو اوورٹیک کر لیتے ہیں ۔جب مسلسل ہارن بجتا رہا تو میں نے اپنے آئینہ سے دیکھا۔پولیس موبائل والا کہیں میری گاڑی کو ٹکر نہ مار دے۔میں نے برابر والی خالی لین کی طرف گاڑی کر لی ۔بڑی تیزی سے موبائل نے مجھے کراس کیا۔جس میں پولیس والا گن لئے کھڑا تھا۔اس نے مجھے بری طرح گھورا۔پھر دوسری جیپ میرے پاس سے گزری۔اس میں ایک وردی میں ایس ایس پی صاحب بیٹھے تھے۔انہوں نے بھی مجھے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تمہیں نہیں معلوم ہم اس علاقہ کے ایس ایس پی ہیں۔جیپ پر بھی گورنمنٹ سندھ کی ایس ایس پی والی نمبر پلیٹ تھی ۔اس جیپ کے پیچھے بھی ایک اور پولیس موبائل تھی ۔اس میں بھی پولیس والے بھرے تھے اور ایک پولیس والا گن سنبھالے کھڑا تھا۔جب یہ قافلہ مجھے اوورٹیک کر گیا تو مجھے یکا یک وہ مانک شاہ کے الفاظ یاد آ گئے ۔اگر قوم کے محافظ کو خود اپنی حفاظت کی ضرورت پڑ جائے تو ہم کو اپنی وردی اتار دینی چاہئے ۔میں گاڑی چلاتے ہوئے

سوچ رہا تھا اب عوام کی حفاظت کون کرے گا جب پولیس والے خود اپنے پولیس والوں کی حفاظت میں لگے ہوئے ہوں اور عوام سے راستہ صاف کروا کر اپنے ہی افسر کو اس کی منزل تک پہنچا رہے ہوں اور وہ ایک باوردی افسر بڑے رعب کے ساتھ راستہ نہ دینے والے شہری کو دوسرے درجے کا شہری سمجھے جبکہ وہ اسی شہری کے ٹیکس دینے کی وجہ سے اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن بھی ہے۔اس کا جواب مجھے کون دے گا۔

س۔ش۔عزیز

ہمارے وزیر خزانہ شوکت عزیز صاحب گزشتہ کئی ماہ سے مختلف پلیٹ فارمز سے خوشخبری سناتے رہے کہ اس مرتبہ بجٹ بہت مراعات دے گا اور کوئی نیا اضافی ٹیکس نہیں لگے گا۔ تاجروں اور صنعتکاروں نے ان کے وعدوں پر بڑی امیدیں وابستہ کرلیں اور وہ خوش بخت بجٹ کا انتظار کرنے لگے۔ اللہ اللہ کر کے 18 جون کو بجٹ پیش کر دیا گیا۔ جوں جوں ہمارے وزیر خزانہ شوکت عزیز صاحب کی تقریر آگے بڑھتی جاتی، تاجروں، عوام اور صنعتکاروں کی مایوسی بھی بڑھتی جاتی۔ سب سے بڑا دھچکا تو بجٹ آنے سے ایک ہفتے پہلے ہی پیٹرول، ڈیزل اور مٹی کا تیل اوسطاً 10 فیصد مہنگا کر دیا گیا۔ گویا اب ہم امریکہ اور یورپ والے داموں میں پاکستان میں پیٹرول خریدیں گے۔ گویا ہم نے یورپ اور امریکہ کے برابر ترقی کر لی اور وہی ماضی کے وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب کی طرح موجودہ وزیر خزانہ شوکت عزیز صاحب نے بھی اس بجٹ کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ اس سے عام آدمی پر اثر نہیں پڑے گا۔ جبکہ پیٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل، بجلی اور گیس کے نرخوں میں اضافہ ہونے کے باوجود یہ کیسے ممکن ہو کہ عام آدمی اس سے متاثر نہیں ہوگا۔ گویا یہ تمام اشیاء عام آدمی استعمال نہیں کرتے۔ غالباً جن اور فرشتے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ تمام کھانے پینے مثلاً آلو، پیاز، ٹماٹر تک کی درآمد پر 5 فیصد ڈیوٹی لگا دی گئی۔ ان کا یہ دعویٰ بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم نے گیس اور بجلی کے بڑے صارفین کے لئے اضافی قیمتیں

مقرر کی ہیں۔ جناب جب بڑے صارفین یعنی بڑی بڑی صنعتوں کو بجلی کے اضافی نرخ ادا کرنے پڑیں گے تو وہ اس فیکٹری میں بننے والی ہر شے پر بوجھ ڈال دیں گے۔ تو خود بخود وہ اشیاء مہنگی ہو جائیں گی۔ کوئی بھی صنعت کار مہنگی بجلی خرید کر سستی چیزیں نہیں بنا سکتا وہ تو عام آدمی پر ڈال دے گا تو کیسے عام آدمی متاثر نہیں ہوگا۔

یہ بات اور بھی انوکھی لگتی ہے کہ ہمارے وزیر خزانہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ احتساب، ٹیکس، سروے رجسٹریشن وغیرہ وغیرہ کے اقدامات سے ہماری معیشت کو بڑا دھچکا لگا ہے اور بیرون ملک سرمایہ منتقل ہو رہا ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاری میں رکاوٹ پڑی ہے اگر ایسا ہے تو پھر ہم عملی طور پر اعتراف کرنے کے بعد ان اقدامات کو واپس کیوں نہیں لیا جاتا۔ آخر اس میں کیا رکاوٹیں ہیں جو وہ دور نہیں کر سکتے اسی طرح سیلز ٹیکس جو غیر ڈاکومینٹری تھا۔ ڈیڑھ فیصد سے بڑھ کر تین فیصد کر دیا گیا اور درآمدی اشیاء پر 15 فیصد سے بڑھا کر 20 فیصد کر دیا گیا ہے کہ یہ اضافہ کیا عام آدمی پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ تمام درآمد کنندگان یہ بوجھ بھی عوام پر ہی ڈال دیں گے۔ بجٹ میں معطل سینیٹ اور اسمبلیوں کے لئے ایک ارب اور 24 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جبکہ ہمارے موجودہ صدر پرویز مشرف صاحب نے فرمایا کہ الیکشن شیڈول کے مطابق اکتوبر 2002ء تک ہو جائے گا تو یہ ایک ارب 24 کروڑ کے اخراجات کا بوجھ کیوں عوام پر قبل از وقت ڈال دیا گیا ہے۔ تقریباً تمام اشیاء کی درآمدات بشمول مشینری پلانٹ ان کے پرزوں پر 20 فیصد اور 25 فیصد سے 30 فیصد کر دیا گیا ہے۔

سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 50 فیصد تک کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو حقیقی طور پر 18 فیصد تک بنتا ہے، ایک طرف ہم گولڈن ہینڈ شیک، ڈاؤن سائزنگ، برطرفی جبری رخصت کر رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر کے ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اضافہ کرنے کے بجائے اگر 18 فیصد ڈاؤن سائزنگ کے لئے مختص کر کے 18 فیصد بے روزگاری روکی جا سکتی تھی۔ یہ اقدام کر لیا

جاتا تو دوہرے نتائج ہو سکتے تھے۔کم از کم 18 فیصد ملازمین اسی تنخواہوں پر رکھے جاسکتے تھے اور اس دوران نجکاری کی طرف تیزی سے عمل کر کے بڑے بڑے ادارے جو مسلسل نقصان دے رہے ہیں نجکاری کے ذریعے فروخت کر کے آنے والے سالوں میں ہم مزید خسارہ روک سکتے تھے کیوں نہ اس عمل میں غیر معمولی تیزی کر کے ہم ان دیمکوں والے اداروں سے نجات حاصل کر لیتے اور ہمارے صنعتکاران اداروں کو جلدی دوبارہ منافع بخش بنا کر مزید بے روزگاری کو روک سکتے ہیں۔اس میں بھی فوری پیش رفت کی ضرورت ہے۔

ایک طرف ہم اپنے آپ کو غریب ملک کہتے ہیں تو دوسری طرف ہم نے چیف ایگزیکٹو کے سالانہ اخراجات کے لئے ساڑھے چار کروڑ روپے رکھے ہیں۔صدر، وزراء، مشیران کے لئے بھی کروڑوں روپے کا بجٹ رکھا ہے، کیا ہم سادگی کی زندگی نہیں گزار سکتے جب تک ہمارے قرضے کم ہو جائیں ہم مزید قرض لینے سے کیوں گریز نہیں کرتے۔

بجٹ میں بے شک کچھ مثبت اقدامات کا اعلان کیا گیا ہے جس میں خصوصی طور پر بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں سے بھیجی جانے والی رقوم کو شیڈول بینک کے ذریعے بھیجنے پر مراعات دی گئی ہیں۔ میرے خیال میں اگر ہم ہنڈی کے کاروبار کو روکنا چاہتے ہیں تو بھیجنے والے پاکستانی کو مارکیٹ ریٹ پر ڈالر اور دوسری کرنسیوں کو آفیشل طریقہ سے کیش کرانے کا طریقہ کار وضع کیا جانا چاہئے۔ہنڈی کے ذریعے ڈالر مارکیٹ کی قیمت پر فروخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر 3 اور 4 روپے کا فرق ہمیشہ رہتا ہے لہٰذا وہ نقصان دینے کے بجائے شیڈول بینک کو اجازت دی جائے۔وہ ہر بھیجنے والے کی رقم مارکیٹ پرائس پر ادا کرے۔اس طرح 100 فیصد ہنڈی اور غیر قانونی کاروبار ختم ہو جائے گا۔اور بھیجنے والا پاکستانی بھی سکون سے اپنی رقم بھیج سکے گا۔اور جب تک 3 اور 4 روپے کا فرق رہے گا۔عام آدمی ہنڈی کو ترجیح دے گا۔

بجٹ میں پہلی مرتبہ پنجاب کی کوآپریٹیو بینک اور فنانس کمپنیوں میں ڈوبی ہوئی رقم کے متاثرین کے لئے نیب کو اجازت دی ہے کہ وہ ان دھوکہ باز اداروں سے یہ رقم وصول کر کے عوام کو لوٹائے۔یہ بہت اچھا قدم ہے اور اس سے حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔مگر یہ عمل صرف پنجاب تک ہی کیوں محدود رکھا گیا ہے۔سندھ کے عوام سے ہونے والے ظلم کے بھی ازالے کے لئے اقدامات ضروری ہیں۔ یہاں بھی بہت سے فنانس کمپنیوں کے مالکان 5 ارب روپے کراچی اور اندرون سندھ کے غریب معصوم عوام بشمول بیوگان، بوڑھے پینشنرز سے کھا کر آرام سے بیٹھے ہیں۔ان سے بھی یہ رقم وصول کر کے ان متاثرین کو دلوائی جائے۔آخر اس صوبے کا کیا قصور ہے۔اس کو نظر انداز کر کے پھر احساس محرومی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ سندھ میں بھی نیب کو اختیار دیں کہ وہ اپنی کاروائی کر کے ان اداروں کے مالکان کو گرفتار کرے اور ان سے یہ رقم وصول کر کے ان کی دعائیں لیں۔اور یکساں اصول وسلوک برقرار رکھیں۔

بجلی کے بحران کو دور کرنے کے لئے علاوہ واپڈا کی نجکاری کے کم از کم ملک میں جنریٹر کی درآمد پر تمام ڈیوٹیاں ختم کرائی جائیں جبکہ ان کی درآمدات کے لئے خصوصی قرضے فراہم کریں تا کہ لوڈشیڈنگ سے نجات ملے اور ان کی بلاوجہ ضرورت NOC اور دوسری سرکاری رکاوٹیں دور کی جائیں۔ان پر صوبائی ٹیکس بھی معاف کر دیا جانا چاہئے۔خاص طور پر گیس سے چلنے والے جنریٹر کی درآمدات پر توجہ دینی چاہئے۔ان اقدامات سے ہمارے اخراجات میں زبردست کمی ہوگی اور اشیاء کے نرخ کم ہو سکیں گے۔ہمارے وزیر خزانہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ان کی توجہ عوام کے مسائل کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوگی اور روایتی بجٹ پیش کرنے کے بعد ہم ان اقدامات سے کچھ آنسو پونچھ سکیں گے۔

ہندوستان کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے

میرے حالیہ امریکہ میں قیام کے دوران بہت سے پاکستانی دوستوں سے ملاقات رہی۔ ہر کوئی پاکستان کی موجودہ صورتحال کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا اور سب کا موضوع اس دفعہ ہندوستان اور پاکستان مذاکرات کے بارے میں کافی حوصلہ افزاء تھا اور وہ یہ دعوت نامہ چونکہ بھارتی وزیراعظم واجپائی صاحب کی طرف سے پرویز مشرف صاحب کو ملا تھا جس سے کم از کم یہ تاثر ضرور پایا جاتا تھا کہ اب ہندوستانی حکومت مسئلہ کشمیر کو حل کرنا چاہتی ہے۔ اسی لئے اس نے مذاکرات کی دعوت دی ہے اور اس میں سنجیدہ بھی نظر آتا ہے۔

ایک کاروباری میٹنگ ختم ہونے پر ایک امریکی فوم کے صدر نے مجھے رات کھانے پر مدعو کیا۔ اس کے ساتھ اس کمپنی کے کئی اور ڈائریکٹرز بھی اس کھانے میں شامل تھے۔ گفتگو کے دوران اس فرم کے صدر نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے مجھ سے ایک سوال کیا ہم پاکستانی اور ہندوستانی اچھے پڑوسی کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں اور غربت، جہالت کے باوجود ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں اور کشمیر کا مسئلہ حل کیوں نہیں کر لیتے۔ ان تین سوالوں کا جواب میں نے کچھ اس طرح دیا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہیں یہ آپ اپنی حکومت سے پوچھیں جو ہم کو ایک نہیں ہونے دینا چاہتی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی معیشت پر قبضہ کرے۔ اپنا

اسلحہ بیچنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ہندوستان کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ اس کی مالی اور اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ ہر دفعہ مسئلہ کشمیر پر ویٹو کروا دیتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلہ پر ہندوستان کا ساتھ دیتے ہیں۔ مظلوموں کا اگر وہ ساتھ دے سکیں تو بھلا ہندوستان کی کیا مجال ہے کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی قرار دادیں منظور ہونے کے باوجود آج 50 سال سے ان پر عمل درآمد نہیں کرا سکا۔ جبکہ انڈونیشیا میں صرف ایک ماہ کے اندر ہی انہوں نے جزیرہ کو آزاد کروا دیا کیا وہ کشمیری عوام کا ساتھ دے کر ان کو ہندوستان سے آزاد نہیں کروا سکتا۔ پھر میں نے تقسیم کے وقت ہونے والے معاہدہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی، تمام ڈائریکٹرز بہت حیرت سے تاریخی واقعات خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے۔ امریکی عوام ان تمام باتوں جو میں نے انہیں بتائیں ہیں وہ ان سے ناواقف ہیں اور پاکستان کا سفارتخانہ کیوں نہ ہمارے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کر کے کشمیر کے موقف پر سیمینار اور دیگر ذرائع ابلاغ سے تشہیر کر کے ہمدردیاں حاصل کرے۔ ورنہ ہم پاکستان کو ان معاملہ میں جھگڑالو سمجھتے تھے۔ جبکہ ہندوستان ہمیشہ اپنے ذرائع ابلاغ سے امریکی عوام کی ہمدردیاں سمیٹتا رہا ہے۔ پاکستان واپس آ کر میں اپنا کالم لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ امریکا سے میرے اسی امریکی دوست کا فون تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے امریکی ٹی وی سے پاکستان کے صدر پرویز مشرف صاحب کا اخبار نویسوں سے ریکارڈ کیا ہوا انٹرویو سنا یہ اس بہت بڑے امریکی فرم جو انٹرنیٹ کے کاروبار سے منسلک ہے فرد کے الفاظ ہیں کہ ہم کو صحیح معنوں میں آج مسئلہ کشمیر کے بارے میں آگاہی ہوئی ہے اور جس نے بھی یہ انٹرویو دیکھا ہوگا وہ پاکستان کی حمایت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے کہا جس احسن طریقے سے ہمارے صدر نے اخبار نویسوں کے سوالات کے جوابات دیئے ایسا لگتا تھا کوئی مفکر کسی الجھے ہوئے مسئلے کو بردباری اور خوش اخلاقی سے ایک جنرل ہوتے ہوئے اصولی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔ جس میں ہٹ دھرمی یا جھنجلاہٹ فوجی دبدبہ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کے صدر نے اپنے کیس کو اپنی اعلیٰ ذہانت سے اب ہندوستان کے کورٹ میں ڈال دیا ہے۔ اب ہندوستان کو اس مسئلہ کا حل ہر صورت میں پیش کرنا ہوگا اور دنیا کے جن جن ممالک میں یہ انٹرویو دکھایا جائے گا یقیناً وہاں کے عوام کی ہمدردیاں پاکستان کے حق میں تبدیل

ہو جائیں گی۔آپ کی وزارت اطلاعات اور سفارتخانوں کو چاہئے کہ بڑے پیمانے پر ہر ملک میں اس انٹرویو کی تشہیر کا بندوبست کر کے رائے عامہ بیدار کریں۔تا کہ وہ اصل مسئلہ کی طرف توجہ دے کر اس مسئلہ کشمیر کو جلد از جلد حل کروانے میں پاکستان کی اخلاقی مدد کریں۔

بھارت میں یہ انٹرویو میں نے بھی دیکھا تھا۔واقعی ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح دھیمے لہجے میں ایک فوجی اپنے موقف کو اخبارات کی دنیا میں بیٹھ کر منوا کر اٹھے۔یہ بڑی بات تھی۔مگر وزیر اعظم واجپائی اور ان کی کابینہ نے اعلان آگرہ جاری نہ کر کے پاکستان ہی کو نہیں پوری دنیا کو مایوس کیا ہے۔وہ الگ بات ہے کہ خود بھارتی حکومت صرف۔بی جے پی کی اکیلی تو نہیں ہے۔وہ بھی مخلوط حکومت ہے جس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔جن میں انتہا پسندوں کا گروپ بھی اور خود بی جے پی ایک زمانے میں خود انتہا پسند تھی۔بابری مسجد کا واقعہ کس طرح بھلایا جا سکتا ہے،خود ہندوستانی وزیر اعظم نے دعوت دی۔ پاکستان نے خندہ پیشانی سے اس دعوت کو قبول کیا۔یہ بات بھی قابل مبارکباد ہے کہ ہر لحہ ماحول کی فضا مثبت ہی رہی۔ہندوستان کے وزیر خارجہ نے اعتراف کیا کہ بات چیت ناکام نہیں ہوئی ہے۔اس سے ہندوستان سکی سے بچ گیا۔پھر پاکستان کی طرف سے دعوت نامہ قبول کرنا مایوسی کے عالم میں روشنی کی جھلک دکھا رہا ہے کہ ہندوستان آہستہ آہستہ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔کیونکہ ایک دم مسئلہ کشمیر حل کرنے سے اس کے دیگر صوبوں کے مسائل خاص طور پر خالصتان،ناگالینڈ،تامل ناڈو کی آزادی کا سوال اٹھ سکتا ہے مسئلہ صرف کشمیر تک محدود نہیں رہے گا۔اگر وزیر اعظم واجپائی جلد ہی پاکستان کا دورہ کریں اور ہماری وزارت خارجہ کا دورہ بھی ہوتا رہے تو مسئلہ کشمیر جلد حل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ہم کو دیگر مسائل پر بھی توجہ دینی چاہئے کیونکہ ہندوستانی وزیر اعظم بہت کچھ پاکستان سے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں۔کم از کم وہ تیکھا رویہ تو ختم ہوا۔ہم تجارت شروع کر کے کم از کم کشیدگی ختم کر سکتے ہیں۔اس سمٹ (Summit) سے پاکستان کو اخلاقی فتح ہو چکی ہے کہ تین دن کی زبردست تشہیر سے مسئلہ کشمیر چاہے اس کو کوئی نام دیں بہت آگے آ چکا ہے۔دنیا کا کوئی ٹیلی ویژن،ریڈیو،اخبار ایسا نہیں ہوگا جس میں اس آگرہ کانفرنس کا ذکر نہ ہوا ہو۔جو کام ہم 53 سال میں نہیں کر سکے۔صدر

پرویز مشرف نے صرف 3 دن میں دنیا کے آگے کر دیا ہے۔ہندوستان اب نہ چاہتے ہوئے بھی اس مسئلہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔البتہ دیر کر سکتا ہے۔اندھیرا اب ممکن نہیں رہا۔ہندوستان کو ایک ڈیگال جیسے لیڈر کی تلاش ہے خود وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی صاحب بھی ڈیگال جیسی سوچ رکھتے ہیں۔صرف عمل کی ضرورت ہے۔اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو وہ تاریخ میں امر ہو جائیں گے۔جس سے دونوں ملکوں کو نہیں پورے ایشیا کو فائدہ پہنچے گا۔کاش ایسا ہو جائے تو بی جے پی کا بابری مسجد والا کفارہ ادا ہو جائے گا۔کشمیریوں کو سکھ اور چین نصیب ہو جائے گا۔آخر میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی دوستی کی مثال بھی دے دوں۔جو میں نے شکاگو امریکہ میں دیکھی،ایک سڑک کا نام ڈاؤن اسٹریٹ ہے۔جس کو ہندوستانی اور پاکستانی دیوان اسٹریٹ بھی کہتے ہیں۔اس اسٹریٹ کا آدھا حصہ گاندھی ایونیو کہلاتا ہے اور آدھا حصہ جناح ایونیو کہلاتا ہے۔اس اسٹریٹ پر کھانوں کے ریسٹورنٹ ہیں۔ ہمارے پاکستانی بھائیوں نے اپنے ریسٹورنٹ کے نام پاکستان ریسٹورنٹ کے ناموں پر رکھے ہوئے ہیں۔وہاں صابر کی نہاری،اسٹوڈنٹ کی بریانی،پھجے کے پائے،بندو خان کا کباب پراٹھے،طباق، گھسیٹے خان کا حلیم وغیرہ وغیرہ رکھ کر کراچی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ویک اینڈ پر اس اسٹریٹ پر چلنے کی جگہ نہیں ہوتی۔تمام ہندوستانی اور پاکستانیوں کی دکانیں ہیں۔پاکستان اور ہندوستان میں بننے والی ہر اشیا مل جاتی ہے۔یہ دونوں تہوار میں سجائی جاتی ہے۔آپ کو یہ فرق نہیں لگے گا کہ اس میں کون پاکستانی ہے اور کون ہندوستانی ہے۔آج تک کوئی جھگڑا فساد نہیں ہوتا۔دونوں اپنے اپنے ملک کے یوم آزادی بڑی شان سے مناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جلسے جلوسوں کا رنیوال،عید، ہولی سب تہواروں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں اور یہ امریکن یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اپنے اپنے ملک میں یہ ایک دوسرے کے کٹر دشمن اور ہمارے ملک میں سجنوں کی طرح رہتے ہیں۔ایسا کیوں ہے کوئی ہمارے سیاستدانوں سے پوچھے۔

مصر کے انقلاب کے بعد؟

تین سال قبل ہمارے ایک مصری دوست نے مصر آنے کی دعوت دی۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں آنے جانے کا واسطہ رہا تھا۔ البتہ مصر سے ہمارے کاروباری مراسم نہ ہونے کی وجہ سے مصر دیکھنے سے محروم تھا سوچا ایسا موقعہ شاید پھر نہ ملے لہذا حامی بھر لی۔ اُن دنوں صدر حسنی مبارک کا 27واں اقتداری سال چل رہا تھا۔ ہر طرف اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اگر چہ ضعیفی اُن پر عیاں تھی۔ پھر بھی وہ چاک و چوبند رہتے تھے زیادہ وقت اُن کا مصر کے خوبصورت ترین جدید شہر شرم الشیخ کے صدارتی محل میں گزارتے تھے۔ جہاں ہر طرف سکون ہی سکون ہوتا ہے اس شہر کی سب بڑی خصوصیت ہر طرف ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کا سلسلہ بھی دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسرائیل مصر جنگ میں اس شہر پر اسرائیل نے قبضہ کرلیا تھا۔ پھر جب بعد میں جنگ بندی ہوئی اور معاہدہ امن سابق صدر مرحوم انور سادات نے اسرائیل سے کیا تو معاہدہ کے رو سے اسرائیل نے یہ شہر خالی کردیا۔ یہ اسرائیل کی سرحد کے بہت نزدیک ہے اور خوبصورتی میں لاجواب ہے۔ اسرائیل نے جاتے جاتے تمام عمارتیں، جدید رہائشی مکانات حتی کہ ائرپورٹ سب تباہ کر کے خالی کردیا تھا پھر بعد میں اس شہر کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا اور بیروت کے بعد سیاحوں کی عیاشی کا جدید اڈہ بنا کر دنیا بھر سے سیاحوں کو دعوت دی کہ ساحل سمندر اور پہاڑوں کے خوبصورتی کا نظارہ کریں چونکہ شہر جدید طرز پر بنایا گیا تھا مصر کی معیشت دو جنگوں سے بہت

کمزور ہو چکی تھی۔ لاکھوں یورپی اور خلیجی سیاحوں سے بھر گیا اس کی وجہ بیروت کی جنگی تباہ کاریوں کی وجہ سے شرم الشیخ اس کا نعم البدل بن کر اُبھرا۔ بے شمار فائیو اسٹار ہوٹلوں کی بھرمار نائٹ کلبوں اور کیسنو کی وجہ سے یورپ سے چارٹر جہاز بھر بھر کر آتے تھے۔ ان نائٹ کلبوں ہوٹلوں اور کیسینو میں صرف نوجوان لڑکے لڑکیاں سیاحوں کو لبھانے کے لئے خصوصی طور پر ملازم رکھے جاتے تھے۔ بوڑھے ملازمین کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ الغرض میرے میزبان دوست نے قاہرہ گھمایا۔ آبادی اور ٹریفک کے لحاظ سے بہت گنجان شہر تھا۔

دریائے نیل اور اُس کی خوبصورتی کا نظارہ سورج غروب ہوتے ہی روشنیوں سے بھرپور پُرفریب انداز سے لگایا جاسکتا تھا۔ راقم کا ہوٹل دریائے نیل پر واقع تھا اس لئے اس نظارے کو تین دن قیام کے دوران دیکھنے کا موقع ملا جس میں بڑے بڑے پانی کے جہاز دن رات گزرتے تھے۔ ان جہازوں پر سیاحوں کے لئے نائٹ کلب اور کیسینو کا انتظام خصوصی طور پر رکھا جاتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا الگ انتظام ہوتا تھا۔ اور رات کے کھانے کا تو کہنا ہی کیا رقص و سرور کی محفلیں نائٹ کلب میں خوبصورت بیلی ڈانسز رات گئے تک جاری رہتے تھے اور عیاشیوں کی آخری حدود کو چھو لینے کی حد تک سیاحوں کو آزادی تھی جو صدر حسنی مبارک کے اقتدار کی لبرل پالیسی کا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔ مصر کی معیشت کی دوسری کڑی قاہرہ کا عجائب گھر تھا جس میں ہر سال پوری دنیا سے لاکھوں سیاح اس عجائب گھر کو دیکھنے کیلئے خصوصی طور پر آتے تھے۔ دن رات سیاحوں کو بھر بھر کر بسوں کے ذریعے لایا جاتا تھا۔ سیاحوں سے تقریباً 25 امریکی ڈالر کا ٹکٹ لیا جاتا تھا۔ اور اگر آپ نے فرعون کی ممی (مردہ لاشیں) دیکھنی ہوں تو 10 ڈالر کا اضافی ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ عجائب گھر میں مجھے تو ایسی کوئی خاص بات نہیں لگی۔ بہت پرانی آثار قدیمہ کے برتن، سکے، دروازے، کتابیں، کپڑے اور قالین وغیرہ تھے مگر سیاح بڑے شوق سے ان کو دیکھنے آتے ہیں جس سے اربوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ خصوصاً سیاح جاتے ہوئے زرق برق

لباس جو مصری طرز زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور چادریں مختلف ہاتھوں سے بنی ہوئی اشیاء ضرور خرید کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ۔ قاہرہ شہر میں ایک طرف جدید عمارتیں، ہوٹل، سرکاری اور نیم سرکاری عمارتیں اور خوبصورت جدید رہائش گاہیں ہیں تو اس شہر میں غربت سے بھری پرانی طرز زندگی کی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں، رہائش گاہیں بھی بے پناہ ہیں جن سے غربت بھی بہت صاف نظر آتی ہے۔ اکثر رہائشی بلڈنگوں پر نہ باہر پلستر تھا نہ ان پر رنگ ہوتا تھا۔ صرف اینٹوں کی دیواریں صاف نظر آتی تھیں۔ گویا بلڈنگ اور مکان بنانے والے کا سرمایہ ختم ہو چکا ہو اور اب وہ فنشنگ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ ایسی عمارتوں کا سلسلہ بہت دور دور تک صاف نظر آتا ہے جس سے بدصورتی کی جھلک اور غربت سے بھرپور عوامی زندگی پیش ہوتی ہے۔ مصر کی تیسری اہم فرعونِ مصر کی بنائی ہوئی دنیا کے عجوبوں میں شامل PYRAMID ہیں جن کو دیکھنے کیلئے بھی لاکھوں سیاح دور دور سے آتے ہیں۔ اگرچہ ان پتھروں کے پہاڑوں کا مصری حکومت نے اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کا بندوبست نہیں کیا جس سے اب بڑے بڑے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے ہیں۔ یہ اس زمانے میں جب کرینیں اور بجلی نہیں تھی کیسے اوپر چڑھا کر تکونی شکل میں رکھے ہونگے۔ سائنس دان آج تک اس کا معمہ حل نہیں کر سکے۔ قاہرہ کے مضافاتی علاقے میں یہ PYRAMID واقع ہیں۔ راستے بھر ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور غربت سے ستائے عوام کے سرکاری گھروں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ مکانات اور عمارتیں بھی شکستہ ہو چکی ہیں الغرض اکثریت غریب عوام دیکھنے میں آتی ہے اور غیر ملکی ڈونر ممالک کے اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ 55 فیصد عوام غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی وجہ سے قاہرہ میں بے شمار گداگر ہر جگہ عوام سے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ یہی حال ایک اور شہر سکندریہ کا ہے یہاں تو قاہرہ سے بھی زیادہ غربت دیکھنے میں آئی۔ بہت پرانا شہر تاریخی شہرت کا حامل ہے یہاں بھی سیاحوں کیلئے کافی پرانی عمارتیں اور قلوپطرہ کی لائبریری ہے جس کو دیکھنے کیلئے بھی

سیاح آتے ہیں مصری عوام بھی پاکستانی عوام کی طرح بہت محنتی اور جفاکش ہیں۔ صدر حسنی مبارک کے 30 سالہ دور میں بھی ان پر کرپشن اور بڑے بڑے کاروباران کے خاندان والوں کے نام منسوب ہیں۔ اب آخری دور میں وہ اپنے صاحبزادے جمال حسنی مبارک کو اقتدار میں لانے کی بھرپور تیاریاں کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اقتدار میں کبھی حزب اختلاف کو نہیں پنپنے دیا، خصوصی طور پر اسلامی خیالات کی اخوان المسلمین کو بری طرح ظلم و تشدد سے دبا کر رکھا اب جب عوام اُن کے خلاف کھڑی ہوئی تو سب سے پہلے انہوں اپنے صاحبزادے کو لندن فرار کروایا اب آخری حربے کے طور پر پولیس اور سرکاری لوگوں کو عام کپڑوں میں مظاہرین کے سامنے اسلحے سے بھرپور مزاحمت کروائی جو ناکام ہوئی۔ اب یہ آخری جمعہ ہے جو ان کے اقتدار کا فیصلہ کردے گا مگر اب بات صرف تیونس اور مصر کی نہیں رہی یہ آگ اور بغاوت یمن، مراکش، اُردن، الجزائر اور شام تک تو پھیل چکی ہے اسکے لپیٹ میں وہ تمام مسلم ریاستیں اور ممالک آئینگے جو سالہا سال سے اپنی عوام کی بھلائی کے بجائے اپنی اپنی جیبیں بھرتے رہے ہیں اور عوام غربت کی چکی میں پستے رہے۔ اب عوام کا سیلاب ان کی طرف بڑھ چکا ہے صرف دن گننے باقی ہیں ہر جمعہ ایک نئے ملک کی نشاندہی کر رہا ہے، عوام جمعۃ المبارک کی اجتماعی نماز پڑھنے کے بعد بیس تیس برس سے ظلم سہتے ہوئے اب مزید برداشت کے قابل نہیں رہے تو اب انقلاب ہی آخری راستہ رہ گیا تھا جس کی طرف عوام چل نکلے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ قافلہ کہاں جا کر رکتا ہے اللہ خیر کرے غلامی کی زنجیریں اب ٹوٹ رہی ہیں۔ کاش صاحب اقتدار اس سے سبق حاصل کریں۔

بنگلہ دیش میں صرف تین دن کا قیام

کئی ماہ سے ایک امریکن کمپنی کے انجینئر کو پاکستان بلوانا چاہتا تھا تا کہ امریکن کمپنی کی مشین خریدی جا سکے مگر نہ تو وہ امریکن کمپنی اپنا نمائندہ بھیجنے کے لئے تیار تھی اور نہ کسی ایکسپرٹ کو وجہ یہ بتاتی تھی کہ پاکستان ریڈ زون میں شامل ہے۔امریکن حکومت اس کی اجازت نہیں دیتی۔اُس کے شہری پاکستان میں غیر محفوظ ہیں۔اسی دوران ہفتہ کی شام اُس کے پاکستان ایجنٹ نے فون پر بتایا کہ اُس امریکن کمپنی کا نمائندہ 2 دن کے لئے بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکہ جا رہا ہے وہ پیر سے بدھ تک وہاں قیام کرے گا۔اگر پاکستان سے آ کر کوئی ملنا چاہے تو وہ ڈھاکہ میں اُس سے مل سکتا ہے۔میں نے پوچھا آج ہفتہ ہے اتوار کو پاکستان میں بنگلہ دیش کی ایمبیسی بند ہے اور عام طور پر کئی دن بعد ویزہ ملتا ہے کیسے ممکن ہے کہ میں ڈھاکہ جا سکوں۔اُس کے ایجنٹ نے بتایا کہ پاکستانی صنعتکاروں کے لئے بنگلہ دیش حکومت کے ادارے BOI بورڈ آف انوسٹمنٹ چند گھنٹوں میں ڈھاکہ ائرپورٹ پر پہنچنے پر ویزہ دے سکتی ہے۔اگر ہم اپنا پاسپورٹ ڈھاکہ آفس فیکس کر دیں۔چنانچہ میں نے اپنے پاسپورٹ کے ابتدائی صفحات فیکس کر دئے ۔بنگلہ دیش میں صرف جمعہ کی چھٹی ہوتی ہے ہم نے اتوار کو اپنا آفس کھلوا کر یہ کام انجام دیا ۔اتوار کی رات اُن کی منظوری آ گئی۔پیر کو پی آئی اے کا ٹکٹ جاری کروا کر منگل کی صبح 9 بجے کی فلائٹ بُک کروائی۔اتفاق سے اتوار، پیر، منگل کراچی میں زبردست بارش سے سڑکیں بند تھی مگر پھر بھی صبح

ائیر پورٹ پہنچ گیا۔پی آئی اے کے کاؤنٹر سے چیک ان ہو کر جب FIA کے کاؤنٹر پر پہنچا تو FIA والوں نے ویزہ طلب کیا تو میں نے آنے والے ویزے کی فیکس کاپی دکھائی تو انہوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کل ویزہ ملا ہے یعنی ایک دن کے بعد یہاں بیٹھے بٹھائے ویزہ مل جائے۔اُس کی اصلی کاپی دکھائی جائے میں نے کہا یہ ناممکن ہے ایک دن میں اصلی کاپی ملے۔مگر ڈھاکہ ایئر پورٹ پر وہ اصلی کاپی مل جائے گی۔اس نے کہا اچھا آپ پی آئی اے سے اس ویزے پر اسٹیمپ کروائیں کہ اس ویزا پر بورڈنگ ہو سکتی ہے۔میں نے کہا کہ اگر پی آئی اے کو اعتراض ہوتا تو وہ بورڈنگ کارڈ جاری نہیں کرتے مگر وہ آفیسر نہیں مانا۔میں نے پی آئی اے آفیسر سے رجوع کیا ان کے لیے بھی یہ انہونی بات تھی بغیر اصل ویزہ کاپی وہ مجھے بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔انہوں نے بھی مجھے روکنے کیلئے ایف آئی اے سے حامی بھر لی اور میرا بورڈنگ کارڈ واپس لے لیا۔اتفاق سے ایک پی آئی اے کے آفیسر جن سے راقم کی جان پہچان تھی وہ بھی اس شفٹ کے انچارج تھے۔ان کو حقیقت بتائی اور کہا کہ اگر چاہیں تو ڈھاکہ ائیر پورٹ پر امیگریشن والوں سے تصدیق کر سکتے ہیں۔انہوں نے ڈھاکہ امیگریشن والوں کو کنٹیکٹ کیا، کوئی نہیں ملا کیونکہ بہت صبح تھی۔کافی کوششوں کے بعد انہوں نے راقم سے لکھوایا کہ اگر ڈھاکہ امیگریشن والوں نے ائیر پورٹ سے واپس یعنی ڈی پورٹ کیا تو پی آئی اے ذمہ دار نہیں ہوگی اور میں اپنے ہی ٹکٹ پر واپس آؤں گا جو کہ میرے پاس تھا۔اللہ اللہ کر کے ڈیپارچر لاؤنج پہنچا۔جہاز بارش کی اور اسٹاف کی کمی کی وجہ سے تاخیر کا شکار تھا 2 گھنٹے کے بعد جہاز کے اندر پہنچے تو بزنس کلاس کی سیٹ پر بیٹھے تو 10 منٹ بعد ہی جہاز کی چھت سے پانی قطروں کی شکل میں ٹپکنا شروع ہو گیا۔پی آئی اے کے عملے کو بلا کر دکھایا۔انہوں نے سیٹ چینج کر دی مگر چند ہی منٹ بعد دوسری سیٹ پر بھی پانی ٹپکنا شروع ہوا اور باقاعدہ دھار کی صورت میں ٹپکتا رہا۔دیگر مسافر بھی پریشان ہو گئے مگر پی آئی اے کے عملے نے جب کپتان سے رابطہ کیا تو اس نے کہا کوئی بات نہیں جب جہاز اُڑنے لگے گا

تو پانی بند ہو جائے گا۔ یہ جہاز 747 جمبو جیٹ تھا۔ یاد رہے ان جہازوں پر یورپ میں پابندی کئی سال پہلے ہی سے لگی ہوئی ہے مگر پی آئی اے تب سے دیگر روٹس پر چلا رہا ہے۔ خیر جانا ضروری تھا اور کپتان مطمئن تھا نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئے ۔ جہاز ہوا میں بلند ہوا اور واقعی پانی ٹپکنا بند ہو گیا مگر آدھے راستے میں میری سیٹ سے آگے بیٹھے مسافر جو سیٹ پر لیٹے ہوئے تھے ان کی سیٹ ٹوٹ گئی اور وہ جہاز کے عرشے پر آ گرے۔ عملے نے ان کو اُٹھایا اور بڑی معذرت بھی کی۔ ہم سب مسافر خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے ۔ جب تک ڈھاکہ ائیر پورٹ پر جہاز نہیں اُتر گیا ہم سہمے بیٹھے رہے کہ ہمارا سول ایوی ایشن کا عملہ کیسے ان ناکارہ جہازوں کو پرواز کی اجازت دیتا ہے۔ ڈھاکہ ائیر پورٹ پر اس بورڈ آف انویسٹ منٹ کا الگ کاؤنٹر تھا۔ وہاں پہنچے تو ان کے نمائندوں نے تمام ویزے کی کاروائی پوری کی اور صرف 3 ڈالر فیس وصول کر کے امیگریشن کاؤنٹر سے چند منٹ میں فارغ کر دیا۔ یاد رہے آج کل تمام دنیا بھر میں انوسٹمنٹ اور غیر ملکی صنعت کاروں کو راغب کرنے کیلئے BOI کا ادارہ بہت فعال کردار ادا کر رہا ہے جو پاکستان میں بھی گذشتہ 25 تیس سال سے قائم ہے مگر اس کی کارکردگی کا آج تک کچھ معلوم نہیں ہے اور سرمایہ کار تو پاکستان میں لگے ہوئے کاروبار بند کر کے تخریب کاری، بجلی کی لوڈشیڈنگ کے ڈر سے ملک چھوڑ کر بنگلہ دیش جیسے چھوٹے ملک میں شفٹ ہونے کیلئے تیار ہیں۔ کراچی کے مقابلے میں ڈھاکہ بہت چھوٹا شہر ہے پھر بھی وہاں کی حکومت سرمایہ کاری کیلئے بڑے بڑے اقدامات کر رہی ہے باوجود اس امر کہ ٹریفک ہر وقت جام رہتی ہے اس کی وجہ کم سڑکیں اور ہاتھ کے رکشے کی کثرت ہے۔ ان کو پاکستان سے الگ ہوئے 40 سال ہو چکے ہیں اس وقت ان کا ٹکہ یعنی روپیہ ایک روپے میں 2 ملتا تھا مگر آج ایک روپے پچیس پیسے تک مضبوط ہو چکا ہے۔ بجلی کا یہاں بھی بحران ہے، گیس کی بھی شارٹیج ہے ترقی بھی پاکستان سے کم رفتار میں ہے مگر ہر طرف امن ہے۔ جمہوریت کی وجہ سے اس ملک کی دو بڑی جماعتیں یعنی عوامی لیگ اور بی این پی کی قائد دو خواتین یعنی

حسینہ شیخ صاحبہ مجیب الرحمٰن کی بیٹی اور خالدہ ضیاء سابق وزیر اعظم ضیاء الرحمٰن کی بیوہ ہیں۔ حسینہ شیخ کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے جبکہ 75 فیصد عوام بھارت کے خلاف ہیں اور پاکستان سے اچھے تعلقات چاہتے ہیں جو سابق وزیر اعظم خالدہ ضیاء صاحبہ کے اپنے ادوار میں پاکستان کے ساتھ تعاون کیا اور پاکستان کو ترجیح دی۔ مگر حسینہ شیخ جواب دوبارہ خالدہ ضیاء کی پارٹی کو ہرا کر برسرِ اقتدار ہیں بھارت کی طرف جھکاؤ رکھتی ہیں اور پاکستان سے ان کے دل میں بغض بھرا ہوا ہے جس کی مثال حالیہ سارک کی انرجی کانفرنس میں سب سے پہلے انہوں نے انگریزی میں تقریر کے بجائے بنگلہ میں تقریر کی جو میزبان ملک کی روایت کے خلاف تھی۔ اس کانفرنس کا افتتاح بھی انہوں نے جمعرات 15 ستمبر کو کیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ ہم نے ایک لاکھ افراد کی موت اور 2 لاکھ عورتوں کی عصمتیں گنوا کر حاصل کیا ہوا بنگلہ دیش 40 سال گزرنے کے باوجود اس صدمے کو بھلانے کو تیار نہیں ہے۔ ان کا اشارہ ڈھاکہ فال 1971ء پاکستانی فوج کی طرف تھا۔ اس کانفرنس میں ہمارے وزیر توانائی کی آمد متوقع تھی مگر کسی وجہ سے وہ نہیں آ سکے اور نہ ہی اسلام آباد سے فارن آفس کے سیکریٹری نے شرکت کی۔ صرف سارک پاکستان کے 2 نمائندے شریک تھے انہوں نے خاموشی سے ان کی جذباتی زہر سے بھری تقریر سنی۔ اتفاق سے راقم چونکہ اسی ہوٹل میں مقیم تھا تو میزبانوں کی اجازت سے شریک ہوا اور کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے آگاہ ہوا۔ کاش ہماری حکومت بنگلہ دیش کی حکومت سے ایسے بے ہودہ راگ الاپنے کے خلاف احتجاج کرے اس کے باوجود وہاں کے مقامی باشندے بھی اس تقریر سے شاکی تھے۔ بے شک حب الوطنی ضروری ہے مگر سارک میں رہتے ہوئے ایسے جملے استعمال کرنا سارک کے مقاصد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اسی وجہ سے آج 25 سال گزرنے کے باوجود سارک ممالک صرف ایک اسٹیج پر بیٹھ کر کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکے جو ان ممالک کے عوام کی معاشی بدحالی کو ختم کر سکے حتیٰ کہ ایک دوسرے کے ملک میں بغیر ویزے کے آ جا سکیں یا پھر آزادانہ تجارت کر سکیں۔ طرح طرح کی

پابندیاں لگی ہوئی ہیں۔صرف وعدوں پر یہ سارک تنظیم گفتن، نشستن برخاستن کے محاورے پر عمل کر رہی ہے۔میری سارک ممالک کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ یا تو اس ادارے کو فعال کریں یا پھر اس ادارے کو ختم کر دیں۔ہم یورپ کی طرح یورپی یونین نہیں بنا سکتے اور نہ ہی گلف والوں کی طرز پر گلف ریاستوں کا اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔کاش ہم سب مل کر سارک کے اغراض و مقاصد پر غور کریں اور اس کو عوام کی بہتری کے لیئے کام کریں۔صرف 3 دن بعد بنگلہ دیش میں اس امریکن کمپنی کے نمائندے سے مل کر پاکستان واپس آ گیا۔اگر کم از کم بنگلہ دیش اور پاکستان جو ماضی میں ایک جان اور دو قالب تھے دوبارہ متحد ہو کر پھر سے کنفیڈریشن کر لیں یا پھر کم از کم دو طرفہ تجارت اور ویزوں کی پابندیاں ختم کر لیں تو پھر دونوں ہی ترقی کر سکتے ہیں۔یہی بنگلہ دیشیوں کی اکثریت کی خواہش ہے۔

ہماری ڈرگ پالیسی اور بنگلہ دیش کی پالیسی

گذشتہ ہفتے راقم نے اپنے کالم میں بنگلہ دیش میں قیام کا حال لکھا تھا۔اس کا بقیہ حصہ آج کے کالم میں پیش کر رہا ہوں۔مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں میں جن میں سب سے آگے مرحوم شیخ مجیب الرحمٰن تھے انہوں نے بنگالیوں کو اس بات پر اکسایا ہوا تھا کہ مغربی پاکستان کے افراد ان کا استحصال کر رہے ہیں اور مشرقی پاکستان کی واحد پیداوار جوٹ کے بل بوتے پر سارا سرمایہ مغربی پاکستان لے جاتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔مشرقی پاکستان میں جوٹ کی کل آمدنی 30 فیصد بھی نہ تھی جو بعد میں بنگلہ دیش بننے کے بعد ثابت ہوگئی اور مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے 70% مقامی طور پر درآمدات کرتا تھا جس میں ہر قسم کے استعمال کی چیزیں حتیٰ کہ چاول، گندم اور ادویات شامل تھیں۔آج میں وضاحت کے ساتھ بنگلہ دیش کی ڈرگ پالیسی پر تبصرہ کروں گا جس کا راقم نے تفصیل سے مشاہدہ کیا ہے۔جب بنگلہ دیش کا قیام 18 اکتوبر 1971ء کو وجود میں آیا اس وقت چند فیکٹریاں جن میں چٹاگانگ شہر میں کرنافلی پیپر ملز، ڈھاکہ میں آدم جی جوٹ ملز کے علاوہ چند ادویات کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں تھیں اور بنگلہ دیش خود کفیل کسی چیز میں بھی نہیں تھا لہٰذا اس کا سکہ (ٹکا) پاکستان کے روپے کے مقابلے میں آدھا یعنی ایک روپے میں 2 ٹکے ملتے تھے، ہر طرف غربت کا راج تھا۔تلاش روزگار کے لیے بنگالی بھارت، نیپال کے راستے غیر قانونی طور پر پاکستان آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی لاکھ

بنگالی پاکستان پہنچ گئے ۔ بھارت نے قیام بنگلہ دیش کے بعد اس کی افواج نے کرنافلی پیپر ملز اور آدم جی جوٹ ملز جن کے مالکان پاکستان جا چکے تھے ان کی فیکٹریوں کی بڑی بڑی مشینریاں کھول کر بھارت بھجوا دیں یہ انہوں نے بنگالیوں کو آزاد کرانے کی پہلی قسط وصول کی جس کی وجہ سے اب بنگلہ دیش اور معاشی طور پر کمزور ہو گیا تھا ۔ پھر نوجوان بنگالیوں نے لاکھوں کی تعداد میں گلف کی ریاستوں کا رُخ کیا اور وہاں جا کر نوکریاں تلاش کیں اور زرمبادلہ بھیجا جس کی وجہ سے اس کی معیشت میں بہتری آئی پھر بنگلہ دیشی حکمرانوں نے امپورٹ کی پالیسیاں بنائیں ۔ آپ مارکیٹ سے ڈالر خرید کر امپورٹ کر سکتے تھے ۔ اس کا شرح ٹیکس 50 فیصد تھا اس سے مقامی لوگوں نے فیکٹریاں لگانی شروع کیں جن میں سب سے زیادہ ضرورت ادویات کی پڑتی تھی کیونکہ 90 فیصد ادویات مغربی پاکستان سے آتی تھیں جن پر پابندی عائد کر دی گئی اب بھارت چونکہ بنگلہ دیش سے متصل تھا دھڑا دھڑ اسمگل ہونی شروع ہو گئی ۔ بنگلہ دیش کی ڈرگ پالیسیاں بہت موثر بنائی گئیں جس میں حب الوطنی کا عنصر سب سے نمایاں تھا ۔ وہاں صرف مقامی لوگوں کو تمام مال بنانے کی مکمل آزادی تھی ۔ ڈرگ رجسٹریشن کیلئے مقامی افراد ہی تمام اجزاء پر مشتمل ادویات بنا سکتے تھے مگر غیر ملکی جن میں بھارت، نیپال، پاکستان اور سری لنکا بھی شامل تھے اور دوسری طرف ملٹی نیشنل کمپنیاں تھیں ان کو پابند کیا گیا کہ وہ صرف جان بچانے والی انٹی بائیوٹکس اور جو بھی اس کمپنی کی ریسرچ ادویات ہوتی تھیں وہ بنا سکتے تھے ۔ یعنی عام ادویات جن میں مشروبات، کھانسی کے شربت، کیپسول، طاقت کی ادویات اور عام بخار کی ادویات وغیرہ نہیں بنا سکتے تھے ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بنگلہ دیش میں 250 سے زیادہ فیکٹریاں مقامی افراد کی ملکیت ہیں ۔ 98 فیصد ادویات بنا رہی ہیں اور صرف 4 فیکٹریاں جو ملٹی نیشنل کی ملکیت ہیں 2 فیصد ادویات بنا رہی ہیں ۔ اس کے برعکس اگر پاکستان کی ڈرگ پالیسی کا مشاہدہ کیا جائے تو قیام پاکستان کے 67 سال گزرنے کے بعد آج تک اس کو تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے ۔ 1973ء تک تو یہ صرف صوبائی سطح تک

کنٹرول کی جاتی تھی مگر 80 فیصد غیر ملکی کمپنیاں ان پر قابض کرا دی گئی تھیں ۔ ہر قسم کی ادویات کے لائسنس صرف غیر ملکی کمپنیوں کے پاس تھے مقامی افراد کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے دوسرے عام قسم کے کاروبار کرتے تھے ۔ صرف چند ادویات کی فیکٹریوں کے مالکان پاکستانی تھے ۔ پھر ہماری بیوروکریسی بھی ملٹی نیشنل کو ادویات بنانے کا حقدار سمجھتی تھی جس کی وجہ سے ان کی اجارہ داری قائم تھی ۔ جب 1973ء میں پہلی بار پی پی پی کی حکومت آئی تو ان کی اجارہ داری ختم کرنے کیلئے عام ادویات کے جنرک نام پر بنانے کی شرط لگائی گئی اس کو جنرک ایکٹ 1973 کا نام دیا گیا ۔ اس کی وجہ سے اب مقامی لوگوں کو صحیح معنوں میں ادویات سازی کی دعوت ملی اور غیر ملکی کمپنیوں نے اپنا کاروبار بند کرنا شروع کر دیا ۔ اس کی وجہ جنرک ایکٹ میں ایک ہی جیسے نام کی ادویات مارکیٹ میں آئیں تو معلوم ہوا غیر ملکی کمپنیاں اپنے اپنے برانڈز کی وجہ سے چار چار گنا دام وصول کر کے پاکستانیوں کو لوٹ رہی تھیں ۔ پاکستانی کمپنیوں میں آزادانہ کمپٹیشن شروع ہوا اور کافی کاروبار مقامی کمپنیوں کو ملنے لگا تو صرف 3 سال بعد ان غیر ملکی کمپنیوں نے اس وقت کی ڈرگ پالیسوں کے خلاف موثر دباؤ ڈال کر غیر معیاری پاکستانی ادویات کے نام پر پی پی پی کی حکومت پر اپنے اپنے ایمبیسڈروں کے ذریعے کھیل کھیلا اور جنرک ایکٹ جس کی وجہ سے عوام کو سستی ادویات پاکستانی کمپنیوں سے مل رہی تھیں بند کروا دیں اور ڈرگ ایکٹ 1976 رائج کروا دیا جس کی وجہ سے اب دوبارہ ادویات برانڈ ناموں سے پھر رجسٹریشن کی آڑ میں نافذ کر دیا گیا جبکہ اس سے قبل ایک ڈرگ لائسنس کے اجراء سے آپ جتنی ادویات چاہیں بنوا سکتے تھے ۔ مگر اب ہر دوا کی الگ الگ رجسٹریشن ہونے لگی ہے پھر بھی مقامی لوگوں نے اپنی اپنی کمپنیاں رجسٹرڈ کروائیں اور ایک بدنام زمانہ فرد کی وجہ سے ادویات کا کاروبار پھر غیر ملکی کمپنیوں کے کنٹرول میں آ گیا اور آج تک غیر ملکی کمپنیاں اپنی من مانی کر کے مہنگی ادویات فروخت کر رہی ہیں جس کی وجہ سے آج مہنگی ادویات کا شور اُٹھتا رہتا ہے اور محکمہ صحت جس نے ادویات کی غیر ملکی کمپنیوں سمیت غیر ممالک

سے بھی ادویات کی درآمد کی اجازت دے رکھی ہے وہ عام بخار کے علاوہ کھانسی کے شربت کے ہوں یا طاقت کی گولیوں کے ہوں جو پاکستان میں بنتے ہیں کھلے عام منگوا کر ہم زرمبادلہ ضائع کر رہے ہیں۔ 475 کمپنیوں میں سے 450 کمپنیاں اگرچہ پاکستانی ہیں اور صرف 25 کمپنیاں غیر ملکی ہیں مگر ان کا 58 سے 60فیصد کاروبار پر آج بھی ان کی اجارہ داری قائم ہے اور 450 کمپنیاں مل کر 40فیصد تک مال بنا کر ان سے اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہیں۔عوام کی اطلاع کیلئے پاکستان میں 136 ارب روپے کی ادویات بنتی ہیں جو 17 کروڑ عوام کی ضرورت پوری کرتی ہیں۔یعنی ایک پاکستانی سال بھر میں 800 روپے کی ادویات استعمال کرتا ہے یعنی صرف 2.19 روپے روزانہ فی فرد کے حصہ میں ادویات آتی ہیں۔اس پر ہر طرف مہنگائی کے شور میں صرف ادویات پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔جبکہ عام کھانے پینے کی اشیاء دودھ، دہی، گوشت، گندم، سبزیاں اور فروٹ کی قیمتوں کے کنٹرول کا موثر نظام نہیں ہے اور وہ ادویات کی نسبت 1200 گنا تک بڑھ چکی ہیں۔5 روپے گیلن کا پیٹرول آج 90 روپے فی لیٹر ہو چکا ہے۔1 روپے کلو کا گوشت آج 500 روپے تک پہنچ چکا ہے مگر ادویات پر 5 روپے ڈالر والا قانون آج تک نافذ ہے جبکہ ڈالر بھی 5 روپے سے بڑھ کر 90 روپے تک پہنچ چکا ہے۔30 جون 2011ء کو حکومت نے ایک مرتبہ پھر ڈرگ پالیسی ترتیب دی جس کی رو سے اب صوبائی سطح پر ڈرگ پالیسی منتقل کر دی گئی مگر آج 3 ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔کسی بھی صوبے نے اپنی ڈرگ پالیسی کا اعلان نہیں کیا تمام پالیسیاں ہوا میں ہیں۔دوا ساز ادارے پریشان ہیں۔دو صوبوں یعنی بلوچستان اور نیا صوبہ گلگت بلتستان کے پاس تو ان کے دفاتر اور انفراسٹرکچر بھی نہیں ہے۔صوبہ پنجاب اپنی ڈرگ پالیسی بنا کر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے موڈ میں ہے جبکہ حکومت سندھ ابھی تک خاموش ہے۔ 2 سال بیشتر اس کا اعلان کر دیا گیا تھا مگر نہ مرکز نے کچھ سوچا کہ صوبوں کو منتقل ہونے کے بعد ڈرگ پالیسیوں کا کیا حشر ہوگا۔تمام صوبوں کے متعلقہ حکمران سو رہے ہیں کس کے پاس کیا قانون ہے آج

تک اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔آئے دن جعلی کمپنیوں کے ذریعے ادویات پھیلائی جا رہی ہیں حتیٰ کہ آج ڈینگی وائرس کیلئے ادویات نہیں ہیں اور مچھروں کو بھگانے والے تیل پرسیلز ٹیکس اور دیگر امپورٹ ڈیوٹیاں عائد ہیں۔جعلی اسپرے بھی مارکیٹ میں بھرے پڑے ہیں اگر یہ وبا پنجاب سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئی تو کونسا ادارہ اس کا ذمہ دار ہوگا۔راقم کی رائے ہے کہ ادویات کی کنٹرول پالیسی صرف مرکز یعنی فیڈرل حکومت کی ہونی چاہیے۔جس میں ڈرگ لائسنس، ڈرگ رجسٹریشن اور اس کی قیمتوں کا کنٹرول واپس مرکز کو دیا جائے اور غیر ملکی درآمدات کو بند کر دیا جائے کیونکہ اس سے زرمبادلہ ضائع ہو رہا ہے اور تمام غیر ملکی کمپنیوں سے عام ادویات بنانے کی رجسٹریشن ختم کر کے ان کو پابند کر دیا جائے کہ وہ صرف اپنی اصل ایجادات تک محدود رہیں عام ادویات جس طرح بنگلہ دیش میں مقامی کمپنیوں کو اجازت ہے وہی کمپنیاں بنائیں تاکہ مقامی لوگ اپنے کاروبار کو بڑھا سکیں اور غیر ملکی کمپنیاں ادویات کی کمائی اپنے ملک لوٹ کر نہ لے جا سکیں کیونکہ صوبے ابھی تک ڈرگ پالیسیاں بنانے کے لیے تیار بھی نظر نہیں آتے اس لیے انہیں صرف وہی پرانا قانون نافذ کر کے عمل میں لایا جائے اور فیڈرل ڈرگ کنٹرول اتھارٹی بنا کر اس افراتفری کو ختم کیا جائے۔

پونٹا کانا (Puntacana)

سردیوں کے اختتام پر امریکہ اور کینیڈا کاروبار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔نیویارک ائرپورٹ جان ایف کینڈی پر ایک پاکستانی ڈرائیور سے ملاقات ہوگئی جو ایک امریکن شہری کو لینے آیا ہوا تھا۔اُس کے مسافر کا فون آیا کہ اُس کی فلائٹ مس ہوگئی ہے لہذا وہ چھ گھنٹے بعد کی فلائٹ سے آئے گا۔پاکستانی ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا اگر آپ شہر جا رہے ہیں تو میں آپ کو عام ٹیکسی کے داموں بہترین برانڈ نیو لیموزین میں لے جا سکتا ہوں مجھے اور بیگم کو نیویارک شہر ہی جانا تھا ہم اُس کی لیموزین میں بیٹھ گئے ۔ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی اُس نے پہلا سوال کیا پاکستان کا کیا حال ہے میں نے کہا کیا تم یہاں پاکستانی چینل نہیں دیکھتے اُس نے بڑے دُکھ سے کہا کیوں نہیں دیکھتے خالی وقت میں ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔چینلز پر سیاست دانوں کی گفتگو اور کرپشن،بجلی،گیس کا بحران عدلیہ کے فیصلوں پر تنقیدیں مار دھاڑ سے بھرپور پاکستانیوں کی قتل کی وارداتیں دیکھ دیکھ کر ہم پریشان ہوتے ہیں کہ کہاں ہمارا خوشحال ملک اب تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے ہر کوئی ہم کو آنکھیں دکھا رہا ہے ہمارے شہری دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بن چکے ہیں۔سرمایہ باہر جا رہا ہے صنعتیں بند ہو رہی ہیں اُس نے بتایا وہ 1982 میں جاپان گیا وہاں اُس کو کوئی کام نہیں ملا وہاں سے امریکہ آ گیا یہاں بہت خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے اُس کے بچے اب بڑے ہو گئے ہیں سب نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لی ہے اب وہ پاکستان جانے سے بالکل

انکاری ہیں جبکہ سارے خاندان والے فیصل آباد میں رہتے ہیں پچھلی مرتبہ جب گئے تھے تو بہ مشکل ایک ہفتے رُکے نہ بجلی تھی نہ گیس اوپر سے رشتہ داروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ہوا پانی بھی راس نہیں آئی سب کو پاکستانی کھانے اور پانی پینے سے پیچش لگ گئی ایک ماہ کا پروگرام تھا صرف ہفتے بھر میں اُکتا گئے اور واپس آ کر کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے اب پاکستان رہنے کے قابل نہیں رہا۔راستہ بھر وہ دُکھ کے ساتھ پاکستان کی برائیاں گنواتا رہا ہم دونوں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتے رہے۔مجھے چند رشتہ داروں کو جو نیویارک میں رہتے ہیں فون کرنا تھا اُس نے اخلاقی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا موبائل فون مجھے دیا میں اُس کے باتوں سے بھی بچنا چاہتا تھا راستہ بھر رشتہ داروں اور دوستوں سے ہائے ہیلو کرتا رہا ایک گھنٹے کا راستہ طے ہوگیا اُس نے اپنا موبائل کا نمبر دیا اور کہا کہ بحیثیت پاکستانی نیویارک میں آپ گھومنا چاہے تو میری مفت خدمات آپ کے لئے حاضر ہیں میں نے صرف اترتے وقت اپنا تعارف کرا دیا تھا اُس نے بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا ہوٹل پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کیا پھر چونکہ ویک اینڈ تھا تو رشتہ داروں اور دوستوں سے خوب ملاقاتیں رہیں۔میرے ایک دیرینہ دوست نے میری ڈومینکین ری پبلک کے شہر پونٹا کانا (Puntacana) گھومنے کے لئے فلائٹ بُک کروا رکھی تھی ہم کو نہیں معلوم تھا کہ یہ ساحلی علاقہ کیسا ہوگا مگر اُس نے بتایا تھا کہ دنیا کے دس بہترین ساحل سمندروں میں سے ایک پونٹا کانا بھی ہے ہم دونوں کی بیگمات بھی ساتھ تھیں نیویارک سے فلوریڈا کے شہر سے جہاز تبدیل کر کے تین گھنٹوں میں پونٹا کانا پہنچے رات کے آٹھ بجے تھے بہت چھوٹا ائرپورٹ تھا بالکل چھپڑوں سے بنا ہوا پورا کھلا ہوا ھوادار ائرپورٹ بغیر ائرکنڈیشن ٹیبل کرسی والے امیگریشن پر ایک ایک بندہ کھڑا تھا۔اترتے ہی 10 دس ڈالر فی کس ویزہ فیس وصول کی اور ہم چند منٹوں میں ائرپورٹ سے باہر آ گئے ہمارے دوست نے کرایہ کی گاڑی بھی بُک کروا رکھی تھی جو باہر گاڑیوں کے شوروم سے مل گئی معمولی بجلی کا انتظام تھا۔سڑکیں کشادہ اور بالکل نئی لگ رہی تھیں باہر نکلتے ہی سمندر کی لہروں کی آوازیں آ رہی تھیں سڑک

کے دونوں جانب درختوں کے جھنڈ تھے۔اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔موبائل فون کام نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی راستہ بتانے والے GPRS سسٹم کام کر رہے تھے گائیڈوں کی مدد سے ہوٹل کا پتہ لیا جو ائرپورٹ سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔راستہ سنسان تھا کوئی آس پاس آبادی نہیں تھی دس بجے تک ہوٹل تو پہنچ گئے تو معلوم ہوا یہاں اس شہر میں صرف ہوٹلوں اور ریسٹورنٹوں کی بھرمار ہے جو ایک ایک ہزار ایکڑوں پر گالف،کلب،کیسینوں سے بھرے پڑے ہیں بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں امریکہ اور کینیڈا سے خصوصی طور پر ٹورسٹوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے دنیا بھر سے اب لوگ اس ملک کا رُخ کر رہے ہیں۔واقعی جنت نظیر سمندری ساحل پر جگہ جگہ بڑے بڑے ہوٹل تھے۔گرمیوں میں تو ان میں جگہ نہیں ملتی البتہ ہوٹل بہت مہنگے ریسٹورنٹ 300 ڈالر فی کمرہ سے لے 1500 ڈالر فی کمرے تک ملتے ہیں۔دوسرے دن کشتی رانی بھی کی جو صرف 100 ڈالر فی کس کے حساب سے سارا دن درمیانی کشتی میں جن میں 70,60 لوگوں کی گنجائش تھی سمندر میں سیر کروائی گئی دوپہر کا کھانا پینا بھی اس کرایہ میں شامل تھا حلال کھانے کو کوئی نہیں جانتا تھا لہذا ہم نے ہوٹل سے چلتے وقت مچھلیاں جو ہوٹل والوں نے تازہ تازہ پکڑیں تھیں فرائی کروا کر احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھیں جو میرے میزبان دوست نے صبح ہی صبح اُٹھ کر کچن والوں سے رات بات کر لی تھی بہت مزیدار فریش دوپہر کو کھانے میں بھی لطف آیا۔سمندر میں جیکٹوں کی مدد سے نہا کر گزارا۔کشتی پر مقامی لڑکے اور لڑکیوں نے رقص بھی پیش کیا اور میوزک کی دھنوں پر مقامی ڈانس کیا۔عوام کی معلومات کے لئے اس ملک کا جغرافیہ کریبین ممالک میں دوسرے نمبر پر ہے اس کی آبادی 11 ملین افراد پر مشتمل ہے 86 فیصد کرسچن کالے مکس لوگ ہیں 1492 میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔

تو اس ملک ڈومینکین ری پبلک کو بھی دریافت کیا چونکہ کولمبس اسپینش تھا تو اُس نے افریقہ سے کالے لوگوں کو زبردستی یہاں لا کر غلام بنا کر اس سرزمین پر کھیتی باڑی کروائی۔اور اسپین کے امیروں کو لا کر اُن

کا مالک بنایا اسی وجہ سے یہاں کی قومی زبان اسپینش ہے اور یہی غلام 600 سال میں اس ملک کے مالک بن گئے اور اسپینش اپنے اپنے ملکوں یا امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے یہاں کا موسم معتدل اور بارشوں سے Humidity سو تک رہتی ہے گرمیوں میں اگست ستمبر میں 40 درجہ سینٹی گریڈ تک جاتا ہے یہاں غربت اور امیری دونوں ساتھ ساتھ ہے تعلیم 100 فیصد 5 سالہ بچے سے لیکر 14 سالہ بچے تک مفت ہے فی کس آمدنی 9000 ڈالر ہے اس کی وجہ ٹورسٹوں کی پسندیدہ ساحلی پٹیاں ہیں کیسینوں اور دیگر عیاشی قانونی جرم نہیں ہے البتہ ڈرگس کا استعمال اور اسمگلنگ عام ہے جو کولمبیا اور میکسیکو کے راستہ امریکہ اور کینیڈا جاتی ہے جو غیر قانونی ہے اس کی کرنسی کو پیسو (PESSO) کہتے ہیں جو 1980 تک خوشحالی کی وجہ سے ایک ڈالر کے برابر تھی مگر اب ایک ڈالر میں 36 پیسو تک جا پہنچی ہے البتہ 2003 میں 53 تک پہنچ گئی تھی مگر جیسا پہلے ذکر کیا ہے ساحل سمندر اور خوشگوار موسم کی وجہ سے ٹورسٹوں کی جنت بن رہا ہے بجلی کا انتظام اچھا ہے سڑکیں کشادہ ہے سین ڈیاگو اس کا دارالخلافہ ہے وہ بھی بہت خوبصورت اور بڑا شہر ہے اس ملک کے 31 صوبے ہیں ہر طرف ہریالی ہے گنے کی کاشت اور شوگر ملیں ہیں۔عوام بہت خوش اخلاق البتہ انگریزی سے نابلد ہیں ہر شخص اسپینی زبان بولتا ہے صاف ستھرے ذہن کے مالک ہیں نسلوں کے ملاپ سے نہ زیادہ کالے ہیں اور نہ زیادہ گورے ہیں کل کے غلام آج آزاد ملک کے مالک ہیں اور اپنی پچھلی نسل کو بھلا چکے ہیں اور فخر سے اپنے آپ کو ڈومینکین کہتے ہیں۔تین دن اور تین راتیں خوشگوار گزارنے کے بعد اُس چھوٹے سے ائرپورٹ سے واپس امریکہ روانہ ہو گئے۔اگر کوئی امریکہ یا کینیڈا جائے اور ڈومینکین ری پبلک کے شہر پونٹا کانا نہ جائے تو سمجھیں آپ نے بہت جنت نظیر ساحل سمندر مس کیا۔ان تین دنوں میں بارشیں بھی اور دھوپ بھی نکلی اور سردی بھی رہی البتہ تینوں دن سی فوڈ کھانا پڑا۔حلال کھانا نہیں ملتا آئندہ کھانا پیک کروا کر لانے کا انتظام کرنا ہوگا۔

بھارت کا دورہ اور پولیس رپورٹنگ

گذشتہ کئی سالوں سے پاکستان اور ہندوستان کے دو بڑے اخبار جنگ اور ہندوستان ٹائمز مل کر پاکستان اور بھارت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے ''امن کی آشا'' کے نام سے بھرپور کوشش کر رہے ہیں اس میں کچھ پیش رفت بھی ہوتی رہی تجارتی معاہدے بھی عمل میں لائے گئے ۔ ہمارے دونوں ممالک میں تلخیاں بھی کم کرنے کی کوشش بھی بار آور ہوئی۔ دونوں ممالک کے ثقافتی طائفے بھی آئے ۔پاک بھارت چیمبر آف کامرس کا بھی اجراء ہوا۔ بھارت نے پاکستانی صنعت کاروں کو بھارت میں کاروبار اور صنعتیں لگانے کی اجازت بھی دے دی۔ تاہم پاکستان کی طرف سے ابھی تک بھارتی صنعت کاروں اور تاجروں کو ایسی سہولتیں فراہم کرنے کا اعلان نہیں ہوا۔ ویزوں میں آسانیاں پیدا کرنے کی تجاویز پر غور ہو رہا ہے ۔اب تو سیاچن سے دونوں ممالک کی فوجوں کی واپسی کا عندیہ بھی سننے میں آ رہا ہے ۔اگر یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو یہ بہت بڑا کارنامہ موجودہ حکمرانوں کے کھاتے میں جائے گا۔اگر چہ سارک ممالک جن میں پاکستان، بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش، بھوٹان، مالدیپ اور نیپال سمیت 8 ممالک کا اشتراک عمل بہت کمزور ہو رہا ہے اور آپس میں آنے جانے پر عوام کو کوئی ریلیف نہیں مل سکا۔راقم نے 4 سال قبل سارک فیڈریشن کی تاحیات ممبر شپ حاصل کی جس کی فیس 3 ہزار ڈالر تھی۔ جو بڑھ کر اب پاکستان میں 5 ہزار ڈالر تک کر دی گئی ہے۔ جبکہ بھارت اور دیگر ممالک میں اس

کی کوئی فیس نہیں تھی اور نہ ہی آج ہے یہ بات میرے ایک بزنس پارٹنر جن کا تعلق بھارت سے ہے اور دوسرے کا تعلق سری لنکا سے ہے بہر حال اس کے عوض راقم کو سارک اسٹیکر کے اجراء کا وعدہ کیا گیا تھا جو بار بار یاددھانیوں کے باوجود 4 سال تک نہیں مل سکا ایک روز میری خوش قسمتی کراچی سے اسلام آباد کی فلائٹ میں سارک فیڈریشن کے صدر جناب طارق سعید اور جناب افتخار علی صاحبان سے ملاقات ہوگئی ان کی توجہ مبذول کرائی تو راقم کو ایک ماہ میں سارک اسٹیکر مل گیا۔سارک اسٹیکر ان 8 ممالک میں آنے جانے کا پرمٹ ہوتا تھا جس میں پہلے ہر ملک کے 5 شہروں میں آ جا سکتے تھے اور ایک سال تک یہ کارآمد ہوتا تھا مگر جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ سارک ممالک کے ذمہ داران آپس کے اشتراک میں بہت سست ہیں جس کی تازہ مثال اس سال اس اسٹیکر کی معیاد ایک سال سے گھٹا کر صرف 3 ماہ اور 5 شہروں سے گھٹا کر 3 شہروں تک محدود کر دیا گیا۔اور اسٹیکر لینے والوں کو اس سے آگاہ بھی نہیں کیا گیا۔ میرے بزنس پارٹنر کو جب اسٹیکر لگنے کی میں نے اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوا اس نے ان گرمیوں کی چھٹی منانے کیلئے مجھے اوٹی، بنگلور، میسور، دہلی اور گوا کی دعوت دی جس کو میں نے قبول کر لیا اور پہلے مرحلے میں دہلی سے بنگلور، میسور اور اوٹی کا ایک ہفتے کا پروگرام رکھا۔واپسی دہلی سے گوا کا پروگرام رکھا۔اس نے 6 دن کی واپسی کی فلائٹ دہلی، بنگلور اور بذریعہ کار بنگلور سے میسور اور 3 دن اوٹی کی بکنگ بھی کروالی۔تمام جہاز کا ریٹرن ٹکٹ ایک دن بنگلور کی سیر 2 دن میسور کی سیر اور 3 دن سب سے اونچی پہاڑی اوٹی جسے نیل گری کی پہاڑیاں کہتے ہیں۔بہترین ہوٹلوں میں قیام، گاڑی کی بکنگ معہ ڈرائیور اور صبح کا ناشتہ فی کس سب ملا کر صرف -/120000 بھارتی روپے ادا کیے (یعنی پاکستانی -/240000 روپے)۔ہم 4 افراد یعنی 2 میاں بیوی اس سفر پر جا رہے تھے مگر جب دلی کے ائیر پورٹ پر اُترا تو مجھے بتایا گیا کہ آپ صرف 3 شہروں کا چناؤ کر سکتے ہو جبکہ ہماری 4 جگہوں کے ہوٹل کی بکنگ بھی ہو چکی تھی اور نا قابل واپسی تمام پیسے ایڈوانس ادا کر دیے گئے تھے ۔بہر حال ائیر پورٹ سے

3شہروں کا اجازت نامہ لے کر باہر آیا تو میرے دوست پارٹنر میرا انتظار کر رہے تھے۔ان کو جب تین شہروں کا بتایا تو وہ بھی بہت پریشان ہوئے۔یاد رہے پاکستان اور بھارت کا آپس میں موبائل فون کا استعمال ابھی تک شروع نہیں ہو سکا۔پاکستان کی سم بھارت میں اور بھارتی موبائل کی سم پاکستان میں نہیں چلتی۔میرے دوست نے اپنے امیگریشن دوست کو یہ صورتحال بتائی تو اس نے تسلی دی کہ وہ 2دن میں ایک اضافی شہر کی خصوصی منظوری دلوا دے گا۔مگر ہمیں دوسرے دن ہی بنگلور روانہ ہونا تھا اس نے وعدہ کیا کہ وہ منظوری کے کاغذات بنگلور پولیس کو بھجوا دے گا۔لہٰذا ہم خوشی خوشی بنگلور بذریعہ ہوائی جہاز صرف ڈھائی گھنٹوں میں پہنچ گئے۔دہلی کا درجہ حرارت 48 سنٹی گریڈ تھا جبکہ بنگلور 24 سنٹی گریڈ تھا۔سب اس خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہوتے رہے دوسرے دن واقعی ہم کو میسور کا اجازت نامہ بذریعہ پولیس اسٹیشن تو مل گیا مگر اس میں اضافی شرط یہ لگائی کہ پولیس رپورٹنگ ویزہ ہوگا جبکہ سارک اسٹیکر پولیس رپورٹنگ سے استثنیٰ ہوتا ہے۔ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو وہاں پہلے سے 8نو سو افراد پولیس رجسٹریشن کیلئے صبح سے پہنچے ہوئے تھے۔ہمارے پاس میسور روانگی میں صرف 2 گھنٹے تھے جبکہ بظاہر شام تک رجسٹریشن ممکن نہیں تھی۔خیر ہم نے معلوم کیا کہ پاکستانیوں کی رجسٹریشن کا کاؤنٹر کونسا ہے کیونکہ یہ تمام 8نو سو افراد غیر ملکی تھے ہم صرف 2پاکستانی تھے۔پاکستان کے کاؤنٹر پر پہنچے تو اس نے بتایا کہ پاکستانیوں کے لیے پہلے جس علاقے کے ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہیں اس پولیس اسٹیشن سے NOCلیا جائے چونکہ ہمارا اسٹیکر اس سے استثنیٰ تھا اس لیے ہم نے پولیس کو رپورٹ نہیں کیا تھا۔اب اس لمبی تھکا دینے والی کاروائی سے بچنے کیلئے ہم نے اس کے آفیسر سے رابطہ کیا اور اس کو بتایا کہ راقم جبوتی کا پاکستان میں قونصل جنرل ہے لہٰذا پولیس رپورٹنگ کو ختم کر دیا جائے۔وہ آفیسر بہت خوش اخلاق تھا اس نے خصوصی اختیارات استعمال کیے اور رجسٹریشن فوری طور پر کروا دیا۔ہم پھر بھی دوپہر 2بجے فارغ ہوئے دوپہر کا کھانا جو ہم نے وجیٹیرئین ساؤتھ تھا کھایا جو سبزیوں اور دالوں کا مجموعہ ٹیبل

پر کیلے کے پتوں پر پیش کیا گیا۔اس تھالی کی خصوصیت یہ تھی کہ ہم جتنا بھی کھانا چاہیں بغیر اضافی پیسے دیئے کھا سکتے ہیں اور فی تھالی 125 روپے تھی جس میں روٹی، چاول دو قسم کی دالیں دو قسم کی سبزیاں ایک گلاب جامن اور دو پاپڑ شامل تھے جو پیٹ بھرنے کیلئے کافی تھے۔ہوٹل میں میسور پہنچ کر جو گاڑی میں ساڑھے تین گھنٹے لگے سامان رکھا اور میسور کا مشہور لائٹ شو دیکھنے جو میسور کے دریا پر بند باندھ کر پانی میں بہت دلچسپ ہزاروں لائٹوں کا فواروں کی مدد سے موسیقی سے بھرپور رنگا رنگ شو دیکھا۔اس شو کو دیکھنے کیلئے ہر سال 30 سے 35 لاکھ افراد بیرون ممالک سے میسور آتے ہیں کیونکہ ہم تھکے ہوئے تھے جلد ہی سو گئے۔دوسرے دن میسور کے مشہور راجا کا بہت بڑا محل دیکھا آدھا دن اس میں لگ گیا۔محل میں کروڑوں روپے راجا کے تحائف سونے کے زیورات سینکڑوں کمروں پر مشتمل محل کی سیر کی۔شام کو میسور کے شہید حکمران جن کو انگریزوں نے دھوکے سے مروا دیا تھا ٹیپو سلطان کے مقبرے میں جہاں ان کے والد حیدر علی ان کی والدہ اور بیگم کی قبریں معہ ان کے سینکڑوں سپاہیوں، جانثاروں، سپہ سالاروں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی اور ان کا گرمیوں کا چھوٹا سا محل دیکھا۔وہاں بھی پولیس رپورٹنگ میں 3 گھنٹے ضائع ہوئے یہاں سے ہم اوٹی کی پہاڑیوں کے لیے روانہ ہوئے راستے میں شیروں، چیتوں، بندروں اور ہرنوں سے بھرے جنگلات میں سے گزرے اور 3 گھنٹوں میں اوٹی پہنچے۔راستے میں چائے کے زبردست ہرے بھرے باغات دیکھے۔ایک چائے بنانے والی فیکٹری بھی دیکھی اوٹی چائے کی بہت قسمیں پیدا کرنے کے لیے بہت مشہور ہے اور یہاں گھر گھر میں طرح طرح کے چاکلیٹ بنانے کا فن ہے جو اوٹی شہر میں ہر دکان پر ملتے ہیں۔اوٹی میں ویسے تو کوئی خاص تاریخی عمارتیں نہیں ہیں البتہ رنگین پہاڑیاں اور وادیاں، موسم انتہائی خوشگوار، رات کو درجہ حرارت آٹھ ڈگری تک ہو جاتا ہے، سیاحوں سے بھرا ہوتا ہے۔یہاں شادی کے نئی مون جوڑے بھرے پڑے ہوتے ہیں ہر ایک کے ہاتھ میں کیمرہ ہوتا ہے یہاں بھی وہی پولیس کا چکر تھا۔ہم جمعہ کی شام پہنچے مگر جب ہفتے کو

پولیس اسٹیشن گئے تو معلوم ہوا کہ ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد ایک پولیس والے کو تیار کیا اس نے دوسرے دن آنے کو کہا اور ہمارے کاغذات رکھ لیے۔ ہفتہ کو اس کا افسر اوٹی سے باہر گیا ہوا تھا۔ خیر اس نے دوسرے دن دستخط کروا کر جب کاغذات ہمارے حوالے کیے تو غلطی سے اوٹی سے واپس دہلی کی ایگزٹ لگانے کی بجائے کراچی کا خروج لگا دیا۔ اب اس کا آفیسر بھی نہیں تھا۔ ہم کو پیر کی صبح 6 بجے واپس بنگلور کیلئے فلائٹ پکڑنی تھی جو 8 گھنٹے کی مسافت تھی۔

کرتا کیا نہ کرتا وہی کاغذات لے کر دہلی پہنچے خوش قسمتی سے ہمارے دوست کے امیگریشن دوست نے پھر ہماری مدد کی اور پھر دہلی رکنے کا اجازت نامہ دے دیا مگر دہلی کی گرمی ہم سے برداشت نہیں ہوئی دوسرے دن واپس پاکستان آ گئے۔ اس تفریح میں دو مرتبہ پولیس رپورٹنگ کی اذیت ہر پاکستانی اور بھارتی اُٹھاتا ہے یعنی انٹری اور ایگزٹ الگ الگ دن کرانی پڑتی ہے۔ کم از کم دونوں حکومتیں عوام کی بھلائی کے لیے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں کیونکہ یہ طریقہ کار دنیا کے کسی بھی ممالک میں نہیں ہے اور یہ بات ''امن کی آشا'' میں بہتری لائے گی۔ دونوں ممالک کے حکمرانوں کو کریڈٹ بھی جائے گا اور دعائیں بھی لگیں گی۔

کاش ہم چین سے کچھ سیکھیں

چین ہمارا پڑوسی، ہمارا سب سے بڑا خیر خواہ، ہمارے ہر بُرے وقت میں ہمیشہ ساتھ دینے والا ملک، مگر افسوس ہم نے اس سے کچھ نہیں سیکھا۔ اُس نے 50 سال میں اتنی ترقی کر لی جتنی امریکہ نے 250 سالوں میں بھی نہیں کی اور آج امریکہ چینی مال کا دنیا میں سب سے بڑا خریدار بن چکا ہے۔ راقم کا سب سے پہلے 1967ء میں چین جانے کا اتفاق ہوا، اُس زمانے میں چین کے لئے صرف پاکستان انٹرنیشنل ائر لائنز کو اترنے کی اجازت تھی کیونکہ چین کے نجات دہندہ ماؤزے تنگ اور ان کی پارٹی دنیا کی واحد کمیونسٹ نظام کی حامی تھی جس کی رو سے تمام ملکیت، قوم کی امانت ہوتی ہے اور کوئی بھی چیز ذاتی نہیں ہوتی۔ یہ نظام ہماری آزادی سے 2 سال بعد اس وقت کے بادشاہ چیانگ کائی شیک سے عوام کی طویل جدوجہد اور مارچ کے بعد ماؤزے تنگ نے حاصل کیا تھا اور بادشاہی نظام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر کے کمیونزم کی بنیاد رکھی تھی۔ یاد رہے اس زمانے میں چینی قوم افیمی اور کام چور کہلاتی تھی۔ تمام ذاتی چیزیں، عمارتیں، ہوٹل حتیٰ کہ گھر، کاروبار، گاڑیاں سب کو قومیا لیا گیا تھا۔ پوری قوم کو کام پر لگا دیا گیا تھا اس سے پہلے تمام پرند، چرند، جانور کھا لیئے گئے تھے تا کہ ایک دانہ بھی اناج کا ضائع نہ ہو۔ بلکہ خود عوام تمام کیڑے مکوڑے سمیت ہر چیز کھا کر ختم کر دیں اور آج بھی کوئی پرندہ یا زمینی کتے، بلیاں، چوہے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ اُس زمانے میں صرف سرکاری بسیں، بجلی سے چلنے والی شہر

میں ٹرینیں یا دور دراز جانے کے لئے ریلوے ٹرینیں ہوتی تھیں ۔ ذاتی استعمال کے لئے صرف سائیکلیں ہوتی تھیں ۔ جو عام آدمی سے لے کر وزراء، سفراء سب کے لئے یکساں سہولتیں ہوتی تھیں ۔ سادہ لباس ہوتا تھا اور ایک ہی قسم کا معمولی کپڑوں کا، پوری قوم ڈٹ کر کام کرتی اور اچھی اچھی اشیاء غیر ممالک ایکسپورٹ کر دی جاتیں اور خوب غیر ملکی کرنسی اس ملک کو ترقی کی منازل طے کراتی رہیں ۔ چینی قوم اس زمانے میں صرف امریکہ سے تعلقات نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی امریکی ڈالر میں لین دین ہوتا تھا ۔ اگر میں کہوں کہ وہ امریکہ سے نفرت کرتے تھے تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا ۔ پھر پاکستان کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کے دور میں چین اور امریکہ کی دوستی کروائی اور اس طرح چین اور امریکہ کی دشمنی بظاہر ختم ہوگئی اور دونوں ممالک نے آپس میں تجارت شروع کر دی پھر آہستہ آہستہ چین میں ثقافتی انقلاب آتے گئے ۔ حکومتیں آہستہ آہستہ دیگر ممالک کی طرح کمیونزم سے امپریل ازم یعنی سرکاری اور ذاتی نظام کی طرف چل پڑیں، پھر ہانگ کانگ جو 100 سال کے پٹے پر برطانیہ نے لیا تھا واپس چین کو مل گیا ۔ پھر کیا تھا عوام نے دل کھول کر صنعتیں لگائیں اور ترقی کرتے کرتے زمین سے آسمان تک چائنہ کو پہنچا دیا ۔ اس میں ان کے حکمرانوں کا کلیدی کردار تھا خود پی آئی اے نے چائنا ایئر لائن کو بنایا اُس زمانے میں ہمارے ملک پاکستان میں سب کچھ بنتا تھا اور چین میں صرف نقالی ہوتی تھی ۔ ہم نے آج سب کچھ گنوا دیا اور چینی حکمرانوں اور عوام نے اُس کو ایک ناقابل شکست ملک کے طور پر اُبھار دیا ۔ اب وہ امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات منواتا ہے اور اس 40 پینتالیس سالوں میں راقم کا کئی بار تجارتی معاملات کے سلسلے میں چین جانے کا اتفاق ہوا ۔ جس بڑے شہر میں صرف 2 چار ہوٹل ہوتے تھے آج کئی سو ہوٹل بن چکے ہیں ۔ معمولی ائرپورٹ اب میلوں میں پھیلے ہوئے، کئی ٹرمنلز میں تبدیل ہو چکے ہیں، صنعتی علاقے تو اب چپے چپے میں پھیل چکے ہیں کون سی چیز ہے جو چین میں نہیں بنتی ۔ اب تو پوری دنیا کے مشہور مشہور برانڈ چین میں بنتے ہیں اور اب وہ وہاں سے

بنوا کر پوری دنیا میں سپلائی کیئے جاتے ہیں ۔ حکومت نے صنعتی ترقی کے لئے بجلی، گیس اور زمینیں سستے داموں میں سبسڈری کے طور پر دیں تا کہ وہ پوری دنیا سے مقابلہ کر سکیں ۔ شروع شروع میں تو مالی وسائل بھی حکومت کے ذمہ تھے ۔ یہ ترقی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کاش ہمارے حکمران بھی چینیوں سے سبق سیکھیں مگر ہم اُس کے برعکس اپنی عیاشیوں اور کرپشنز میں ملوث رہے اور ایشین ٹائیگر بننے کے بجائے ایشین چوہے بھی نہ بن سکے ۔ یاد رہے چین میں کسی بھی قسم کی کرپشن پر سزائے موت کی سزا ہے جو منشیات ہی کی طرح سمجھی جاتی ہے ۔ اگر آج آپ چین جائیں تو نہ صرف حیران ہونگے بلکہ پریشان ہو جائینگے کہ 40 سال میں یہ افیمی قوم آج دنیا کی سب سے عظیم قوم بن چکی ہے ۔ ان کی اچھی باتوں میں جلدی سونا، جلدی اٹھنا، ہلکی پھلکی غذا، صبح 7 بجے ناشتہ، 12 بجے دوپہر کا کھانا اور شام 6 بجے تک وہ آخری کھانا کھا کر رات 9 بجے تک سو جاتے ہیں ۔ وہ سارا دن نیم گرم پانی میں سبز یا کالی چائے بغیر دودھ پیتے رہتے ہیں ۔ ٹھنڈے پانی کا وہاں کوئی رواج نہیں ہے اسی وجہ سے بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں ۔ ان کے بال بڑھاپے تک سروں پر رہتے ہیں ۔

50 ساٹھ سال تک معمولی بات ہے کالے ہی رہتے ہیں ۔ لمبی لمبی عمریں، 100 سو سال تک کے بوڑھے سڑکوں پر آج بھی پیدل چلتے نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے بادشاہی دور پھر کمیونزم اور اب دوبارہ امپریل ازم تینوں ادوار دیکھے ہیں ۔ چینی لوگ اپنے بزرگوں کا آج بھی احترام کرتے ہیں ۔ مغربی ممالک کی طرح انہیں اولڈ ہاؤس میں نہیں بھیجتے اگر خود بڑے شہروں میں کاروبار یا نوکریاں کرتے ہیں تو گاؤں میں اپنے گھر والوں کا خیال رکھتے ہیں ۔ ان کی سالانہ چھٹیاں جنوری سے فروری تک ایک ساتھ ہوتی ہیں ۔ جو وہ اپنے اپنے آبائی شہروں میں جا کر مناتے ہیں ۔ اس دوران اکثر صنعتیں بند ہو جاتی ہیں ۔ ریلوے اور ہوائی جہاز کا زبردست نظام ہر شہر اور ہر قصبے کے لئے موجود ہے ۔ وقت پر ٹرینیں چلتی ہیں، بسوں کا بھی نظام بہت اچھا ہے ۔ آج چین کا ہر شہری ان سہولتوں کی وجہ سے حکمرانوں

سے خوش ہے، تعلیم اور ہسپتال کی سہولتیں عوام کے لئے مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے 100 فیصد چینی زبان پر سب کو عبور حاصل ہے، البتہ انگریزی زبان سے بہت بڑی اکثریت نابلد ہے۔ اس وجہ سے سیاحوں کو زبان کے معاملے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔ البتہ اب نئے نظام میں انگریزی زبان کو شامل کرلیا گیا ہے جس کی وجہ سے نئی نسل انگریزی میں با آسانی گفتگو کرسکتی ہے۔ لاکھوں نئی نسل کے بچے غیر ممالک میں بھی جا کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمارے صدر آصف علی زرداری صاحب کا بھی چین کی طرف کافی رجحان پایا جاتا ہے۔ کاش وہ ایسا نظام پاکستان میں نافذ کروادیں تو وہ پی پی پی کے لئے سنہرے دور کی ابتداء کرسکتے ہیں اور یہ کوئی ناممکن نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم بھی بہت محنتی ہے مگر اصلی رہبر سے محروم ہے۔

دنیا کا غریب ترین صدر

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب کرسی خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے اپنا تمام اثاثہ سرکاری خزانے میں جمع کرادیا اور اپنی اہلیہ کو بھی کہا کہ وہ بھی اپنے تمام قیمتی ہار، سونے کے جواہرات جو ان کو ان کے والد کی طرف سے تحفوں میں ملے تھے۔ تمام کے تمام سرکاری خانے میں جمع کرادیں۔ جب انہوں نے اس حکم میں پس وپیش کی تو فرمایا دولت اور خلیفہ ایک چھت کے نیچے اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ وہ جب خلیفہ نہیں تھے جو کپڑے صبح پہنتے تھے وہ دوپہر کو نہیں پہنتے تھے اور دنیا بھر کی ان کو خوشبوئیں استعمال کرنے کا بہت شوق تھا، بے حد خرچیلے شہزادوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مگر خلیفہ بننے کے بعد ان کی سادگی دیکھ کر انہیں عمر ثانی کا خطاب ملا اور چند ہی سال میں ایسی ایسی مثالیں قائم کیں جو آج تک سنہری حروفوں سے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بھی بہت سے حکمران آئے اور سادگی کی عمدہ مثالیں چھوڑ گئے کئی تو صرف اپنے ہاتھوں سے بنی ٹوپیاں بنا کر بیچ کر گزارہ کرتے تھے مگر آج کے مسلمان حکمران ہی نہیں کم وبیش دنیا کے تمام حکمران شاہ خرچیوں، عیاشیوں میں گھرے ہوئے ہیں اگرچہ ان کے محاسبے بھی ہو رہے ہیں۔ چند جلا وطن یا قید میں ہیں یا پھر اس دنیا سے کوچ کر دیئے گئے اور نشان عبرت بن چکے ہیں۔ پھر بھی آج اکثریت میں مسلمان حکمران اُن سے سبق سیکھنے کے بجائے اپنی اپنی دولت دیار غیر میں چھپا کر جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور 100 فیصد حکمران وہ دولت خود استعمال نہیں کر سکے ہیں یا وہیں جمع رہی یا پھر ان کے

مرنے کے بعد اس ملک کو لوٹا دی گئیں۔

ایسے نفسا نفسی کے دور میں آج بھی ایک ایسے حکمران جس کا تعلق جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں ہوتا ہے۔ اس ریاست کا نام یورو گوئے ہے جس کی آبادی 35 لاکھ سے بھی کم ہے اس کے نئے منتخب صدر جوسی موجیکا (Jose Mujica)۔ یکم جنوری 2010ء کو اقتدار میں آئے تو یورو گوئے کا شمار بھی کرپٹ ترین ریاستوں میں ہوتا تھا۔ صرف ڈھائی سال میں ان کی ٹیم جس میں ان کی اہلیہ بھی شامل ہیں جو خود سینیٹر بھی ہیں نہ صرف کرپشن ختم کی بلکہ آج اس ریاست کا شمار کرپٹ ریاستوں میں آخری نمبر پر آچکا ہے یہی کافی نہیں۔ ان کی سرکاری تنخواہ 12500 ڈالر ہے جبکہ وہ صرف 1250 ڈالر یعنی 10 فیصد وصول کرتے ہیں بقایا 90 فیصد تنخواہ وہ اور ان کی بیگم غریب اور فلاحی تنظیموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خود 1987 ماڈل کی گاڑی چلاتے ہیں کوئی باڈی گارڈ نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی قسم کا پروٹوکول رکھتے ہیں۔ عام شہریوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے ہیں۔ سرکاری محل بھی انہوں نے غریبوں کے لئے وقف کر دیا ہے اب اس میں غریب و غرباء رہائش پذیر ہیں اور وہ اپنے ذاتی فارم ہاؤس میں رہتے ہیں۔ 1973ء جب یورو گوئے میں فوجی انقلاب آیا تھا اس وقت سے لیکر 1985ء تک فوجی دور میں ان کے انقلابی خیالات کی وجہ سے انہیں قید خانے میں رکھا گیا ان کی پارٹی جب یکم مارچ 2010ء میں برسر اقتدار آئی تو 90 فیصد نشستیں جیت کر آئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھایا، ملک سے غربت، کرپشن کا خاتمہ کر کے آج انہوں نے دنیا بھر میں غریب ترین صدر کا خطاب پایا۔ ان کی غربت کا اندازہ لگائیے نہ ان کا کوئی بنک اکاؤنٹ ہے اور نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا قرضہ لے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی قوم میں بہت مقبول ترین شخصیت کا درجہ پا چکے ہیں۔ عوام ان کا احترام اپنے گھر کے فرد کی طرح کرتے ہیں ان کے کوئی مشاغل بھی نہیں صرف اپنے پالتو کتے کو لیکر جب سڑکوں پر گھمانے نکلتے ہیں تو ان میاں بیوی کو دیکھ کر عوام ان کے احترام میں باادب کھڑے ہو کر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی

سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہے عوام سے خوف کیسا۔ ان کی عمر 77 سال ہو چکی ہے مگر یہ جوڑا ابھی تک اولاد سے محروم ہے۔ مگر انتہائی سادگی کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔ دونوں میاں بیوی صحت مند اور بے خوف رہتے ہیں، بہت کم میڈیا میں آتے ہیں، بہت کم انٹرویو دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ جو 10 فیصد سرکاری تنخواہ وصول کرتے ہیں وہ بھی بہت زیادہ ہے، کیونکہ ان کے ملک میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کی تنخواہ اس سے بھی کم ہے اور وہ بھی تو زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اپنی اکلوتی 1987ء ماڈل گاڑی سے بہت پیار کرتے ہیں اور اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ قرار دیتے ہیں۔

اس چھوٹی ریاست کی قومی زبان اسپینش (Spanish) ہے، 88 فیصد گورے، 4 فیصد کالے اور 8 فیصد مختلف قومیں آباد ہیں۔ 1825ء میں برازیل سے آزادی حاصل کی، 1985ء میں بہت ترقی آئی ان کی 15 ہزار ڈالر فی کس آمدنی ہے۔ کرنسی کا نام پیسو (Peso) ہے۔ 50 ارب ڈالر کی ایکسپورٹ اور 40 ارب ڈالر کی امپورٹ ہے۔ اس ملک میں قومی اسمبلی اور سینیٹ کا نظام ہے۔ قومی اسمبلی، سپریم کورٹ تشکیل دیتی ہے اور سینیٹ ججوں کی تقرری کرتی ہے۔ موجودہ حکومت نے بہت انقلابی اقدامات کئے جس کی وجہ سے باہر سے سرمایہ کاری ہوئی جس سے غربت کا خاتمہ اور بے روزگاری بھی ختم ہوگئی۔ اس ملک میں بھی کئی سیاسی اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں کبھی فوجی حکومتیں بنیں تو کبھی کولیشن حکومتیں بنتی رہیں، مگر 2009ء میں موجودہ صدر کی جماعت BROAD FRONT نے تنہا سب سیٹیں جیتیں تو ملک میں تعلیم، صحت، سیکورٹی، خارجہ پالیسیاں بنائی گئیں جس سے اس ریاست کا نام کامیاب ریاستوں میں شمار ہونے لگا۔ ملک کا قانون بنانے میں انہوں نے سوئٹزرلینڈ کے قوانین سے مدد لے کر تشکیل دیا ہے۔ کیا ایسا غریب صدر ہمیں بھی میسر آسکتا ہے؟ اس حکومت کے آنے کے بعد 10 سال تک تعلیم مفت اور لازمی قرار دی جا چکی ہے جو وزارت تعلیم اور کلچر کے ذمہ ہے، تمام مذہبی آزادی ہے، فوج کی تعداد کم کر کے صرف 14000 کر دی گئی ہے جن میں زمینی، سمندری اور ہوائی افواج شامل ہیں۔

کینیڈا میں جنت کے مزے اور عید

3 ہفتے پہلے امریکہ اور کینیڈا آیا تھا ایک ہفتہ امریکہ میں رکنے کے بعد ارادہ تھا کہ صرف ایک ہفتہ کینیڈا میں اپنے صاحبزادوں اور انکی فیملی کے ساتھ گزاروں گا جو گذشتہ 4 پانچ سال سے پاکستان میں دہشت گردی اور افراتفری کے سبب یہاں منتقل ہو گئے تھے۔ جس دن یہاں پہنچا تو حسب عادت صبح اخبارات کا بذریعہ انٹرنیٹ مطالعہ کیا۔ قارئین کی اطلاع کے لئے کینیڈا اور پاکستان میں گرمیوں میں 10 گھنٹے اور سردیوں میں 9 گھنٹے کا فرق ہے۔ کینیڈا ہم سے وقت کے لحاظ سے 9 دس گھنٹے پیچھے ہے۔ تمام اخبارات سوات کی ملالہ پر قاتلانہ حملے کی سرخیوں سے بھرے پڑے تھے۔ بہت دکھ والم سے بس میں سے اتار کر اس معصوم لڑکی پر گولیوں کی بوچھاڑ کی بزدلانہ واردات پڑھی۔ قوم کا غصہ اور طالبان کے دعوے اور دلائل پڑھے اس وقت حیرت ہوئی کہ جب میری پوتی یہاں شام کو اسکول سے لوٹی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ پاپا سوات میں ملالہ کو کیوں مارا۔ ہمارے اسکول کی لڑکیاں ہم سے سوال کر رہی تھیں کہ تم پاکستانی کتنے ظالم ہو کہ معصوم لڑکیوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بھلا ہمیں کیا پتہ کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے ہم کو یہاں آئے ہوئے 5 سال ہو چکے ہیں۔ ہم کو ابھی تک پاکستان میں ہونے والے واقعات کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ہر کوئی ہم پر آوازیں کستا ہے ہم مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کے دل میں نفرت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ البتہ یہاں کے قانون کے مطابق کھل کر اظہار نہیں کرتا، اس معصوم

پوتی کو میں کیا جواب دیتا صرف یہ کہا کہ افغانستان کی جنگ میں پاکستان کو ساتھ دینے کی سزا مل رہی ہے اب تو پورا ملک دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے۔ دوسرے دن میری بیٹی جو 3 سال سے انہی حالات کی وجہ سے لندن منتقل ہو چکی ہے اس کا فون آیا اُس نے بھی بتایا کہ اس کی بیٹی جو وہاں اسکول میں پڑھتی ہے ان کی ٹیچروں نے ملالہ کے متعلق اسکول کے بچوں کو آگاہ کیا اور اس واقعہ کی مذمت کی نہ ہماری حکومت نے اس واقعہ سے لاتعلقی ظاہر کی اور وزیر داخلہ کا عجیب بیان یہاں کا میڈیا بار بار دکھاتا رہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ کس نے یہ کاروائی افغانستان سے سوات میں آ کر کی ہے۔ جبکہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے وزیر داخلہ ان ملزمان سے لاعلم ہیں۔ وہ مرکز سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو ایسی بھیانک کاروائی کرنے کے بعد روپوش ہیں۔ پوری دنیا میں اتنا پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کبھی نہیں ہوا جتنا ملالہ کو مرکزی کردار بنا کر ہر شخص ہم پر تھوتھو کر رہا ہے اور خود یہاں تمام پاکستانی بھی حیران و پریشان ہیں۔ آخر ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں کو کیا ہو گیا ہے جو پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرا کر کبھی دہشتگردوں، کبھی طالبان یا شدت پسندوں کو آگے کر کے اپنی اپنی جانیں بچا رہے ہیں اور ہماری عوام کو سانپ سونگھ گیا ہے، غیرت مر گئی ہے، ہر طبقۂ فکر الگ الگ نقطہ پیش کر رہا ہے۔ کوئی پاکستان میں آنے والے الیکشن سے حکمران بھاگنا چاہتے ہیں تو حزب اختلاف الیکشن میں ناکامی سے بچنے کے لئے خاموش تماشائی ہے۔ ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ یہاں کا میڈیا ہمارے واقعات کو اپنی مرضی کا رنگ بھر کر اپنے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے تو یہاں کے عوام اس کو سچ سمجھ کر ہم کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کینیڈا میں لاکھوں پاکستانی اب کینیڈین شہریت حاصل کر کے بڑی پُرامن زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں پر مذہب کی مکمل آزادی ہے، یہاں مسلمانوں کو اپنے اپنے مسلک کے مطابق طور طریقے اپنانے کی آزادی ہے۔ حتیٰ کہ مساجد اور امام بارگاہوں کو بنانے اور عبادتیں کرنے کی بھی آزادی ہے۔ محرم الحرام میں تعزیے، ماتمی جلوس تک سڑکوں پر اجازت ناموں اور

ٹائم ٹیبل کے ساتھ نکالنے کی آزادی ہے۔ یہاں بہت سی مساجد، گرجے خرید کر مسجدوں میں تبدیل کر کے نمازیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسلامی اسکول تقریباً ہر مسجد میں قائم ہے جس میں انگریزی کے ساتھ عربی اور قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے البتہ ہمارے پاکستانی بچے اردو کی تعلیم سے محروم ہیں۔ اب وہ صرف اردو بول سکتے ہیں مگر لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ یہاں تقریباً 15 بیس اخبارات ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں جو بالکل مفت گروسری کی دوکانوں میں رکھے جاتے ہیں جو ہر شخص جتنے اخبار چاہے اٹھا سکتا ہے ان اخبارات میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے اور ان اشتہارات سے اخبار چلتا ہے۔ یہاں بھی پاکستان کی طرح تعویز، پیر فقیری، اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ اتنے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود پاکستانی خواتین خصوصاً ان اشتہارات سے متاثر ہو کر ان سے رجوع کرتی ہیں۔ ٹی وی بھی تمام پاکستانی چینلز آزادی کے ساتھ قیمتوں کے عوض آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آج کل جادو نام کی ایک ڈیوائس کے ذریعے گھر گھر ٹی وی چینلز دیکھے جاتے ہیں، بھارتی چینلز بھی یہاں پاکستانی خواتین بڑے اہتمام، انہماک سے دیکھتی ہیں۔ بالکل پاکستانی خواتین کی طرح عورتوں کا اسٹار پلس یہاں بہت مقبول ہے، مردوں میں جیو ٹی وی بہت مقبول ہے۔ پاکستانی خبروں کا سارا دارومدار اس چینل پر ہوتا ہے۔ پاکستان میں ہر روز ایک نیا اسکینڈل اخبارات کی زینت اور ٹی وی پر بریکنگ نیوز بنتا ہے۔ وقت گزارنے کے لئے عوامی سیاسی ناکرے بھی دیکھے جاتے ہیں اور پاکستانی سیاستدانوں اور حکمرانوں کی تکرار سے بیزار ہو چکے ہیں۔ آج کل شہباز شریف کے بیٹے کی دعویدار منکوحہ عائشہ احد کے اور ان کے داماد کی بیکری کے ملازمین کی پٹائی اور پھر گرفتاری موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ یار لوگ ہر دو صورتوں میں اگر شہباز شریف اُن کو قانون کے حوالے کرتے یا نہ کرتے، مورد الزام ٹھہرائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ سارا معاملہ ان کی صاحبزادی کی دھونس اور دھمکیوں کا نتیجہ تھا جو فوٹیج میں بہت واضح ہے ان کو بچا لیا مگر شامت داماد کی آئی ہوئی ہے۔ چلتے ہیں یہاں کہ پاکستانیوں پر گزشتہ 2 ہفتوں سے حکومت پاکستان کے ناعاقبت

اندیشوں نے موبائل فون پر 8 پینس بھی تقریباً ساڑھے سات روپے سرچارج لگا کر ظلم کی انتہا کر رکھی ہے۔ یہ صرف ہمارے پاکستان کے وزیر خزانہ کی اختراع بتائی جاتی ہے جو انہوں نے یک لخت، یکطرفہ پاکستان کالیں کرنے والوں پر لگائی ہیں۔ نہ بھارت اور بنگلہ دیش نے ایسا کیا اس وجہ سے پاکستان تمام انٹرنیشنل کالز سینٹر کی لسٹ سے تمام دنیا میں کٹ گیا ہے اور بدنامی الگ ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ کال سینٹر اپنی کمرشل میں بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کو یکجا کر کے 1 دو پینس میں فی منٹ فروخت کرتے ہیں جو ایڈوانس بکنگ کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب جب پاکستانی حکومت نے سرچارج 8 پینس فی منٹ لگایا تو انہوں نے اپنی پاکستانی کالوں پر 8 پینس اضافہ کر کے پاکستانیوں کے لئے مہنگی کالیں کر دی ہیں۔ اس طرح تمام پاکستانی جو دیار غیر میں رہتے ہیں پاکستانی حکومت سے سخت نالاں ہیں۔ اس جگا ٹیکس کو ختم کرنا چاہئے اور جس نے بھی یہ ظلم کیا ہے اس کے خلاف کاروائی ہونی چاہئے۔ قائد تحریک الطاف حسین صاحب نے اس کی مذمت بھی کی مگر حکومت پاکستان ابھی تک خاموش ہے۔ لندن ہائی کمشنر نے بھی یو کے کے پاکستانیوں کو یقین دلایا ہے کہ حکومت جلد یہ سرچارج واپس لے لے گی۔ مگر جس کو آج کل میں فون کرنا ہو وہ کیا کرے؟ اب موبائل فونز ہی رابطے کے لئے موزوں طریقے سمجھے جاتے ہیں۔ حکومت اس کو بھی کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ کینیڈا میں پُرسکون دن گزارنے کی وجہ سے اب یہاں سے پاکستان واپسی کا دل نہیں چاہتا۔ اس ہری بھری جنت کو چھوڑ کر کراچی میں جہاں آج بھی دہشت گرد دن دیہاڑے قتل عام کرتے پھر رہے ہیں کیسے واپس جایا جائے؟ عید انشاء اللہ کینیڈا میں ہی گزرے گی کم از کم قربانی تو اطمینان سے ہوگی۔ کوئی کھالیں نہیں چھینے گی، گوشت بھی محفوظ رہیگا۔

کینیڈا کے ایک دوست کا مشورہ

میرے ایک مخلص دوست جو گذشتہ 20 پچیس سال سے کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔جن کا تعلق کراچی کے صنعت کاروں میں ہوتا تھا مگر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ہونے والے کراچی کے ہنگاموں سے تنگ آ کر پاکستان سے نقل مکانی کر گئے تھے۔اکثر مجھے ای میل کے ذریعے اپنے اور کینیڈا میں رہنے والے پاکستانیوں کے خیالات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔اور جب بھی راقم کینیڈا جاتا ہے تو وہ بڑے خلوص کے ساتھ ملتے ہیں اور اپنی دعوتوں سے نوازتے بھی ہیں۔آج ان کی ای میل ملی تو وہ بہت ناراض سے لگے۔اگر چہ اس سے پہلے بھی وہ جب شیخ الاسلام علامہ طاہر القادری صاحب نے کینیڈا سے اچانک پاکستان آ کر جو سیاسی دنگل اور اسلام آباد میں حشر نشر کیا اس پر بھی بہت ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ اور جب ہمارے چیف جسٹس جناب افتخار محمد چوہدری صاحب نے غیر ملکی پاسپورٹ رکھنے والے پاکستانیوں پر زمین تنگ کی اور انہیں نااہل قرار دیا تو وہ اس سلسلے میں اپنی ذاتی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عدلیہ کو اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے کیونکہ غیر ملکی پاسپورٹ اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔اس کیلئے 5 دس سال اس ملک میں گزارنے پڑتے ہیں اور تعلیم، نوکریاں اور اچھے اچھے کام کرنے پڑتے ہیں۔ان تمام مشکل مراحل سے گزر کر ہی وہاں کی شہریت ملتی ہے۔اپنے خاندان، گھر والوں، بیوی بچوں، دوست اقارب سے دور رہ کر سردی گرمی، اجنبی لوگوں میں رہ کر ان کے طرح طرح کے کھانے، بدمزاج لوگوں

کے طعنے سن کر ان کو غیر ملکی پاسپورٹ ملتا ہے۔پھر پاکستان کی محبت میں یہی غیر ملکی پاسپورٹ رکھنے والے ان تمام ملنے والی غیر ملکی آسائشوں کو چھوڑ کر پاکستان کی محبت میں اقارب داروں کی رفاقت کی خاطر واپس پاکستان آتے ہیں۔اپنی تعلیمات کا نچوڑ اپنے مسلمان بھائیوں میں پھیلاتے ہیں۔خواہ وہ تعلیم کے میدان کے ماہر ہوں یا پھر ڈاکٹرز، پروفیسرز، سرجن، انجینئر ہوں پاکستان کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔بہت سے لوگوں کو تو ان کے مالکان لاکھ روکتے ہیں، ڈراتے ہیں کہ پاکستان جا کر کیا کرو گے۔نہ وہاں اتنی اچھی نوکریاں ملیں گی، نہ اتنی اچھی تنخواہیں، آسائشیں ملیں گی اور اب تو پاکستان میں تمہاری آبرو، دولت اور جان و مال بھی محفوظ نہیں ہے، پھر کیوں واپس جا رہے ہو۔مگر شاباش ہے ان محبّ وطن پاکستانیوں پر، سب کچھ بُرا جانتے ہوئے ان کی پیش کش ٹھکرا کر نئے سرے سے پاکستان کے عوام کی خدمت کرنے کی خواہش لے کر پاکستان لوٹتے ہیں تو ان کو کیا ملتا ہے۔ان ممالک میں وہ ڈالروں، پاؤنڈ اور یورو میں کھیل رہے ہوتے ہیں مگر وہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد پاکستان کو ترجیح دیتے ہیں۔ہم ان کی ان قربانیوں کو بھلا کر اگر انہوں نے سیاست میں حصہ لیا تو ہم ان کو آج ذلیل کرنے میں تُلے ہوئے ہیں۔غیر ملکی پاسپورٹ تو صرف آنے جانے کی سہولت کا کام دیتا ہے۔وہ ان سے پاکستانی ہونے کا ثبوت تو زائل نہیں کرتا۔خود سوچیے اگر انہیں غیر ملکی کہنے اور کہلوانے کا شوق ہوتا تو بھلا وہ پھر پاکستان کیوں آتے۔دیارِ غیر میں انہیں کس چیز کی کمی تھی۔ان کو پاکستان آنے کیلئے کس نے ورغلایا تھا۔وہ کونسی کشش تھی جو ان کو پاکستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔وہ صرف اور صرف پاکستانی خون تھا جو ان کو پاکستان واپس لانے کیلئے ان کے ضمیر کی آواز تھی۔جس مٹی نے ان کو سب کچھ دیا انہوں نے اس مٹی کا حق ادا کیا۔وہ آگے لکھتے ہیں خدارا ان پاکستانیوں کو سیاست میں آنے کے بعد صرف پاسپورٹ کی وجہ سے باہر نہ کریں۔ان کا تجربہ اور خلوص دیگر سیاست دانوں سے بہت بہتر ہے اور قوم کو ان کے تجربے سے مستفید ہونے دیں۔اگر سیاستدانوں کو جن کے پاس غیر ملکی شہریت ہے وہ نااہل ہیں تو ہزاروں غیر

ملکی شہریت رکھنے والے ڈاکٹرز، انجینئرز اور پروفیسرز کو بھی نا اہل قرار دینا چاہیے اور ان کے تعلیمی سرٹیفکیٹ بھی منسوخ ہونے چاہیں۔صرف سیاستدان ہی کیوں؟ غیر ملکی پاسپورٹ رکھنے والوں کی شق آنے والے الیکشن سے بھی قومی اسمبلی اور سینٹ سے منظور کروا کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کروا دیں۔اور آخر میں لکھتے ہیں کہ دیارِ غیر میں پاکستانیوں کو ووٹ دینے کے حق کا کریڈٹ سپریم کورٹ کو جاتا ہے۔ کم از کم ہم اپنے آپ کو فخریہ پاکستانی سمجھ کر اپنا ووٹ استعمال کر سکیں گے۔اس کیلئے ہنگامی اقدامات کر کے اس آنے والے الیکشن کیلئے ممکن بنا دیں۔68 سال بعد یہ ہمارا بنیادی حق دیر ہی سے سہی بحال تو ہوا ۔مگر اس کا استعمال ابھی تک شک و شبہات کا شکار ہے۔لاکھوں پاکستانیوں کو دیارِ غیر میں خدارا اس حق کو ضرور استعمال ہونے کا موقع فراہم کر کے ان کی دعاؤں کو سمیٹیں۔ویسے بھی یہ الیکشن ابھی تک خواب بنے ہوئے ہیں۔پورے ملک میں افراتفری، دہشت گردی، قتل و غارت ہمارے سہمے ہوئے پاکستانی عوام ان دھماکوں، دھرنوں سے نکل کر پولنگ اسٹیشن کیسے جا سکیں گے۔جہاں پولیس بے بس، رینجرز خاموش اور فوج تماش بین بن چکی ہے۔جسے ہزاروں بے گناہوں کا خون جو روز کراچی اور بلوچستان میں بہہ رہا ہے بالکل نظر نہیں آتا۔خفیہ ہاتھوں کا گھناؤنا کھیل ہر پاکستانی کو ہلا چکا ہے۔ہمارے رکھوالوں کو کیوں بے حس کر رکھا ہے۔آنے والے دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچے گا۔اس خون کا کون حساب دے گا۔سرحد سے باہر کی حفاظت سے زیادہ اب سرحد کے اندر کی حفاظت کی ضرورت ہے۔اگر الیکشن فوج کی نگرانی میں نہیں ہوئے تو پھر پولنگ اسٹیشنز کا اللہ حافظ ہوگا۔اس ای میل کے آخر میں میرے دوست نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ محسن قوم ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو مشورہ دیں کہ خدارا آپ اس پاکستان کی سیاست میں اپنے پاک قدم نہ ڈالیں جو ہمارے سیاست دانوں کی وجہ سے عوام کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ قوم ان کا احترام بھی عبدالستار ایدھی کی طرح کرتی ہے جنہوں نے کبھی اس گندی خون آلود سیاست سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا۔آپ بھی اس سے دور رہیں۔اللہ آپ کی حفاظت کرے آمین۔

برف سے بنا ہوا ہوٹل

ہمارا ملک پہلی مرتبہ ایک جمہوری حکومت کے 5 سال مکمل ہونے کی تاریخ مرتب کر رہا تھا کہ اس دوران ہر طرف سے فوج کو ماضی کی طرح دعوت دی جا رہی تھی۔آیئے اور پی پی پی کی حکومت کو ختم کر کے اقتدار سنبھالیں۔مگر آفرین ہے ہمارے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی صاحب کو کہ وہ آنکھ اور کان بند کیے اپنے کام میں لگے رہے اور اس طرح 5 سال مکمل ہو گئے۔نگران حکومت ابھی تک نہیں آ سکی۔شاید میرے کالم کے چھپنے تک معاملہ طے ہو جائے۔مگر اس وقت بھی قوم کراچی میں عباس ٹاؤن، پشاور میں خودکش حملے، بلوچستان میں ہزارہ بستیوں کی تباہی سہہ رہی تھی کہ ایسے میں پنجاب میں جہاں امن و امان ہر لحاظ سے بہتر تھا۔یکا یک مسیحی برادری والے علاقے بادامی باغ میں 150 گھروں کو آگ لگا کر پوری قوم کو دنیا کے سامنے بدنام کر دیا۔بھلا مسلمان بھی ایسا گھناؤنا کام کر سکتے ہیں؟ قوم شرمسار ہے مگر کام کرنے والے آزاد گھوم رہے ہیں۔پھر ہمارے شیخ الاسلام واپس پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔کینیڈا شاید پہلے اتنا زیادہ مشہور نہیں تھا مگر چند سال قبل جب ہمارے شیخ الاسلام نے اس ملک کی شہریت لی اور وہاں 7 آٹھ سال بھی گزار لیے تو عام آدمی بھی کینیڈا سے واقف ہو گیا۔اتفاق سے میں بھی امریکا، کینیڈا اور برطانیہ کاروبار کے سلسلے میں جاتا رہتا ہوں۔ مجھے چند ماہ قبل کینیڈا کے شہر مارخم کے میئر جناب مسٹر فرانک سے ایک تقریب میں ملنے کا اتفاق ہوا۔وہ

ہمارے ادارے کی کارکردگی سے واقف تھے ۔ کیونکہ ہماری پراڈکٹس دنیا میں جہاں جہاں پاکستانی رہتے ہیں وہاں ہر پاکستانی گروسری شاپ میں دستیاب ہوتے ہیں ۔انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ کینیڈا میں بھی اپنی مصنوعات بنائیں ۔ایک دعوت نامہ مجھے بھیجا اس لیے کینیڈا کے مئیر کی دعوت قبول کر کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا میں مارچ ہالیڈے ہوگئی ہے ۔یہاں میری فیملی بھی رہتی ہے تو ان کے ساتھ مارچ ہالیڈے منانے کے لئے ہم نے صرف 1 ہفتے کا پروگرام ترتیب دیا ۔ہفتہ کی صبح ہم نے 1800 کلومیٹر جانے کا پروگرام مارکھم سٹی سے شروع کیا ۔250 کلومیٹر کے بعد کنگسٹن (Kingston) میں جو ایک خوبصورت جھیل نما جزیرہ ہے ۔ہم نے وہاں پہنچ کر مچھلی کے شکار کا پروگرام رکھا ۔کینیڈا میں مچھلی کے شکار کے لئے بھی لائسنس لینا پڑتا ہے جو با آسانی آن لائن مل جاتا ہے ۔مگر ایک شرط اس میں ہوتی ہے کہ آپ صرف 3 مچھلیاں ہی ایک وقت میں شکار کر سکتے ہیں اور اگر آپ کے جال میں چھوٹی مچھلی آجائے تو آپ اس کو واپس سمندر یا جھیل میں ڈال سکتے ہیں یا پھر آپ شام تک مچھلی پکڑتے رہیں اور پھر اس کو کانٹے سے نکال کر واپس سمندر یا جھیل میں چھوڑتے رہیں ۔ اتفاق سے 2 گھنٹوں میں ہماری ڈور میں کوئی مچھلی نہیں آئی اور کینیڈا میں ہم جیسے سینئر شہریوں کے لئے لائسنس کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔یہاں سے مایوس ہو کر ہم کینیڈا کے دوسرے شہر مانٹریال پہنچے ، میں یہ بتانا بھول گیا کہ آج کل یہاں کا درجہ حرارت منفی 4 سے لیکر منفی 17 تک ہے ۔اس وجہ سے ہمارے تمام راستے میں ہر طرف برف ہی برف نظر آتی ہے حتیٰ کہ جھیلیں بھی جم چکی ہیں ۔ یہاں سے ہم اپنی اصلی جگہ کیوبک شہر پہنچے جہاں ہم نے مشہور ترین جگہ یعنی برف سے بنے ہوئے ہوٹل کو دیکھنا تھا اور ساتھ ساتھ اس شہر کیوبک کی برف سے ڈھکی پہاڑیوں جہاں چیئر لفٹ بھی لگی ہوئی ہیں اس کا بھی نظارہ کرنا تھا ۔تمام دن سفر کر کے ہم کیوبک سٹی پہنچ گئے ۔بہت تھکان تھی ، کھانا کھا کر ہوٹل میں سو گئے مگر دوسرے دن جب اٹھے تو ہر طرف برف کی پہاڑیاں ، خوبصورت ریسٹورنٹ اور ہوٹل تھے پھر ہم اس برف سے

بنے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے جو کیوبک سٹی سے 30 کلومیٹر پر واقع تھا ۔وہاں پہنچ کر ہم کو اس برف کے ہوٹل (Ice Hotel) کو صرف دیکھنے کے لئے فی کس 17 ڈالر یعنی 1700 روپے دینے پڑے ۔ یہ ہوٹل جنوری میں ہر سال تیار کیا جاتا ہے اس میں صرف برف کی سلیں یعنی پانی سے جما کر بنائی جاتی ہیں ، کیونکہ اس دوران کیوبک سٹی کا نقطۂ انجماد منفی ہوتا ہے تو یہ ہوٹل تعمیر ہو جاتا ہے اور جب مارچ کے آخر میں کیوبک سٹی کی برف پگھلنے لگتی ہے تو یہ ہوٹل خود بخود بند ہو جاتا ہے ۔اس ہوٹل میں صرف جنوری اور مارچ کے دوران دنیا بھر سے لاکھوں افراد آتے ہیں جس سے اس ہوٹل کو زبردست زرمبادلہ ملتا ہے مگر اس ہوٹل میں رہنے کے لئے بہت ہی کم لوگ تیار ہوتے ہیں ۔اس برف سے بنے ہوئے کمرے میں برف کی سلوں پر ایک پلاسٹر چڑھا ہوا میٹ ڈالا ہوا تھا ، کمروں پر صرف پردے پڑے ہوئے تھے اور رات 8 بجے سے صبح 8 بجے تک لوگ سو سکتے تھے ۔اس کا کرایہ فی رات 200 ڈالر تھا ، رات سونے کے لئے انتظامیہ ایک خصوصی بیگ دیتی ہے جو آپ پہن کر سو سکتے ہیں ۔تمام راستے ہوٹل کے برف کے بنے ہوئے ہیں ، حتیٰ کہ باتھ روم بھی برف کے بنے ہوئے ہیں ۔اگر آپ چائے یا مشروب طلب کریں تو اس کے لئے بھی برف کے بنے ہوئے گلاس ہیں ۔چونکہ سارا دن ٹورسٹ آتے ہیں تو ان کے لئے برف کی بنی ہوئی سلائیڈز بھی ہیں یہاں بچے بہت انجوائے کرتے ہیں ۔اس برف والے ہوٹل میں 90 فیصد لوگ صرف اس کو دیکھنے آتے ہیں ، عام طور پر 2 گھنٹے سے زیادہ ہوٹل میں کوئی نہیں رک سکتا صرف فوٹوگرافی یقیناً بہت اہم ہے یہ ہوٹل خود بخود مارچ 24 کو تحلیل یعنی ختم کر دیا جاتا ہے ۔مگر یہ واقعی دنیا کی ایک عجوبہ چیزوں میں سے ہے جو کینیڈا والوں نے برسوں سے اس کو ہر سال نہ صرف اپنے عوام کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک اٹریکشن بنایا ہوا ہے ۔یہاں سے فارغ ہو کر تیسرے دن کینیڈا کے ایک شہر پرنس ایڈورڈ آئس لینڈ ہے ، وہاں پہنچے جہاں زبردست سمندری ساحل ہیں اس کی سب سے خوبصورت اور تاریخی تقریباً 12 کلومیٹر لمبی ، ڈبل ٹریک برج ہے ۔یہاں

بھی لاکھوں سیاح گرمی میں آتے ہیں یہ بہت تاریخی شہر ہے اس شہر کے باشندوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ان کی یادگاریں یہاں موجود ہیں مگر اس شہر میں بدقسمتی سے مسلمان نہیں رہتے تو یہاں حلال کھانے کا کوئی خیال بھی پایا نہیں جاتا۔اگر آپ صرف اس سمندری علاقے کو انجوائے کرنا چاہتے ہیں تو سمندری غذا یعنی سی فوڈ زاس علاقے سے بہتر آپ کو نہیں ملے گا۔ 2دن ہم یہاں رکنے کے بعد واپس ٹورنٹو روانہ ہوئے 1800 کلومیٹر واپسی کا سفر تھا، پھر صبح سے رات تک ہم اس علاقے کی خوبصورتی ،سمندر،جھیلیں، پہاڑ انجوائے کرتے ہوئے 5 دن میں ٹورنٹو پہنچ گئے۔راستے اتنے خوبصورت اور روڈ اتنے پائیدار تھے کہ ہم کو تھکن کا احساس بھی نہیں ہوا۔کویا 4000 کلومیٹر آنے اور جانے میں پتا ہی نہیں چلا۔ہم نے برف کا بنا ہوا ہوٹل، پہاڑوں پر چیئر لفٹ، اسکیئنگ ،طویل ترین برج ،برف باری، پہاڑیاں، سمندر،جھیلیں ،مچھلی کا شکار اور کیا چاہئے ؟ہمارے ملک میں ایسے خوبصورت مقامات تو موجود ہیں مگر ہم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔کاش ہمارے سیاستدان سوچیں وہ اس ملک کو صرف دہشت گرد ملکوں میں شمار کرانے میں لگے ہوئے ہیں۔صرف اور صرف اپنے مفادات کی خاطر۔اب جب دوبارہ الیکشن ہونے جارہے ہیں کیا ہم اپنے ملک کی تقدیر کو بدلنے کے لئے بھی تیار ہیں یا صرف گھروں میں بیٹھ کر خود کو اور اپنے ملک کو کوستے رہتے ہیں۔حالانکہ ہمارے ملک نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

پاپا گویا بیچ (Papa Goya Beach)

گذشتہ ہفتے کے کالم میں راقم نے کینیڈا کے شہر کیوبک سٹی کے مشہور برف کے ہوٹل کا ذکر کیا تھا۔پورے کینیڈا میں ابھی تک زبردست سردی کے ساتھ ساتھ برف باری اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے ہے مگر تمام کاروبار روزمرہ کی طرح جاری ہیں۔ویک اینڈ پر بڑے بڑے مالز میں عوام سردی اور گرمی دونوں کے کپڑوں کی خریداری میں لگی ہوئی ہے۔سردی کے کپڑوں پر بڑی بڑی سیلز لگی ہوئی ہیں۔تاکہ گرمی آنے سے قبل گرم کپڑے فروخت کر کے گرمی کے کپڑوں کیلئے جگہ دستیاب ہو سکے۔کینیڈا کے سب سے بڑے صوبے "اونٹوریو" کے شہر مارکھم کے میئر نے میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ رکھا اور مارکھم شہر کے متعلق بریفنگ دی اور ایک یادگار شیلڈ مارکھم کے شہریوں کی طرف سے پیش کی۔یہ ایک پاکستانی کیلئے بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔یہاں پاکستانی کمیونٹی کی بہت عزت ہے جن میں صنعتکار، تاجر، ڈاکٹرز، انجینئرز، آئی ٹی اسپیشلسٹ اور نوکر پیشہ افراد کی تعداد 4 لاکھ سے زیادہ ہے جو کینیڈا کی بہت بڑی کمیونٹی میں شمار ہوتی ہے۔دوسرے دن یہاں پاکستان کے قونصل جنرل عزت مآب جناب محمد نفیس ذکریا اور جناب اصغر علی گھولو نائب قونصل جنرل سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی دونوں حضرات یہاں پاکستانیوں میں بہت مقبول ہیں اور پاکستانیوں کیلئے نئے نئے منصوبے تشکیل دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ان کی کوشش ہے کہ پاکستانی صنعت کاروں کو زیادہ سے زیادہ کینیڈا کی منڈی تک

رسائی مل سکے اور پاکستانی مصنوعات کو کینیڈا میں متعارف کرایا جا سکے ۔ یوم پاکستان 23 مارچ کا پروگرام بھی کینیڈا میں منایا گیا جس میں مارکھم کے میئر جناب فرانک بھی شریک ہوئے جو فلیٹو مارکھم تھیٹر میں ہوا جس میں کینیڈا میں مقیم ہزاروں پاکستانیوں نے شرکت کی ۔ جہاں پاکستانی پرچم کشائی ہوئی ۔ مارکھم میں ایک اسپتال کیلئے 1.5 لاکھ ڈالر کا چندہ بھی ان پاکستانیوں نے مارکھم کے میئر کی اپیل پر جمع کرایا خاص طور پر فلیٹو ادارے کے روح رواں جناب شاکر رحمت اللہ صاحب جو میرے عزیز دوست بھی ہیں انہوں نے 25 ہزار ڈالر دینے کا اعلان کیا وہ اس سے قبل بھی 1 لاکھ ڈالر کا چندہ دے چکے ہیں ۔ یہ بہت معروف تعمیراتی ادارے فلیٹو ڈیولپر سے منسلک ہیں اور آئے دن پاکستانی کمیونٹی کی طرف سے اس تھیٹر میں تفریحی پروگرام منعقد کرا کے پاکستانی برادری میں بہت مقبول ہیں ۔

یہاں ایک دوست جو بہت مخلص ہیں امریکہ سے خصوصی طور پر تشریف لائے اور مجھے سینٹرل امریکہ کے ایک سیاحی ملک ''کوسٹاریکا'' کی دعوت دی کیونکہ پورے کینیڈا میں ابھی تک سردی اور برف باری کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی ۔ سوچا ان 5 دن کے تفریحی دورے سے فائدہ اُٹھایا جائے جہاں کا درجہ حرارت نہایت خوشگوار 70 فارن ہائیٹ سے 80 فارن ہائیٹ تک اور خوب مزیدار دھوپ نکلی ہوئی ہے ۔ اور سب سے خوبصورت جزیرے سینٹ جوز (Sant Jose) اور پاپا گویا (Papa Goya) جو لائبیریا میں واقع ہے ۔ ایک ایک دن ان کے سمندری ساحل پہ گزارنے کیلئے کینیڈا سے روانہ ہوئے ۔ یہاں سے ہوائی جہاز سے ساڑھے پانچ گھنٹے لگتے ہیں ۔ خوبصورت ائیر پورٹ سینٹ ہوزے اگرچہ انگریزی میں جوزے لکھا جاتا ہے مگر بولا ہوزے جاتا ہے کیونکہ اس زبان میں (جیم) کو (ھ) پڑھا جاتا ہے ۔ وہاں پہنچتے ہی شام ہو چکی تھی، سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے رات جلدی ہوٹل میں سو گئے تھے صبح سویرے 12 سیٹوں والا سیسنا طیارہ سینٹ ہوزے سے لائبیریا کے ہوائی اڈے پہ اُترا وہاں سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر پاپا گویا کی سمندری سطح پر ایک خوبصورت ہوٹل جو ایک سعودی

شہزادے طلال بن سعود جن کا شمار دنیا کے 10 بڑی امیر ترین شخصیات میں ہوتا ہے ۔ 12 کلومیٹر پر محیط ہے جس میں 250 کمروں پر مشتمل دنیا کا سات ستاروں والا مشہور ہوٹل ''فور سیزن'' ہے ۔ اس کی خوبصورتی کی وجہ 3 طرف سے سمندر میں گھرا ہوا یہ ہوٹل بھی بہت خوبصورت مانا جاتا ہے ۔ جس کے کمروں کے دونوں طرف سے سمندر لگتا ہے ۔ 12 کلومیٹر پر جگہ جگہ ''گالف کورس'' بنے ہوئے ہیں جہاں پوری دنیا کے امیر ترین سیاح پورے سال آتے ہیں ۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ 12 مہینے یہاں کا ساحلی علاقہ دھوپ، بارش اور اچھی آب و ہوا کے ساتھ ساتھ گالف کورس اضافی خصوصیت رکھتے ہیں ۔ اس ہوٹل میں ہر طرح کی غذائیں خصوصاً تازہ سمندری کھانے بہت ہی لذیز طریقے سے فراہم کیے جاتے ہیں ۔ طرح طرح کی مچھلیاں، لابسٹر، جھینگے، کریبس کا تو جواب ہی نہیں ہے ۔ فرائی اور آگ پر سیک کر طرح طرح کے طریقوں سے پکایا جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ ہوٹل شہر سے باہر دور سمندر کے کنارے واقع ہے ۔ تو یہاں ٹھہرنے والے ہوٹل کے کمروں کے ساتھ ساتھ دو وقتوں کا کھانا بھی معہ ناشتہ اس میں شامل ہے جو کم از کم 1000 ڈالر یعنی 1 لاکھ روپیہ روزانہ فی کمرہ یعنی 2 افراد اور اگر 2 بچے ہوں تو بھی 1000 ڈالر وصول کیا جاتا ہے ۔ اگر آپ ڈیلکس کمرہ لیں تو 1500 ڈالر سے 2500 ڈالر روزانہ کا کرایہ لیا جاتا ہے ۔

ہم جب پہنچے تو ابھی تک سیزن شروع نہیں ہوا تھا ۔ اس کے باوجود 90 فیصد کمرے بھرے ہوئے تھے ۔ جرمن، امریکن، جاپانی، کینیڈین البتہ پاکستانی ہم صرف 2 سیاح تھے ۔ یہاں بھی کھانے کا مسئلہ تھا کیونکہ کوئی بھی حلال گوشت یہاں نہیں ملتا ۔ اس کی وجہ بھی یہاں کوئی مسلمان آبادی نہیں ہے ۔ لہٰذا صرف سی فوڈز پر گزارہ کرنا پڑا ۔ اس خطے میں جس ملک میں بھی آپ جائیں پھل فروٹ، سبزیاں، گوشت باہر سے لے جانے کی پابندیاں ہیں ۔ امریکہ اور کینیڈا میں تو سب سے پہلے کسٹم میں ہی سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کوئی پھل، سبزیاں، دودھ اور اس کی اشیاء اور گوشت تو ساتھ میں نہیں لائے ۔ اگر

آپ کا جواب ہاں میں ہوتو وہ فوراً آپ کے سامان سے یہ نکلوا کر ضائع کر دیتے ہیں۔اس کی وجہ اس میں باہر کے جراثیم اندر کے جراثیم سے مل کر (Contamination) سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ خیر ہم ان چاروں دن سبزیاں اور سی فوڈز پر گزارہ کرتے رہے۔سمندر میں نہانے کا مزہ پھر یہاں چھوٹی بڑی کشتیوں میں سیر اور پھر تازہ مچھلیاں پکڑنا ،دن ایسا گزرتا ہے جیسے گھنٹے۔

پھر ہوٹل میں واکنگ ٹریک، تیراکی، دھوپ کا سیکنا جو یورپین اور امریکی کینیڈین ساحلوں پر سردی اور برف باری کی وجہ سے ناممکن ہوتا ہے۔یہاں سارا سارا دن مرد،عورتیں، بچے ،بوڑھے سوئمنگ پول پر یا سمندر کے ساحل پر تیل لگا کر چڈیوں میں گھنٹوں لیٹے رہتے ہیں۔الغرض کھانا ،نہانا سیر وتفریح کیلئے کوسٹاریکا کے سمندری ساحلوں کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔اس طرح کے 10 جزیرے ہیں جن میں 7 قومی پارک ہیں۔جن کو دیکھنے کیلئے سیاح دور دور سے آتے ہیں۔ویزے پر بھی زیادہ پابندیاں نہیں ہیں۔90 دن کا ویزہ 32 ڈالر میں ملتا ہے جو واپسی پر ادا کرنا پڑتا ہے۔سڑکیں ایک شہر سے دوسرے شہر تک لانے لے جانے کیلئے دوطرفہ ہیں۔البتہ یہاں کے ڈرائیور تیز رفتار گاڑی چلانے میں مشہور ہیں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر کیلئے چھوٹے چھوٹے جہاز 7 سے 12 سیٹر صرف آدھے گھنٹے میں پہنچا دیتے ہیں جبکہ 5 سے 6 گھنٹے پہاڑی راستے بھی ہیں مگر وہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔خود ہم نے 30 کلومیٹر کے راستے میں 2 حادثے دیکھے جبکہ ہم شہر میں تھے اور دوپہر کا وقت تھا۔بسیں اور بوٹس بھی ہیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر آتی جاتی ہیں مگر وہ بھی کئی گھنٹوں میں پہنچاتی ہیں۔یہاں کی مقامی زبان اسپینش ہے مگر شہروں میں سیاحوں کی آمد ورفت کی وجہ سے لوگ انگریزی بھی بولتے ہیں۔مقامی کرنسی بھی ایک ڈالر میں 500 کلون ملتی ہے۔شہر میں کھانا زیادہ مہنگا نہیں ہوتا۔عام طور پر 5 ڈالر میں برگر، مرغی ناشتہ ،سینڈوچ مل جاتے ہیں۔مگر یہی کھانا ہوٹلوں میں 20 سے 25 ڈالر میں ملتا ہے۔عوام بے حد ملنسار،

سادہ لوح ہیں۔آپ کو غیر نہیں سمجھتے۔اس کی وجہ سیاحی آمدنی ان کے لیے سب کچھ درجہ رکھتی ہے۔اور وہ آپ سے ٹپ کے منتظر ہوتے ہیں۔الغرض کوسٹاریکا اور اس کی خوبصورت ترین سمندری سطح پاپا گویا کی بیچ جنت نظیر منظر ہے۔یہاں 25 ڈالر سے لے کر جیسا اوپر لکھا ہے ہر طرح کے ہوٹل ہر شہر میں بھرے پڑے ہیں نہ ہوٹلوں کی کمی ہے نہ کھانوں کے ریسٹورینٹس کی اور نہ ہی سیاحوں کی کمی ہے اگر کمی ہے تو صرف حلال کھانے کی۔اس کی اپنی آبادی 40 لاکھ کے قریب ہے۔

ایک بھارتی شادی صرف ایک ارب روپے کی

ملک میں الیکشن کی تیاریاں تو زور نہیں پکڑ رہی تھیں البتہ عدلیہ اور الیکشن کمیشن امیدواروں کی اسکروٹنی میں مصروف تھی۔کئی امیدواروں کے کاغذات نامزدگیاں مسترد ہو رہی تھیں تو کچھ کے کاغذات جعلی ڈگریوں کے باوجود منظور ہو رہے تھے۔ایک طرف سے جیل بھیجا جا رہا تھا تو دوسری طرف ضمانتیں ہو رہی تھیں۔عجب تماشہ عوام کو دیکھنے میں آ رہا تھا۔خصوصاً جب سابق مرد آہن جن کا ہوا میں مکا لہراتا تھا چاروں جگہ سے کاغذات نامزدگی مسترد ہو چکے تھے۔وہ بھی حیران و پریشان تھے کہ یا اللہ یہ کیا ماجرہ رونما ہو رہا ہے۔ابھی تو صرف الزامات کی بھرمار ہے۔عدلیہ نے تو ابھی کاروائی بھی شروع نہیں کی پھر کیوں ان کو ہر طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔حکمران مکافات عمل سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں اور دوران اقتدار ہر جائز ناجائز کام کر گزرتے ہیں اور جب وقت کا شکنجہ ان کو جکڑتا ہے تو وہ واویلہ مچاتے ہیں۔ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔صرف اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے قانون توڑتے ہیں۔راستے کے کانٹے ہٹانے کیلئے قتل سے بھی باز نہیں آتے۔ناجائز کو ناجائز نہیں سمجھتے اور اقتدار کے نشے میں حد سے گذر جاتے ہیں۔آج کے کالم میں میں اپنے قارئین کو ایک اپنے ہمسائے ملک بھارت میں شادی کی کہانی سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ہمارے 2 دوست جو کاروبار میں پارٹنر بھی ہیں ان کے بیٹے اور بیٹی کی الگ الگ جگہ پر شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا جو دِلّی شہر میں ہونی تھی۔ایک دوست جس

کا بیٹا تھا اس کی شادی ملک کے ایک بہت بڑے کاروباری صنعت کار جن کا شمار 20 بڑے صنعت کاروں میں ہوتا ہے۔سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو رہی تھی۔لڑکے کے خاندان کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔لڑکے کا تعلق سندھی فیملی سے اور لڑکی پنجابی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔پہلی شادی کا دورانیہ 3 دعوتوں پر مشتمل تھا۔ہم دلی کے ائیر پورٹ پر اُترے تو ہمارے میزبان کی طرف سے گاڑی اور ڈرائیور ائیر پورٹ کے باہر منتظر تھا۔دِلّی کا ائیر پورٹ شہر سے کافی دور ہے اور بہت بڑا بنایا گیا ہے۔عام طور پر ڈیڑھ 2 گھنٹے لگ جاتے ہیں۔یہاں ہمیں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ہم لڑکے کی طرف سے مگر لڑکی والوں کے اصرار پر تمام مہمان ان کے مہمانوں کے طور پر ٹھہرائے گئے تھے۔جو پوری دنیا سے شرکت کر رہے تھے۔ان کی تعداد 250 سے زیادہ تھی جو اسی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔اسی ہوٹل کا کرایہ بھارتی 25000 روپے روزانہ تھا جو پاکستانی کرنسی میں 50000 روپے روزانہ بنتا ہے۔بھارتی کرنسی میں ڈالر 54 روپے کا ہو چکا ہے جو 40 تک ہوتا تھا۔پہلا دن آرام کا تھا۔ائیر پورٹ سے لے کر ہوٹل تک دِلّی سرکار نے نیا ہائی وے بنا کر عوام کو سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں مگر پھر بھی گاڑیوں کی اکثریت اور بے پناہ ملکی اور غیر ملکی پروازوں کی وجہ سے ٹریفک اکثر جام رہتی ہے۔ہوٹل کی گیلری میں میزبان کی طرف سے ہیلپ ڈیسک بنا دی گئی تھی۔مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے خصوصی عملہ رکھا گیا تھا۔ایک ہال 24 گھنٹے کیلئے ان مہمانوں کی خاطر و مدارت کیلئے بک تھا جن میں ناشتے سے لیکر رات کے کھانے تک کا الگ انتظام رکھا گیا تھا۔دوسرے دن پہلی دعوت لڑکی کے گھر پر تھی۔8 بجے ہم ان کے گھر لڑکے والوں کے ساتھ پہنچے۔بہت بڑی کوٹھی دِلّی کے دل میں واقع تھی جو 10 ہزار گز پر محل نما کوٹھی تھی۔جس کے دونوں طرف ائیر کنڈیشن لان تھے۔9 بجے تک پورا لان بھر چکا تھا جو 3 سے 4 ہزار افراد پر مشتمل تھا۔لڑکی والوں نے خوب دل لگا کر سجاوٹ کی تھی۔امریکہ سے بھی ایک بہت بڑا گلوکار بلوایا جس نے آنے جانے کا کرایہ ٹھہرنے کیلئے فائیو اسٹار ہوٹل کے علاوہ 2 لاکھ

ڈالر لیے تھے۔شروع سے ہی مہمانوں کی اسٹارٹر اور مشروبات سے تواضع ہو رہی تھی ۔ 5 ہلکے پھلکے کھانے، سبزیوں اور 5 گوشت کی ڈشوں پر مشتمل بیرے بار بار آ کر پیش کر رہے تھے۔مشروبات کیلئے بہت لمبا بار بنا ہوا تھا۔اس تقریب میں وزراء، سفراء، بھارت کے وزیر اعظم من موہن سنگھ کے علاوہ تبت اور بھوٹان کے شاہی شہزادے بھی شرکت کر رہے تھے ۔وزیر اعظم ٹھیک اپنے وقت پر آئے ۔ مہمانوں کو ہاتھ ہلہرا کر اسٹیج پر دولہا، دلہن کو مبارک باد دی، فوٹو کھنچوائے اور میزبان کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم کی طرف روانہ ہو گئے ۔ نہ ہمارے ملک کی طرح میلوں سڑکیں بند ہوئیں اور نہ عوام کو دور رکھنے کیلئے سیکورٹی کا گھیرا بنا ۔نہ شور شرابا ہوا، نہ کسی کی جامہ تلاشی ہوئی ، نہ کسی سے موبائل رکھوایا گیا۔ البتہ صرف 10 گز کے فاصلے پر تمام گاڑیوں سے مہمانوں کو اترنے کی گزارش کی گئی ۔بس یہ تھا ان کا پروٹوکول ۔ساڑھے 9 بجے کھانا کھلا ، میں حیران ہو گیا یہ پچھلے لان میں 100 سے زیادہ تو ے لائیو کھانا بنانے اور پیش کرنے میں مصروف تھے۔ہر طرح کے کھانے ،چینی ،کورین، سبزیاں، گوشت، مچھلیاں، جھینگے الغرض شاید ہی کوئی کھانا ہو جو میزبان نے وہاں نہ رکھا ہو۔اس طرح 25 تیس ڈشیں صرف میٹھے کی رکھی گئی تھیں ۔طرح طرح کی آئس کریم الگ تھیں ۔یہ رات کا نظارہ تھا کہ کھانوں کی بھرمار اور اسی دِلّی شہر میں راقم نے صبح ہمارے ساتھ آنے والے میرے دوست جن کے رشتہ دار دِلّی میں رہتے تھے جو پرانا دِلّی کہلاتا ہے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔اور جو سنا تھا دِلّی کی تنگ گلیاں تو واقعی دیکھی جو بالکل نئی دِلّی کا الٹ منظر پیش کر رہی تھیں ۔ان تنگ گلیوں سے پیدل گزر کر کیونکہ یہاں گاڑیاں اندر نہیں آ سکتی تھیں ۔چند گلیاں تو 2 ڈھائی فٹ کی تھیں ۔پرانی بوسیدہ عمارتیں جن سے ہیبت آ رہی تھی بدبو سے اٹی ہوئی تھیں ۔ یہاں گلی میں گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے ۔گدھا گاڑیوں کے بھی ریڑھے تھے ۔ہاتھ گاڑیوں اور ہاتھ کے رکشے سے پبلک آ جا رہی تھی ۔اپنے اس پاکستانی دوست کی خاطر جو غالباً وہ خود بھی محسوس کر رہے تھے اپنے غریب رشتہ دار سے ملنے ان کی رہائش گاہ تک پتہ پوچھتے پوچھتے

آخر کار پہنچ گئے ۔موصوف ایک کوٹھڑی نما ڈیڑھ کمرے پر مشتمل 60 سال سے رہائش پزیر تھے۔چونکہ ان کو فون پر آنے کی اطلاع دے دی تھی تو وہ صبح سے ہی ہمارے منتظر تھے مگر ہم شام تک پہنچے ۔اس کی وجہ دِلّی کی سخت لوو الی گرمیاں شروع ہو چکی تھیں ۔دن میں نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ہمارے میزبان جو بوڑھے میاں بیوی تھے۔جن کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی مل کر بہت خوش ہوئے ۔انہوں نے بہت خاطر مدارت کی مگر ہم سے تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ڈر لگ رہا تھا کہیں یہ بوسیدہ چھت گر نہ جائے ۔غربت سے بھری پرانی دِلّی کے رہنے والوں پر ترس آ رہا تھا۔گلیوں میں ننگے بھوکے بچے، ہڈیاں نکلی عورتیں، مرد دِلّی کے امیروں کا مذاق اُڑا رہے تھے ۔اس سے باہر نکل کر چوڑی چوڑی سڑکیں اور کہاں یہ تنگ گلیاں کیسا تضاد صرف چند میل کے فاصلے پر دیکھنے میں آ رہا تھا ۔ان جھگی نشینوں کیلئے سرکار نے مفت راشن کارڈوں کا اجراء کر رکھا ہے ۔سستے داموں دال، چاول، دودھ اور پتی بھی ان کو مہیا کی جاتی ہے ۔بعض علاقوں میں تو مفت بجلی بھی فراہم کی جاتی ہے ۔یہاں سے ہم محلّہ نظام الدین پہنچے اور مفت کھانا بٹوانے کیلئے مزار کے پچھواڑے جہاں غریب فقیروں کا جھمگھٹا رہتا ہے ۔ہوٹل والے کو پیسے دیئے جس نے ایک گوشت کی پلیٹ اور 3 روٹیوں کے 25 روپے فی کس لیے اور ان فقیروں کو کھانا دینا شروع کیا۔ ان بھوکے فقیروں کی خوشی قابل دید تھی ۔کچھ فقیروں نے پیسوں کی فرمائش کی غلطی سے ہم نے ان کی غربت دیکھتے ہوئے 50 پچاس کے نوٹ نکالے تو تمام فقیر کھانا چھوڑ کر ہماری گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی مشکل سے کپڑے بچاتے ہوئے ہمارے ڈرائیور نے پھرتی دکھائی اور گاڑی دوڑا دی۔کچھ فقیر مرد عورتیں اور بچے تو گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے۔رات کو سردار جی کے کھانوں کی قطاروں کو دیکھ کر دن کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا کہ یا اللہ ایک طرف کھانا بچ کر پھینکا جا رہا ہے تو دوسری طرف تیری ہی مخلوق کھانے کیلئے ترس رہی ہے ۔دوسرے دن لڑکے والوں کا کھانا تھا وہ بھی 10 بارہ کھانوں اور 10 بارہ میٹھوں پر مشتمل تھا ۔تیسرے دن آخری لڑکے والوں کا ولیمہ تھا ۔سردار جی کے گھر پر

بھی 50 کھانوں سے کم نہیں تھا۔ وہی مہمانوں کی تعداد ہزاروں میں کہتے سنے گئے کہ سردار جی نے اس تقریب پر 50 کروڑ بھارتی روپے خرچ کئے جبکہ وہ 75000 کروڑ کی آسامی سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے دن ہم دوبارہ ان تنگ گلیوں میں مشہور شاعر مرزا اسداللہ غالب کی حویلی دیکھنے گئے جو بھارت سرکار نے خصوصی طور پر عجائب گھر کی طرح محفوظ کر رکھی ہے جو عوام اور شاعر کے چاہنے والوں کیلئے بہت اہمیت رکھتی ہے پھر شام کو ہی ان کے مزار جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار سے ملحق تھا۔ وہاں 6 بجے پہنچے تو تالا لگا ہوا تھا۔ آوازیں دے کر اندر سے گارڈ کو بلوایا تو اس نے کہا کہ 5 بجے احاطہ بند کر دیا جاتا ہے کل آئیں۔ ہم نے کہا ہم پاکستان سے آئے ہیں خصوصی طور پر غالبؔ صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کیلئے۔ اس نے تالا کھولا ہم نے فاتحہ پڑھی۔ کچھ اس مسلمان گارڈ کی بھی سیوا کی اور ہوٹل واپس آئے۔ ان تمام 6 دنوں میں ہم نے دن میں دِلّی شہر کی سیر کی۔ لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ، جمعہ کی نماز بادشاہی مسجد میں ادا کی۔ قطب مینار، ابراہیم لودھی کا مقبرہ دیکھا جو خستہ حال ہو چکے ہیں۔ بھارتی سرکار کی غفلت یا عدم توجہ کا شکار ہیں۔ دیکھ کر واپس پاکستان لوٹ آئے۔ یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ پاکستان اور بھارت میں 2 چیزیں بہت مشترک ہیں کہ دونوں کے سیاستدان کرپشن میں مبتلا ہیں اور دونوں کی پولیس بھی کرپٹ ہے، البتہ ہندوستان کی پولیس آنکھیں چرا کر رشوت لیتی ہے اور پاکستان کی پولیس آنکھیں دکھا کر۔ پاکستان آ کر پتہ چلا آج ہی عدلیہ نے پرویز مشرف کی ضمانت منسوخ کر کے جیل بھجوانے کا حکم جاری کر دیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ''اے آنکھ والو! عبرت پکڑو'' کیا اب ہمارے حکمران اور سیاستدان اس سے عبرت حاصل کریں گے؟

سوازی لینڈ کے بادشاہ کو 14 ویں ملکہ کی تلاش

سوازی لینڈ کا نام آتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے ہم سوئٹزرلینڈ جیسے ترقی پذیر کسی ملک کا موازنہ کر رہے ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دراصل سوازی لینڈ افریقہ کا ایک انتہائی غریب اور پسماندہ ملک ہے جو 1902ء سے برطانیہ کے زیر اثر ملکوں میں شمار ہوتا تھا اور 1968ء میں آزاد ہوا۔ جس کی کل آبادی 12 لاکھ سوازی باشندوں پر مشتمل اور رقبہ 191 کلومیٹر ہے اور فی کس آمدنی سو ڈالر یومیہ ہے۔ اس ملک میں بادشاہت کے ساتھ ساتھ نام نہاد جمہوری نظام بھی رائج ہے۔ موجودہ بادشاہ جن کا نام سوانی سوم (III) ہے۔ 1986ء میں اپنے آنجہانی بادشاہ سبازا جن کا انتقال 1982ء میں ہوا تھا بادشاہ بنے۔ تمہید اس لیے لکھی تا کہ میرے قارئین کو ان کے ملک سے آگاہی ہو سکے۔ اصل وجہ گذشتہ ماہ راقم لندن اپنی صاحبزادی سے ملنے گیا تھا تو ایک نوجوان سوازی لینڈ کی لڑکی Ngobeni جس کی عمر صرف 22 سال تھی۔ سوازی لینڈ ایمبیسی کے باہر اکیلی مظاہرہ کر رہی تھی اس کے ہاتھ میں ایک بینر تھا جس میں لکھا تھا کہ سوازی لینڈ میں جمہوریت بحال کرو۔ اخباری نمائندوں نے جب اس کا انٹرویو لیا تو اس نے روتے ہوئے انکشاف کیا کہ سوازی لینڈ کا بادشاہ سوانی (III) اس کو زبردستی اپنی چودھویں ملکہ بنانا چاہتا ہے۔ اس کے ڈر سے وہ 2007ء میں جب اس موجودہ بادشاہ کی چھٹی ملکہ کی شادی کی تقریب میں شریک تھی تو وہ بادشاہ کو پسند آ گئی۔ اس وقت اس کی عمر صرف 15 سال تھی۔ بادشاہ کے ڈر اور ناراضگی سے بچنے کیلئے وہ برطانیہ

پڑھنے کے بہانے اپنی ماں کے ساتھ بھاگ آئی۔پھر جب سے بادشاہ گا ہے بگا ہے اس کے ہاسٹل میں فون کر کے شادی کا ذکر چھیڑتا رہتا تھا جس کو ن کو وہ مصلحتاً خاموش رہتی تھی۔ 2007ء میں اس نے بادشاہ کے ڈر سے پناہ کی درخواست برطانوی امیگریشن میں داخل کی جو 2011ء میں مسترد کر دی گئی۔اپریل 2013ء میں اس کو غیر قانونی برطانیہ میں رہنے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا اور اس کو ملک بدر کرنے کیلئے کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔

اب اس کے وکیل نے اس کی قانونی مدد کی اور رہائی دلوائی ہے۔اگر اس کو ملک بدر کر کے سوازی لینڈ بھیجا گیا تو اس کو خطرہ ہے کہ یا تو بادشاہ اس کو زبردستی ملکہ بنائے گا جو اس کو ناپسند کرتی ہے۔اس بادشاہ کی عمر 45 سال ہے۔اس کی 13 بیگمات پہلے ہی سے ہیں اور سوازی لینڈ کے قانون کے مطابق بادشاہ کو ہر سال ایک نئی شادی کی اجازت ہوتی ہے۔اور وہ ہر سال اگست کے مہینے میں نوجوان کنواری دوشیزہ سے شادی رچاتا ہے۔جس کیلئے ہر سال ماہ اگست میں تقریباً 80 ہزار کنواری دوشیزائیں اس کے محل میں 8 روز تک نیم برہنہ رقص کر کے اپنی شادی کی آمادگی ظاہر کر کے ملکہ بننے کی تمنا کرتی ہیں۔مگر اس سال بادشاہ نے مجھے شادی کا پیغام بھجوایا ہے۔اس کے لیے اس نے سوازی لینڈ سے اپنے خفیہ آدمی بھی بھجوائے ہیں جو کسی وقت بھی مجھے اغواء کر کے سوازی لینڈ لے جائیں گے۔سوازی لینڈ میں کسی کی مجال نہیں ہے کہ جو بادشاہ کی مرضی کے خلاف آواز بلند کر کے بغاوت کرے۔اس کی سزا جیل کی قید اور موت اس کا مقدر بن سکتی ہے۔لہٰذا حکومتِ برطانیہ اس کی حفاظت کا بندوبست کرے۔وہ ہرگز موجودہ بادشاہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی بلکہ وہ بالغ اور خودمختار ہے اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہے۔اور بادشاہ کی غلام نما ملکہ نہیں بننا چاہتی ہوں۔سوازی لینڈ کے قانون کے مطابق تمام ملکائیں صرف اور صرف بادشاہ کی خوشیوں کو مدِنظر رکھ کر ہی محل میں سخت پہرے داروں کی موجودگی میں رہتی ہیں اور بادشاہ کی مرضی کے خلاف محل سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔اگر بادشاہ کی اجازت ہوگی تب ہی ملکائیں محل سے باہر جا سکتی

ہیں۔صرف سال میں ایک بار اس کی ملکہ امریکہ کی سیر کو جا سکتی ہے۔اس کے تمام اخراجات حکومتِ سوازی لینڈ کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔اس کو ایسی غلامی سے سخت نفرت ہے جبکہ اس بادشاہ کے 27 بچے بھی ہیں۔اس کی چھٹی ملکہ اس کے ظلم سے تنگ آ کر محل سے خفیہ فرار ہو چکی ہے۔وہ ایک پڑھی لکھی آزاد خیال کی حامل لڑکی ہے۔اگرچہ اس کے وکیل نے عارضی رہائی دلوا دی ہے اور اس کو برطانیہ کی ہوم آفس اپیل کرنے کی بھی اجازت دلوا دی ہے مگر اس سے اس کا مسئلہ تب تک حل نہیں ہوگا جب تک اس کو برطانیہ کی حکومت پناہ نہیں دے دیتی۔اس کو اپنی جان جانے کا خطرہ بھی ہر وقت لاحق ہے۔

قارئین اندازہ لگائیں آج کے ترقی یافتہ دور میں بادشاہ مطلق العنان بن کر جمہوریت کی آڑ میں اپنے عوام پر کس طرح کے مظالم ڈھا رہے ہیں اور پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔سوازی لینڈ افریقی ممالک میں سب سے زیادہ غریب ہی نہیں بلکہ غیر تعلیم یافتہ اور یہاں امریکی ہیلتھ سوسائٹی کی سروے رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ ایڈز کے مریض رہتے ہیں۔جن کا آبادی کے لحاظ سے 26 فیصد حصہ ہے۔پورے ملک میں 1 لاکھ افراد کیلئے صرف ایک ڈاکٹر ہے۔یعنی پورے ملک میں صرف 16 سرکاری ڈاکٹر ہیں۔جبکہ اس ملک میں ایڈز کے علاوہ کینسر، دل کے مریض اور بخار کے علاوہ متعدد بیماریاں کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں۔ہزاروں مریض تو علاج کے بغیر ہی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔گویا جس ملک میں طبی سہولتیں ہی نہ ہوں اس ملک کا بادشاہ 80 ہزار خواتین کو ہر سال اپنے محل میں نچوا کر اپنی ملکہ چننے اور عوام خاموشی سے اس کا تماشہ دیکھیں اور اُف تک نہ کہیں۔اگر بیرونی امدادیں نہ ملتیں تو 2008ء میں سوازی لینڈ بھی دیگر افریقی ریاستوں کی طرح خصوصاً زمبابوے کی طرح بینک دیوالیہ ہو جاتا اور پھر عوام بھوکوں مر جاتے مگر بادشاہ کو اپنی تفریح اور عیاشیوں سے فرصت نہیں ملتی مگر دنیا نے ان کی طرف سے آنکھیں بند رکھی ہوئی ہیں۔بادشاہ کو برطانوی حکومت کی بھی آشیر باد حاصل ہے۔گزشتہ ملکہ برطانیہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر اور شہزادہ ولیم کی شادی کے موقع پر پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ اس کو ٹھہرایا گیا تھا۔

جرمنی میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت

ہمارے ایک جرمن دوست نے اپنے بیٹے کی شادی میں مدعو کیا جو جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے 130 کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے صنعتی شہر کے ہوٹل میں منعقد تھی ۔ وقت 6:30 بجے سے 9:00 بجے تک کا تھا۔ ویک اینڈ جمعہ کا دن تھا راقم اس دعوت میں شریک ہوا صرف 15 منٹ کے وقفہ سے تقریباً 250 افراد مع بیگمات جمع ہو چکے تھے ۔ مجھے اس سے قبل کبھی یورپین ممالک میں شادی میں شرکت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لئے وقت مقررہ پر پہنچ گیا تا کہ تقریب کو شروع سے آخر تک انجوائے کرسکوں ۔مہمانوں کو جو باہر سے آئے ہوئے تھے ان کو ان کے ہوٹلوں سے لانے اور پہنچانے کا انتظام تھا۔ پھر بھی تمام غیر ملکی مہمانوں کو نائم سے آگاہ کر دیا گیا تھا ۔ٹھیک 7:30 بجے تک مشروبات میں جس میں ہر قسم کے تازہ پھلوں کے جوس اور وائن وغیرہ شامل تھے ۔مہمانوں کو پیش کئے جاتے رہے ۔تقریب میں صرف جرمن موسیقی اور ہلکے پھلکے گانے بجتے رہے پھر جرمن زبان میں ہی کھانے کی دعوت کا اعلان ہوا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے مہمان مع بیگمات پلیٹوں کی طرف گئے ،پلیٹیں ہاتھ میں اُٹھائیں اور کھانے کے بوفے ٹیبل پر قطار میں لگ گئے ۔پہلی ٹیبل پر مختلف قسم کی سالادیں، پنیر، مکھن ، بریڈ اور سلائس تھے ۔حسب ضرورت انہوں نے پلیٹوں میں ڈالے پھر کھانے کی ٹیبل کی طرف بڑھے ۔2 قسم کے گوشت ،ایک سبزی اور ایک ڈش مچھلی کی تھیں ۔سبزی اور چاول وکیٹیرین

مہمانوں کے لئے ،مچھلی اور چاول مسلمانوں کے لئے ،اکثریت کے لئے دیگر گوشت کا بندوبست تھا۔ مہمان یہ سامان لے کر واپس اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ کر کھاتے رہے جس کو مزید چاہئے تھا وہ بعد میں جا کر سلیقے سے اُتنا نکالتے جتنا وہ کھا سکتے تھے، کچھ ضائع نہیں کرتے تھے پھر آخر میں وہ میٹھے کی ٹیبل پر جا کر دوسری پلیٹوں میں اپنے من پسند میٹھے پھل ، کیک ، آئسکریم اور آئسکریم کسٹرڈ لے کر اسی طرح دوسری بار قطار میں لگ کر لیتے رہے ۔ٹھیک 8:30 بجے تک تمام مہمان کھانے اور پینے سے فارغ ہو کر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے ۔پھر دولہا دولہن اپنے روایتی لباس میں تشریف لائے ،تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال ہوا پھر دیکھا دیکھی مہمانوں نے ہال کے کونے والے خالی حصہ پر کراکری کی پلیٹیں، برتن پھینکنے شروع کر دیئے اور دولہا دولہن دونوں مل کر جھاڑو سے سمیٹ کر ایک کنارے پر ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جمع کرتے رہے یہاں وہ اپنے گھروں سے بھی پرانی کراکری لائے تھے اور ٹیبل پر بھی پرانی استعمال شدہ کراکری بھی رکھی ہوئی تھی وہ سب اٹھا کر زمین پر توڑتے رہے ۔یہ جرمنی کی اپنی تخلیق تھی جو پہلی مرتبہ راقم نے دیکھی اس طرح مہمانوں کی پرانی کراکری بھی نمٹ گئی اور ایک طرح کی ان کی رسم بھی ادا ہو گئی جو بہت دلچسپ تھی ۔ بے چارے میاں بیوی دونوں مل کر آدھے گھنٹے تک ان ٹوٹے ٹکڑوں کو سمیٹ سمیٹ کر خاصے تھک چکے تھے پھر یہ رسم ختم ہوئی تو تالیوں کی گونج میں دولہا دولہن جن کی عمریں دونوں کی تقریباً ایک ہی سی 30 اکتیس سال لگ رہی تھی ۔خوش خوش مہمانوں سے رخصت ہوئے ٹھیک 9:00 بجے ان کے والدین جنہوں نے مہمانوں کا استقبال کیا تھا اب سب کو رخصت کیا، گویا 9:00 بجے مہمان رخصت ہو رہے تھے اور ہم اکیلے پاکستانی، چند بھارتی اور چند مسلمان عربی اس ڈسپلن اور وقت کی پابندی کی تعریف کر رہے تھے ۔اس سے قبل جس تقریب میں سعودی عرب، یو اے ای، بھارت اور ہمارے پاکستان میں اول تو شادیاں 10:00 بجے رات سے پہلے شروع ہی نہیں ہوتیں، پھر بغیر قطار ہڑبونگ میں کھانا لیا جاتا ہے اور غیر ضروری پلیٹیں بھر بھر کر کھانا نکال کر ضائع کیا جاتا

ہے اور رات گئے تک تقریباً آدھی رات یعنی 12:00 تک تقریب کا بے ہنگم طریقے سے تقریب کا اختتام ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں علاوہ صوبۂ پنجاب میں جہاں صرف ایک چاول، ایک گوشت کری اور ایک میٹھا، چائے، کولڈ ڈرنک پیش کئے جاتے ہیں۔ دیگر تینوں صوبوں میں حسب حیثیت 10 بارہ ڈشیں تو عام ہوتی ہیں وقت کی پابندی بھی صرف صوبۂ پنجاب میں نظر آتی ہے وہ بھی وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی سخت روایتی پالیسیوں کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ اب ون ڈش کا اعلان تو ہمارے وزیر اعلیٰ قائم علی شاہ صاحب نے بھی فرمادیا ہے مگر ان کی انتظامیہ پر کوئی گرفت گذشتہ 5 سالوں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ البتہ اس کی آڑ میں شادی ہالوں سے رشوت کا ایک اور دروازہ کھل جائے گا جو ماضی میں بھی دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ ہمارے بھولے وزیر اعلیٰ سندھ کے لئے یار دوستوں نے ایک شعر گھڑ رکھا ہے، کہ میں وزیر اعلیٰ ہوں سندھ کا، مجھے چلاتا کوئی اور ہے۔ تعجب اس بات پر بھی ہے کہ ہمارے تینوں صوبوں میں تو دہشت گردی عام ہے مگر پھر بھی عوام رات گئے تک تقریبات سے محظوظ ہوتی رہتی ہے اور ہماری خواتین سونے کے بھاری زیورات میں لدی گھنٹوں ان کی نمائش کر کے خوش ہوتی رہتی ہیں۔

اتفاق سے دوسرے دن جرمنی کے دوسرے نزدیکی شہر میں جو بلیک فارسٹ کے نام سے مشہور ہے ایک مشینی نمائش میں بھی مدعو تھا۔ نئی نئی اقسام کی مشینیں، چھوٹی سے لے کر بڑی بڑی آٹومیٹک مشینیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنی جدید مشین جو ایک منٹ میں 100 سے لیکر 700 بوتلیں، ٹیوب، جار، انجکشن بھرنے کی صلاحیتیں رکھتی تھیں۔ اپنے سامنے عملی طور پر بھرتے دیکھ کر احساس ہوا کہ دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے۔ صنعتی انقلاب یورپ چھوٹے چھوٹے شہروں میں برپا کر چکا ہے، صنعتی ترقیاں اپنے عروج پر ہیں۔ یورپ کے 30 تیس ممالک اپنی اپنی کرنسیوں، ملکی حدودوں کو ختم کر کے ایک جان ہو چکے ہیں جن کی تہذیبیں، زبانیں، تمدن، مذہب الگ الگ ہیں مگر وہ سب مل کر اپنی اپنی معیشتیں کہاں سے کہاں

پہنچا چکے ہیں مگر افسوس 57 سے زائد مسلم ممالک جن کے پاس دنیا کی 80 فیصد توانائی کی حامل صلاحیتیں، تیل، گیس، ڈیزل، کوئلہ اور معدنیات کے ہوتے ہوئے ایک خدا اور رسول کو ماننے والے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر الگ الگ فرقوں میں تقسیم ہو کر خود اپنا مذاق بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ اور اسکے رسول کو بھلا کر اپنے اپنے وضع کردہ غیر شرعی، غیر اسلامی اصولوں کے سہارے اپنے عوام پر مسلط ہیں۔ سب کے سب کرپشن، ایذا رسانی اور عوام کو دھوکہ دینے میں پیش پیش ہیں۔ انہیں صرف اور صرف اپنے مفادات سے سروکار ہے۔ عوام کو جہالت، غربت، بے بسی کی زندگی گذارنے پر خوش ہیں اور پوری پڑھی لکھی قوموں کے سامنے دہشت گردوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ خود بھی ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اور قوم کو بھی ذلیل و خوار کر رہے ہیں۔ اپنے سنہرے اصولوں کو غیر مسلموں کے ہاتھوں فروخت کر کے اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں اور اپنی عوام کو بھیڑ، بکریاں سمجھ اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے زندہ درگور کرنے سے بھی باز نہیں آرہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ خونی باب کب تک مسلمانوں سے مسلمانوں کو لڑوانے اور مروانے کا ختم ہوگا؟ تیسرے دن جب جرمنی سے واپس جہاز میں روانگی ہوئی تو خبروں سے معلوم ہوا کہ طالبان نے ہمارے فوجی قافلہ کو خودکار بم سے اڑا دیا اور ایک میجر جنرل سمیت 5 فوجیوں کو شہید کر دیا گیا۔ یہ طالبانوں کو رہا کرنے کا اور بات چیت آگے بڑھانے کا تحفہ ہے؟

انا للہ وانا الیہ راجعون

کوسٹاریکا میں 6دن

6ماہ قبل راقم نے لاطینی امریکہ کے ایک ملک کوسٹاریکا (Costa Rica) کے بارے میں ساحلی تفریح گاہ لائبیریا کے جزیرہ پر واقع دنیا کا سب سے بڑا خوبصورت 7 اسٹار ہوٹل جو ایک مسلمان سعودی شہزادے کی ملکیت ہے اُس کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا جس کو ہمارے قارئین نے بہت دلچسپی سے پڑھا تھا اور بہت سی ای میل میں مزید تفریحی مقامات سے آگاہی چاہی تھی۔ اتفاق سے ہمارے ایک دوست جو امریکہ کے شہر اورلنڈو (Orlando) میں رہتے ہیں۔ اسی جزیرے کے دوسرے شہر کیوپاس (Que-Pas) کی سیر کی دعوت دی۔ یہ میرے کالم کا وہیں نیٹ سے جنگ اخبار کا باضابطہ مطالعہ کرتے ہیں۔ کیونکہ امریکہ میں اصلی جنگ اخبار نہیں ملتا البتہ نقلی جنگ اخبار ضرور چھپتا ہے جو مقامی ہے وہ بھی ایک پاکستانی نژاد امریکن شہری چھاپتا ہے۔ دوست نے معہ اہلیہ دعوت دی تھی لہٰذا میں معہ اہلیہ امریکہ کے میامی ائرپورٹ پر اترا تو وہ بھی معہ اپنی اہلیہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کیوپاس جزیرہ کوسٹاریکا کا سب سے خوبصورت جزیرہ ہے۔ چنانچہ میامی سے 3 گھنٹے کی فلائٹ تھی جو انہوں نے پہلے سے بک کروا رکھی تھی۔ ہم چاروں افراد کوسٹاریکا کے دارالخلافہ سین جوزے (Sanjoza) کے ائرپورٹ پہنچے، لاطینی زبان میں J کو H پڑھا جاتا ہے۔ ویسے سین ہوزے نام کا شہر ایک امریکہ میں کیلیفورنیا میں بھی واقع ہے۔ بہت سے نئے سیاح امریکہ بھی پہنچ جاتے ہیں اور پھر

جب ان کو پتہ چلتا ہے تو وہ پھر کوسٹاریکا کا اضافی کرایہ ادا کر کے جاتے ہیں۔ پچھلے کالم میں راقم نے لکھا تھا کہ کوسٹاریکا میں مسلمان آبادی چند سو افراد پر مشتمل ہے اور یہاں حلال گوشت تقریباً ناپید ہے تو اس مرتبہ میرے دوست نے جو ایک ریٹائرڈ کرنل پاکستان آرمی سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے حلال مرغی، بکرے کا گوشت اور مصالحہ جات پیک کرا کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیئے۔ پچھلی مرتبہ سان ہوزے ایئرپورٹ بہت چھوٹا تھا، اس دفعہ ہم کو نئے اور بہت کشادہ ائرپورٹ پر اتارا گیا۔ بہت خوبصورت تھا، سامان جب آیا تو مشینوں سے گزارا گیا۔ پچھلی مرتبہ اُس وقت مشین نہیں تھی جب اسکرین پر گوشت نظر آیا تو کسٹم حکام نے سوٹ کیس کھولنے کا حکم دیا، ہم نہیں سمجھے کہ وہ کیا چاہتا ہے ویسے بھی ہم امریکہ سے آئے تھے پھر اس نے گوشت کی تھیلیوں کو باہر نکالا، سبزیاں، پھل بھی باہر نکال کر وہ ڈسٹ بن میں ڈالنے لگا تو ہم نے اس کو اپنی مجبوری بتائی کہ ہم مسلمان ہیں اور یہاں حلال گوشت نہیں ملتا۔ ویسے بھی ہم نے یہ گوشت امریکہ سے خریدا ہے۔ یقیناً کوسٹاریکا سے تو زیادہ ہی حفظان صحت ہوگا مگر اس نے صاف انکار کر دیا کہ ہمارے ملک میں باہر سے گوشت، سبزیاں، پھل، دودھ اور اس کی بنی اشیاء جس طرح امریکہ میں منع ہے یہاں بھی منع ہے۔ قبل اس کے کہ ہم مزید بحث کرتے اس نے دراز سے مچھر، مکھی مارنے کا اسپرے نکالا اور تھیلیوں پر اسپرے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ ہم سب افسوس کرتے رہ گئے اب ہمارے پاس حلال گوشت کھانے کے لئے نہیں تھا۔ باہر آ کر ہم نے معلوم کیا یہاں کوئی مسجد ہے تو شاید ہم کو حلال گوشت مل جائے۔ ہمارے دوست نے کیوپاس جزیرے میں ہوٹل اپارٹمنٹ اسی لئے بک کرایا تھا کہ اس میں کھانے پکانے کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ ائرپورٹ سے پہلی رات ہم کو سین ہوزے میں رکنا تھا، اتفاق سے ہوٹل کے نزدیک ایک مسجد تھی میرے میزبان اور میں بیگمات کو ہوٹل چھوڑ کر مسجد میں گئے، مسجد میں کچھ لوگ مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ پورے کوسٹاریکا میں حلال گوشت نہیں ہوتا البتہ تمام مسلمان مرغی، بکرا، دنبہ، گائے کا گوشت حلال سمجھ کر کھاتے ہیں،

حرام گوشت خنزیر یعنی سور کے گوشت کو کھاجا تا ہےاور چونکہ مسلمان آبادی نہیں ہے اس لئے کوئی اجتماعی قربان گاہ ذبیحہ نہیں ہوتا۔خیر دوسرے دن ہم سین ہوزے سے رینٹ اے کار کےذریعے کیوپاس روانہ ہو گئے جوتقریباً 180 کلومیٹر دور تھا۔آج کل کیونکہ ہر گاڑی کے ساتھ جی ایس ایم ہوتا ہےتو راستہ آسانی سے معلوم ہوجاتا ہے۔ویسے یہاں رینٹ اے کار کا کرایہ امریکہ سے دوگنا 60 ڈالر یومیہ پھر جی ایس ایم کا 15 ڈالر یومیہ کےعلاوہ انشورنس تو حد سے بھی زیادہ یعنی روزمرہ کا 50 ڈالر تھا۔اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ انشورنس کمپنی کالائسنس کوسٹاریکا میں صرف ایک بہت بڑے سیاستدان کے پاس ہےاوراس کے پاس موبائل فون کا بھی لائسنس ہے۔وہ من مانے دام وصول کر کے اپنی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہے۔3 گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کےبعد ہم کیوپاس جزیرے پہنچے،ہوٹل اپارٹمنٹ ایک پہاڑی پر بناہوا تھامقامی نام لاس اٹوس (Lasatos) تھابالکل ہماری مری کی پہاڑیوں کا سلسلہ لگتا تھااسی طرح بازار تھے،نیچے سمندر بہت خوبصورت نظارہ پیش کررہا تھا۔اس کی ایک وجہ ہمارے پینٹ ہاؤس اپارٹمنٹ جوآٹھویں فلور پر بہت کشادہ تقریباً 4000 ہزار اسکوائر فٹ پر 4 کمروں معہ اٹیچ باتھ روم،کشادہ لان،بہت بڑا اورانڈا،کچن ہر چیز بہت خوبصورتی سے ڈیکوریٹ تھی۔میں نے اپنی زندگی میں اتنا پرتکلف ہوٹل اپارٹمنٹ نہیں دیکھا تھا جومیرے دوست نے خلوص کی انتہا کر کے بک کروایا۔کیونکہ ستمبر میں کوسٹاریکا میں بارشوں کا مہینہ ہوتا ہےاس لئے سیاح بہت کم آتے ہیں۔آف سیزن ہونے کےباوجود 700 ڈالر یومیہ کرایہ تھا۔گرمیوں میں 1200 سے 2 ہزار ڈالر تک یہ پینٹ ہاؤس بک ہوتا ہےاور پورا ہوٹل فل رہتا ہے۔کیونکہ یہ واحد 5 اسٹار ہوٹل بلندترین پہاڑی پر واقع ہے۔صرف ناشتہ اس میں شامل تھااس لئے ہم روزبازار سے تازہ سبزیاں،مچھلی اور جھینگے خرید کرپکاتے تھے۔ایک دن سمندر کی سیر کی مچھلیاں بھی پکڑیں مگر یہاں کا قانون ہے کہ آپ مچھلیاں صرف پکڑ سکتے ہیں مگر کانٹے سے نکال کرآپ کوواپس سمندر میں ڈالنا ہونگی۔دوسرے دن ہم جنگل میں بنے ہوئے درختوں پرتاروں کی مدد سے اسکائی ڈائیونگ کرتے

رہے۔یہ جنگل میں اونچائی پر درختوں سے تار باندھ دیئے جاتے ہیں اور کمر میں چین کپیوں کی مدد سے دوسرے درخت پر ہر مچان پر جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ نیچے جاتے رہتے ہیں۔پھر آخر میں سب سے نیچے مچان تک پہنچتے ہیں وہاں سے واپس پگڈنڈیوں کی مدد سے اوپر آتے ہیں۔اس طرح یہ ٹور آدھے دن کا ہوتا ہے،بہت ایکسرسائز ہوجاتی ہے،جنگل میں مور طوطے،طرح طرح کے رنگ برنگے پرندے اور بندر ہوتے ہیں۔میلوں تک آم کے درختوں،اناس اور کیلے کے درخت ہوتے ہیں جو سرکاری ملکیت ہیں۔کوسٹاریکا میں مختلف جزیرے ہیں،آپ بائی روڈ بھی جا سکتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جہاز اور ہیلی کاپٹر کا سفر سیاحوں کو بہت دلچسپ بناتا ہے۔اکثر آبادی غریب ہے مگر پڑھی لکھی ہے،چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے ہیں اور کھڑکیوں میں لوہے کی گرل اور دیواروں پر تاروں کا جال پہلی منزل کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ایک بھی پولیس والا ہم کو ان 5 دنوں میں نظر نہیں آیا،البتہ کبھی کبھی پولیس کی گاڑی نظر آجاتی تھی۔کوسٹاریکا کی آبادی 60 لاکھ ہےاور 95 فیصد پڑھی لکھی مقامی اسپینش زبان بولتی ہے،بمشکل انگریزی بولنے اور سمجھنے والا ترجمان ملے گا۔اشاروں،کنائیوں سے کام چلانا پڑے گا البتہ بہت خوش اخلاق اور ہمہ تن سیاحوں کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔1 ڈالر میں 550 مقامی سکے ملتے ہیں،پاکستان جتنی مہنگائی ہے مگر کوئی منہ نہیں بناتا اور نہ اپنے ملک کو برا بھلا کہتا ہے۔اتفاق سے 6 دنوں میں سے صرف 2 دن بارش رہی بقایا دن دھوپ اور خوشگوار موسم میں گزارے۔سمندر،پہاڑ،جنگلات تو ہمارے ملک میں بھی ہیں مگر ہم ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔امریکہ جائیں تو کوسٹاریکا بہت خوبصورت ملک ہے اس کے جزیرے اور لوگ لاجواب ہیں۔مگر آپ کو صرف سبزیوں اور سمندری کھانوں پر گزارا کرنا پڑے گا۔آپ کو ویزہ بھی آن ارائیول صرف 28 ڈالر میں مل جائے گا۔کوسٹاریکا میں ہر طرح کے ہوٹل اور کھانوں کے ریسٹورینٹ ہیں اور 10 ڈالر کا اچھا کھانا مل جاتا ہےاور مقامی سستے فاسٹ فوڈ چین بھی ہیں جہاں ایک وقت کا کھانا 2 سے تین ڈالر میں باآسانی مل جاتا ہے۔

ایک انجکشن کی کہانی

اس سال رمضان المبارک میں بھی عمرے کی ادائیگی کی سعادت ملی ۔ عام طور پر میں ماضی میں بھی عمرے کی ادائیگی سے قبل ضروری ادویات فرسٹ ایڈ کا سامان اپنے ساتھ ضرور لے جاتا ہوں ۔ وہاں اکثر اس سامان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور ساتھی عمرہ کرنے والوں کی خدمت بھی ہو جاتی ہے ۔ دن میں 5 اوقات فرض نمازوں اور عمرہ کرنے کے لئے خانہ کعبہ میں حاضری ضروری ہوتی ہے ۔ اس سال اتفاق سے میرے معالج نے جانے سے قبل ہمیشہ کی طرح خون ٹیسٹ کروایا تو میری اور اہلیہ کی رپورٹ میں وٹامن ڈی کی بہت کمی ظاہر ہوئی تو انہوں نے ہر ہفتے ایک انجکشن باقاعدگی سے لگوانے کی ہدایت کی جو میں نے دونوں کے لئے اپنے سامان میں رکھ لئے ۔ ایک ہفتے کے بعد میں ایک چھوٹے کلینک میں معہ اہلیہ گیا اور اس کو دو انجکشن جو پاکستان سے خریدے تھے کمپاؤڈر کو دیئے جو اتفاق سے پاکستانی ہی تھا ۔ اس نے بتایا کہ سعودی عرب میں بغیر ڈاکٹر کے نسخے کوئی انجکشن نہیں لگایا جاتا جب تک مقامی ڈاکٹر اس نسخہ میں خود تجویز نہ کر دے ۔ سعودی عرب میں اکثریت مقامی، سرکاری اور غیر سرکاری ہسپتالوں میں پاکستان اور بھارت کے ڈاکٹر نوکریاں کرتے ہیں ۔ اس کی 2 وجوہات ہیں اول سعودی عرب میں لاکھوں پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشی ورکرز ہر شعبے میں کام کر رہے ہیں جن میں لیبر کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ صرف اردو زبان سمجھتے ہیں ۔ سعودی، مصری اور دوسرے ممالک کے ڈاکٹر

بہت زیادہ تنخواہ طلب کرتے ہیں مگر پاکستانی اور بھارتی ڈاکٹرز صاحبان بہت کم تنخواہ پر بھی گذارہ کر لیتے ہیں اور دوسری سب سے بڑی وجہ عمرہ اور حج پر بھی ان تینوں ممالک سے لاکھوں مسلمان ضرور آتے ہیں وہ بھی کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں ۔ اس طرح سعودی حکام ان کے لئے بھی ان کی زبان جاننے والوں کو رکھتے ہیں ۔ لہٰذا زبان کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا ۔ خیر واپس میں اپنی اصلی مشکل کی طرف آتا ہوں، جب اس کمپاؤڈر نے انکار کیا تو میں نے اس کا حل پوچھا، کیونکہ وٹامن ڈی کا ایک لاکھ یونٹ کا انجکشن سعودی عرب میں دستیاب بھی نہیں تھا ۔ البتہ ہزار یونٹ تک کی گولیاں اور کیپسول دستیاب تھے ۔ اس نے مشورہ دیا کہ کسی پاکستانی ڈاکٹر کو ڈھونڈو ۔ وہ اس مسئلہ کو حل کر سکے گا ۔ کراچی فون کر کے اپنے پاکستانی ڈاکٹرز سے سعودی عرب میں کسی جاننے والے ڈاکٹر کا پتہ معلوم کیا ۔ خدا کا کرنا میرے دوست نے ایک اس کے جاننے والے ڈاکٹر کا فون نمبر دیا اور اس کو فون بھی کر دیا ۔ دوسرے دن صبح میں نے مذکورہ ڈاکٹر صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں اس وقت مدینہ میں تعینات ہوں اور چونکہ میں مکہ میں تھا تو انہوں نے اپنے ہی ایک پاکستانی ساتھی ڈاکٹر کو فون کر کے مسئلہ حل کرنے کے لئے کہا اور مجھے بھی مکہ میں رہنے والے ڈاکٹر کا موبائل نمبر دے دیا ۔ جب میں نے فون کیا تو ان ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ مکہ میں تو ہے مگر کافی دور ہسپتال میں کام کر رہے ہیں ۔ حرم میں انہوں نے سرکاری ہسپتال کے ایک دوست کو فون کر کے انجکشن لگوانے کی درخواست کی تو سرکاری ڈاکٹر جو بھارتی تھا اس نے صاف انکار کر دیا ۔ پھر پاکستانی ڈاکٹر نے ایک اور پاکستانی ڈاکٹر کو ڈھونڈ نکالا جس کی ڈیوٹی عشاء کے بعد شروع ہونی تھی، اس نے حامی بھر لی ۔ پھر ہم دونوں میاں بیوی نماز عشاء سے فارغ ہو کر اس سرکاری ہسپتال میں جو اتفاق سے ہمارے ہوٹل کے برابر والی بلڈنگ میں واقع تھا، پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرکاری عملہ نماز تراویح ادا کرنے حرم میں گیا ہوا ہے، لہٰذا رات 10:30 بجے نماز تراویح کے بعد یہ مسئلہ حل ہو سکے گا ۔ ہم بھی نماز تراویح کی ادائیگی کے لئے سامنے ہی حرم میں روانہ ہو گئے پھر جب واپس لوٹے

تو پاکستانی ڈاکٹر نے اپنے ماتحت کو بلایا وہ جونیئر ڈاکٹر تھا، اس سے کہا کہ نرس اور ڈاکٹر یہ انجکشن جو معمولی قسم کے وٹامن ڈی کا ہے لگا دے۔اس ماتحت ڈاکٹر نے کہا کہ چند دن قبل ہی باہر سے انجکشن لگانے پر محکمہ صحت نے پابندی عائد کردی ہے۔لہٰذا وہ یہ فرض انجام نہیں دے سکتا۔ڈاکٹر بے چارہ اپنا منہ دیکھتا رہ گیا اس نے ہم سے کہا آپ تشریف رکھیں مگر میری اہلیہ جو کافی تھک گئیں تھیں، انہوں نے کہا چھوڑیئے کل دیکھیں گے۔میں نے بیگم کو ہوٹل روانہ کردیا اور خود ڈاکٹر کے ساتھ گپ شپ لگانے بیٹھ گیا۔اس نے اپنے 2 تین ڈاکٹروں کو فون کر کے مسئلہ بیان کیا، اتفاق سے ایک شناسا ڈاکٹر جس کی ڈیوٹی حرم کے اندر رات 12:00 بجے کی تھی مجھے بھیجنے کو کہا۔رات 12:00 بجے میں حرم کے اندر گیا اور اس ڈاکٹر سے ملا وہ غالباً اردن یا مصر سے تعلق رکھتا تھا اس نے ایک نرس کو بلایا اور کہا کہ یہ انجکشن لگا دے۔نرس نے مجھے کلینگ میں بیٹھنے کو کہا اور اندر سے انجکشن لگانے کے لئے اسپرٹ کا ڈبہ، روئی وغیرہ لے کر آئیں، انجکشن میرے ہاتھ سے لیا اور پڑھ کر بولی کہ معذرت یہ انجکشن صرف پہلو میں لگانا ضروری ہے وہ صرف ہاتھ میں لگا سکتی ہے اس کے لئے میل نرس (مرد) ضروری ہے اور اس وقت کوئی میل نرس (مرد) ڈیوٹی پر نہیں ہے۔لہٰذا کل صبح آئیں شاید یہ مسئلہ حل ہو سکے۔میں سارا دن اس کی جستجو میں لگنے کی وجہ سے پریشان حرم میں کھڑا تھا کہ سامنے سے میرے ایک پاکستانی دوست ڈاکٹر آتے نظر آئے۔بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور اپنا مسئلہ بتایا، انہوں نے میرے ہاتھ سے انجکشن لیا اور ساتھ سامنے ہی ہوٹل جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے چلنے کو کہا۔راستے میں انہوں نے بتایا کہ وہ اب امریکہ میں شفٹ ہو چکے ہیں ان کی اہلیہ بھی ڈاکٹر ہیں۔رمضان المبارک میں وہ بھی عمرہ کی ادائیگی کے لئے آئے ہوئے ہیں۔میں نے اہلیہ کو بھی ساتھ لیا جو اسی ہوٹل میں اوپر والی منزل پر تھیں، سب ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔یہ جان کر حیرت ہوئی کہ انجکشن پڑھ کر انہوں نے کہا کہ یہ انجکشن دونوں طریقہ سے استعمال ہو سکتا ہے۔یہ انجکشن توڑ کر بھی پیا جا سکتا ہے، انہوں نے ہمارے سامنے انجکشن توڑے اور ہم

کو پلا کر کہا کہ اب آپ کو آئندہ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔میں ان کا شکریہ ادا کر کے لوٹا تو معلوم ہوا کہ واقعی سعودی عرب میں وزارت صحت کس قدر چوکس ہے اور سب لوگ قانون کا احترام کرتے ہیں۔جبکہ ہمارے ملک میں تو کیمسٹ شاپ پر ہر طرح کی ادویات بغیر نسخہ مل جاتی ہیں حتیٰ کہ نشہ آور انجکشن، گولیاں بھی اور ہر کوئی بغیر معلومات انجکشن لگا بھی دیتا ہے۔کہاں کا قانون، کہاں احتیاط اور توجہ۔قارئین کی معلومات کے لئے امریکہ، کینیڈا اور تمام یورپی ممالک میں جان بچانے والی ادویات کسی قیمت پر بھی بغیر ڈاکٹر کے نسخے حاصل کرنا غیر قانونی ہے اور ناممکن ہے یا کوئی فارمیسی اس کو فروخت کرے۔اور تو اور کینیڈا میں ہر فارمیسی میں ایک کوالیفائیڈ کمپاؤڈر یا ڈاکٹر ضرور تعینات ہوتا ہے اور ہر نسخے پر 10 یا پانچ ڈالر اضافی فیس بھی چارج کی جاتی ہے اور میں یہ بھی ساتھ ساتھ بتا دوں کہ کوئی بھی اینٹی بائیوٹک گولی اور کیپسول کم از کم قیمت 2 ڈالر یعنی -/225 روپے فی گولی یا کیپسول وصول کی جاتی ہیں اور ہر دوا جو پاکستان میں اگر 100 روپے میں ملتی ہے تو وہی دوا اور اسی کمپنی کی بنی ہوئی کم از کم -/1500 روپے میں ملتی ہے۔پورے امریکہ، کینیڈا، یورپ میں وہی پاکستان میں ملٹی نیشنل ادارے 10 بیس گنا زیادہ قیمت میں فروخت کرتے ہیں۔ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں سب سے کم قیمت پر ادویات فروخت کی جاتی ہیں اور ہر مریض کی پہنچ میں ہوتی ہیں۔مگر میڈیا مہنگائی کا شور مچاتا رہتا ہے۔اس کو دیگر ضروری کھانے، پینے کی اشیاء کی مہنگائی نظر نہیں آتی اور نہ پیٹرول، ڈیزل، گیس پر حکومت کے اضافی ٹیکس برے لگتے ہیں وہ کیوں خاموشی سے خریدتا ہے۔

ایک ہفتہ تھائی لینڈ میں

دنیا کے ترقی پذیر ممالک آج کل اپنی مصنوعات کو فروخت کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش میں لگے ہوئے اور نئے نئے تجربات کرتے رہتے ہیں ۔اسی طرح کا ایک موقعہ راقم کو تھائی لینڈ کی حکومت نے اپنے پاکستانی قونصل جنرل عزت مآب وی چائی سری سوجن (WICHAI SIRI SUJIN) کے ذریعے ان کے ملک آنے کی دعوت دی ۔اس وفد میں پاکستانی صنعت کاروں پر مشتمل 7 روزہ پلان تشکیل دیا گیا اور ان 7 دنوں میں روزانہ 2 بڑی کمپنیوں کا معائنہ کروانا تھا جو پاکستان میں حلال فوڈ متعارف کروانا چاہتے تھے تا کہ تھائی لینڈ حلال فوڈ جس میں پولٹری اور اُس کی مصنوعات سرفہرست تھی دیگر حلال جانوروں کے گوشت اور اُن سے بننے والی اشیاء پاکستانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر کے زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کمانا چاہتے تھے۔

اس وقت پاکستان تھائی لینڈ سے حلال فوڈ درآمد نہیں کرتا البتہ دیگر اشیاء شربت ، جوس، جوتے ، چمڑا، کپڑا، کیمیکل موٹر کے پارٹس وغیرہ وغیرہ شامل ہیں تقریباً 900 ملین ڈالر امپورٹ کرتا ہے اور اس کے جواب میں پاکستان سے صرف 100 ملین ڈالر کی مصنوعات برآمد کی جاتی ہیں ۔گویا ایک کے مقابلے میں ہم 9 گنا تجارتی حجم رکھتے ہیں ہمارے ایکسپورٹ میں کھانے پینے کے اشیاء مچھلی ، چاول، آم وغیرہ شامل ہیں ۔اس 7 روزہ دورے کا مقصد بھی ان کا اپنا تجارتی ہدف بڑھانا تھا۔اور اس

لئے انہوں نے آنے ، جانے ، کھانے ٹھہرنے اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات خود اٹھائے تھے ۔جانے سے ایک ہفتہ قبل پہلے تمام ارکان وفد کو قونصل جنرل نے دوپہر کا ظہرانہ دیا اور تمام پروگرام سے آگاہ کیا ۔تھائی ایئر لائنز کے ذریعے جمعرات کی رات کو جانا تھا اور ایک ہفتے بعد یعنی جمعرات کو واپس آنا تھا۔پروگرام کے مطابق ہم سب کی ملاقات وہاں کی پہلی خاتون وزیراعظم سے کرانا تھی مگر آخری وقت پر وزیراعظم صاحبہ کو برما جانا پڑ گیا جہاں ہلیری کلنٹن جو آج کل آسیان کے دورے پر ہیں ۔ان کے دورے کا مقصد وزیراعظم تھائی لینڈ اور برما کے فوجی حکمرانوں کے درمیان ہم آہنگی میں اضافہ کرنا تھا۔ اور عوامی جمہوری حکومت برما میں پیش رفت کی جانی تھی ۔وزیراعظم صاحبہ کی غیر موجودگی میں ان کی نمائندگی اُن کے ڈپٹی وزیراعظم صاحب نے کی اور ہمارے وفد کو خوش آمدید کہتے ہوئے پاک تھائی تجارتی ،ثقافتی اور دوستی کے فروغ کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ہمارے ایمبسڈر عزت مآب جناب سہیل محمود صاحب بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور انہوں نے دونوں ممالک کو تجارتی حجم بڑھانے پر زور دیا اور خاص طور پر تھائی صنعت کاروں کو پاکستانی مصنوعات بھارت کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ خرید نے پر زور دیا اور محترمہ وزیراعظم صاحبہ کو پاکستان کے دورے کی بھی دعوت دی تا کہ دونوں قومیں اس خطے میں باہمی تجارتی منڈی کا حجم بڑھائیں ۔اس ملاقات کے بعد ہم کو اسلامی سینٹر آف تھائی لینڈ کے صدر سے ملاقات کرائی گئی بہت کشادہ مرکز تھا جہاں بنکاک کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد دکھائی گئی اور دوپہر کو پرتکلف کھانا کھلایا گیا۔پھر دوپہر کو ایک حلال اسنیک بنانے والی بہت بڑی فیکٹری کا معائنہ کرایا گیا۔جس کے مالک بھی مسلمان تھے اور پولٹری اور اُس کی مصنوعات تھائی لینڈ میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے تیار کرتے ہیں ۔اور وہ پاکستان میں بھی ایسی مصنوعات فروخت کرنا چاہتے تھے ۔فیکٹری میں تمام آٹو میٹک پلانٹ لگے تھے جن پر سنیک ،چپس ،پولٹری یعنی مرغیاں اور اُس کی دیگر مصنوعات کی پروسیسنگ ہائی جینک طریقے سے جاری تھی ۔اُن کے اسنیک

اگر چہ تھائی لینڈ کے حساب اور مصالحوں سے بنے ہوئے تھے اور ہماری مرچوں اور ذائقوں سے مختلف تھے۔مگر پھر بھی ذائقہ دار تھے۔رات کا کھانا ہوٹل واپسی پر کھایا گیا یہاں یہ بات قابل توجہ ہے پورے تھائی لینڈ میں صبح 07:30 بجے ناشتہ،دوپہر 12 بجے کھانا اور رات 6 بجے سے 7 بجے تک رات کا کھانا کھانے کا رواج ہے اور پھر 10 بجے تک تمام تھائی ریسٹورنٹ بند ہو جاتے ہیں۔تھائی باشندے جلد سونے کے عادی ہیں اور صبح بھی جلدی اٹھتے ہیں بہت خوش اخلاق اور سب کو ہاتھ جوڑ کر خوش آمدید کہتے ہیں۔البتہ پاکستانی، بھارتی ،عربی ریسٹورنٹ رات دیر تک اور بعض علاقوں میں جہاں پاکستانی، بھارتی سیاحوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہ صبح 3 بجے تک کھلے رہتے ہیں۔آج سے 30 سال پہلے تک ہمارے ایک روپے میں 2 بھات آتے تھے۔جو اُن کی کرنسی کا نام ہے پھر 25 سال قبل ایک کے بدلے ایک ہوا پھر 2 روپے میں ایک بھات 15 سال پہلے ہو گیا تھا۔آج 3 روپے میں صرف ایک بھات ملتا ہے اس سے اندازہ لگائیے۔تھائی لینڈ جو ایک زمانے میں صرف عیاشی کا اڈہ ہوتا تھا آج صنعت کاری میں چین، جاپان اور کوریا سے صنعتی مقابلہ کر رہا ہے اور ہم اپنی ترقی پذیر صنعتوں کو بجلی اور گیس کی بندشوں کا شکار کر کے اور دہشت گردی لاء اینڈ آرڈر اور بھتہ خوری کر کے اپنے روپے کی وقعت ختم کر چکے ہیں۔دوسرے دن ہم نے سمندری فوڈ کی آٹومیٹک پیکنگ کی فیکٹریوں کا معائنہ کیا کہاں ہم اپنی مچھلی ،جھینگے ، لابسٹر ایکسپورٹ کرتے تھے اور کہاں اب ہم تھائی لینڈ ،ویت نام سے امپورٹ کر رہے ہیں۔یہاں ہمیں بتایا گیا کہ آج کل حلال فوڈ کی مانگ میں زبردست اضافہ ہو چکا ہے۔دنیا میں 75 سے 80 کروڑ مسلمان آباد ہیں اور 100 بلین ڈالر کی حلال فوڈز کی مانگ بڑھ چکی ہے اسی وجہ سے غیر مسلم ممالک اس کی طرف توجہ دے رہے ہیں الغرض ان 7 دنوں میں 14 فیکٹریوں کا معائنہ کرایا گیا۔آخری دن ہم کو تھائی لینڈ کے مرکزی اسلامی سینٹر میں شیخ الاسلام جناب عزت مآب عزیز بن اسماعیل صاحب سے ملاقات کرائی گئی یہ تھائی لینڈ کی حکومت نے 40 ایکڑ پر مشتمل اس سینٹر کو عطیہ

کر کے مسلمان تھائی باشندوں کو خوش کر دیا تھائی لینڈ میں اگر چہ بادشاہت ہے مگر ساتھ ساتھ جمہوری حکومت بھی ہے۔تھائی لینڈ کی کل آبادی ہم سے ایک تہائی یعنی صرف ساڑھے 6 کروڑ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد تقریبا 14 فیصد یعنی 92 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں 60 فیصد خواتین اور 40 فیصد مردوں کی تعداد ہے اس اسلامی مرکز کے پاس تمام مسلمان تھائی باشندوں کا مکمل ڈیٹا ہے جو واقعی حیرت انگیز امر ہے۔جس کو یہاں کے والنٹیر تھائی نوجوانوں نے مرتب کیا تھائی لینڈ میں 3650 مساجد ہیں تقریبا 3 لاکھ تھائی مسلمان بنکاک میں آباد ہیں۔تھائی لینڈ کے 77 صوبوں میں سے 39 صوبوں میں مساجد ہیں اور زیادہ مسلمان آبادی شمالی تھائی لینڈ میں ہے۔تھائی لینڈ میں مرغی کے گوشت کا کاروبار مسلمانوں کے پاس ہے البتہ بدھ مذہب سرکاری ہے اور مسلمانوں کی اکثریت غربت میں ہے مگر تعصب نہیں برتا جاتا۔یہاں کی ترقی دیکھ کر عش عش کرنے کو دل چاہتا ہے۔سڑکیں ،ہسپتال عوام کے فلاح و بہبود کے مراکز جگہ جگہ قائم ہیں۔شاید ہی کسی ملک سے اس ملک میں سیاح سیر و تفریح کے لئے نہیں آتے ہوں۔آخری دن ہم کو پاکستان کے ایمبسڈر جناب سہیل محمود نے چائے پر بلایا اور پاکستانی سفارت خانہ دکھایا اور کمرشل قونصل جناب سید ظفر علی شاہ نے تفصیل سے تھائی پاکستانی تجارتی جائزہ پیش کیا اور آخر میں بتایا ایک پولٹری فوڈ بنانے والی کمپنی جلد ہی لاہور پاکستان میں اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتی ہے جس کے لئے ہمارے ایمبسڈر صاحب کی کوششوں کا دخل ہے یہاں یہ بات بتاتا چلوں یہ دونوں حضرات انتہائی خوش اخلاق اور پاکستان کا درد رکھتے ہیں اور پاکستان تھائی لینڈ کے درمیان مضبوط رشتوں کے خواہاں ہیں۔آخری دن خوشگوار یادوں کے ساتھ ہمارا وفد پاکستان واپس لوٹا تو سب تھائی لینڈ کی ترقی کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

ہوائی جزیروں کی سیر

پورے ملک میں امریکی فلم کے خلاف احتجاج پوری شدت سے پھیل چکا تھا اور اب اس کی آڑ میں املاک جلائی جارہی تھیں۔ امریکن سفارت خانے کو بچانے کے لئے کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں پولیس کی نفری لگا دی گئی تھی پھر بھی عوام کا ردعمل شدت اختیار کر چکا تھا۔ تمام رکاوٹیں توڑ کر ہجوم ان کی عمارتوں میں داخل ہو چکا تھا ایسے میں پولیس نے آنسو گیس اور گولیوں سے ان کو روکنے کی کوشش کی پھر بھی بے قابو ہجوم کو نہیں روک سکے۔ 20 پچیس افراد بھی مارے گئے، کراچی میں تو نقشہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ موقع پرستوں نے تو لوٹ مار بھی شروع کر دی۔ کراچی پر آج کل موت کے سائے ہر طرف سے چھائے ہوئے ہیں۔ یہ خبریں دیار غیر میں مقیم پاکستانیوں پر بجلی بن کر گر رہی ہیں۔ ہر شخص وہاں اپنے دوستوں، رشتہ داروں کی طرف سے فکرمند ہے قوم پر وحشت طاری ہے۔ پوری دنیا میں اس فلم کے خلاف بھرپور احتجاج کیا گیا مگر وہ سب پرامن تھا نہ وہاں بسیں جلائیں گئیں، نہ املاک کو نقصان پہنچا، نہ ہی دوکانیں، تجارتی مراکز اور بینک لوٹے گئے۔ ایک دن میں ان مسلم ممالک میں احتجاج ہوا بھی اور ختم بھی ہو گیا۔ مگر ہم نہ جانے کیوں اپنی اور غیر کی تمیز بھول چکے ہیں شاید ہمارے رہبر ہی اب ناپید ہو چکے ہیں۔ جس کی جو مرضی ہوتی ہے وہ کر گزرتا ہے نہ سیاسی سوجھ بوجھ باقی ہے اور نہ اسلامی شعار کا ادراک ہے۔ قوم اب ہجوم میں تبدیل ہو چکی ہے اور ہجوم جس طرف بھی نکل جائے وہاں تباہی اور بربادی کا

سماں دیکھنے میں آتا ہے جو گذشتہ کئی سالوں سے اب بڑھ کر بگڑے معاشرے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ حلال اور حرام کی تمیز اب ختم ہوتی جارہی ہے، سمجھ میں نہیں آتا یہی لاکھوں پاکستانی دیار غیر میں کیوں امن سے رہ رہے ہیں۔ اس ملک کے اچھے شہریوں میں شمار ہوتے ہیں ہر میدان میں اس ملک کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچا رہے ہیں اور اپنے ملک سے سچی محبت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست جو امریکہ میں رہتے ہیں ان کو ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ وہ پاکستانی چینلز اور اخبارات سے دور رہیں۔ ان کا بلڈ پریشر سے دل و دماغ بہت متاثر ہو چکا ہے جب ان کو بہت زیادہ گھبراہٹ طاری ہوتی ہے تو وہ مجھے فون کر کے اپنے اندر کی گرمی اتارتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے دعوت دیتے ہیں کہ میں چند دن یا ایک آدھ ہفتہ امریکہ میں ان کے ساتھ گزاروں۔ ایسے میں انہوں نے مجھے امریکہ کے شہر ہوائی (Hawai) جو جاپان سے دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کو ملی تھی گھومنے کی دعوت دی۔ میں بھی یہاں کے حالات سے پریشان تھا، چنانچہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ہونولولو جو ہوائی (Hawai) کا سب سے بڑا جزیرہ تھا 19 گھنٹے کی ہوائی جہاز کی مسافت سے پہنچا اور ان کے ساتھ ایک ہفتہ گزارا۔ اس میں 6 بڑے جزیرے تھے ایک ایک کر کے دیکھے اور موسموں سے بہت لطف اندوز ہوئے، کھلے صاف ستھرے سمندروں پر اچھے اچھے ہوٹلز اور ہر طرح کے ریسٹورینٹس میں کھانے کھائے۔ یہاں کی ترقی بھی قابل تعریف تھی ایک جزیرہ پر گئے اس میں 90 فیصد بجلی پن چکیوں اور دھوپ کے سولرز سے پیدا کی جارہی تھی جس سے ان کی صنعتی ضرورت بھی پوری کی جارہی ہے۔ ساتھ ساتھ زمینی فصلیں جن میں گنا، ناریل اور پستہ سرفہرست ہے۔ اسی مصنوعی بجلی سے فائدہ اٹھا کر زرعی ترقی کے راستے کھولے ہوئے ہیں۔ ہم آج تک اس طرف توجہ بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہیں خود اپنے ملک کا کوئلہ ہم آج تک نہیں نکال سکے۔ اس دوران ہم ایک جزیرے پر گئے وہاں سے 2 گھنٹے کی ہیلی کاپٹر کی فلائٹ لی، اس جزیرے کا نام ماوئی (Maui) ہے۔ اس جزیرے میں ڈیڑھ 2 سو سال

سے زمین سے لاوا ابلتا رہتا ہے اور جہاز سے آپ خود آج بھی لاوا ابلتا دیکھ سکتے ہیں۔ آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل صاف نظر آتے ہیں تو اس جزیرے کے چند منٹ کے فاصلے پر سمندر ہے اس کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کا سلسلہ جڑا ہوا ہے۔ اللہ کی قدرت ان سرسبز پہاڑوں سے قطار در قطار میٹھے پانی کے چشمے پھوٹے ہوئے ہیں جو سمندر میں گر کر عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی وادی میں یہی ہیلی کاپٹر چکر لگا کر اس قدرتی مناظر کو دکھاتا ہے۔ اگر کوئی ہوائی جائے اور اس ہیلی کاپٹر کے 2 گھنٹوں کی سواری نہ کرے تو سمجھیں اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس لاوے کے ساتھ ساتھ گاؤں بھی آباد ہیں جو لاوے کی زد میں بھی آتے رہتے ہیں مگر یہاں کے رہنے والے اس جزیرے سے اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ وہ اس کو چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ شام کو جب سورج غروب ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ سمندر میں ایک سونے کا تھال اندر جا رہا ہے اور سمندر کی سطح سرخی سے مخمور ہو جاتی ہے۔ عوام اس سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کا نظارہ کرتے ہیں اس طرح جب صبح سورج طلوع ہوتا ہے، پھر ایسا ہی نظارہ دوبارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ان جزیروں کو دور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں جن میں جاپانی سیاح سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے آباؤ اجداد کا کبھی ملک ہوتا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر یہیں سے بم گرایا گیا تھا اس کا نام "پرل ہاربر" ہے جواب امریکہ کا حصہ مانا جاتا ہے۔ یہاں جاپانی، امریکن مکس نسل پیدا ہو چکی ہے۔ مگر ان کی ناکیں ویسی ہی چپٹی چپٹی ہیں اور آنکھیں بھی جاپانیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ہیں۔ مگر وہ اب جاپانی طرز سے ملتی انگریزی بولتے ہیں ایک ہفتہ معلوم ہی نہیں ہوا۔ سوچا ایک ہفتہ کینیڈا میں بھی گزارا جائے، کم از کم امن سے تو گزر جائیگا۔ واپس پھر اپنے ہی ملک جانا ہے جیسا بھی ہے آخری پناہ گاہ بھی تو ہے۔ اس کو چھوڑ کر کہاں جائینگے۔

شرم الشیخ کی کہانی

جب سے ہمارے وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی صاحب مصر کے شہر شرم الشیخ کانفرنس سے واپس لوٹے ہیں جہاں بھارت کے وزیر اعظم من موہن سنگھ صاحب سے ان کے مذاکرات بہت کامیاب گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے بھارتی لوک سبھا (قومی اسمبلی) میں اپوزیشن نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے روزان سے بازپرس کی جا رہی ہے کہ من موہن صاحب آپ نے بلوچستان میں بھارت کی مداخلت کو کیسے تسلیم کر لی اور انکوائری کا وعدہ کیوں کیا؟ بھارت کے سیاستدان خواہ کانگریس سے ہوں یا بی جے پی سے جب بھی برسر اقتدار آتے ہیں تو ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ مسئلہ کشمیر پر کوئی بات چیت نہیں کی جائے جب ماضی میں نواز شریف دور میں بھارتی وزیر اعظم واجپائی صاحب جن کا تعلق بی جے پی سے ہے لاہور تشریف لائے تو کانگریس نے ان کی بہت مخالفت کی اور اس کو بھارتی موقف ''اٹوٹ انگ'' سے انحراف بتایا۔ عوام اور اسمبلی میں جا جا کر اس کے خلاف تقاریر کیں جس سے بی جے پی کو الیکشن میں نقصان اٹھانا پڑا اور آہستہ آہستہ اس کی وجہ سے مرکز ہاتھ سے نکل گیا اور اندرا گاندھی کے بعد سونیا گاندھی نے الیکشن میں بڑی ہوشیاری سے سیٹیں جیتیں اور مرکز میں حکومت بنا ڈالی اور وہی کچھ انہوں نے دوسرے الیکشن میں بھی کیا۔ ابھی چند ریاستوں میں الیکشن باقی ہیں اگرچہ مرکز میں کانگریس ہی کی حکومت ہے مگر بی جے پی کی پوری کوشش ہے کہ ان بقایا الیکشنوں کے نتائج اپنے حق میں پھیر لے

اور مرکزی حکومت کو کمزور کرے اس وجہ سے وہ وزیر اعظم من موہن سنگھ کے پیچھے بری طرح ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور وہ اپنے تمام جلسوں میں پاکستان کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو بدنام کر کے پاک بھارت دوستی اور مفاہمت کی فضا کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے وزیر اعظم گیلانی صاحب کا واپسی کے بعد سے لب و لہجہ تبدیل ہوتا نظر آ رہا ہے جس سے وہ پارلیمنٹ کی بالادستی چاہتے ہیں یعنی وہ صدارتی بالادستی کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں کئی صدارتی احکامات بھی نہیں مانے۔

ممبئی دہشت گردی میں سلامتی امور کے مشیر کو بھی فارغ کیا، کئی سیکٹریز کی سمری بھی روک رکھی ہے۔ بیرون ملک میں وہ سفارتی عہدے بھی خود ہی پُر کر رہے ہیں۔ اچانک دوروں کا سلسلہ پھر وزراء سے ناراضگی بھی وہ دکھا رہے ہیں۔ خصوصاً وہ وزراء جو صدر صاحب کے منظورِ نظر ہیں اور ان پر ان کی نظر خصوصی طور پر ہے۔ عملاً تو وزراء کی کارکردگی مشرف حکومت سے بھی نیچے جا چکی ہے خصوصاً بجلی کی لوڈشیڈنگ جس میں ان کے وزیر بجلی و پیداوار بار بار یہ کہتے نہیں تھکتے کہ دسمبر تک لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس وزیر اعظم کا یہ بیان ہمارے پاس الہ دین کا چراغ تو نہیں ہے جو ہم لوڈ شیڈنگ پر قابو پا لیں گے جب وزیر اعظم صاحب سے پوچھا کہ آپ ہی کے وزیر یہ لوڈشیڈنگ ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں تو انہوں نے جھنجلا کر کہا کہ مجھے نہیں معلوم وہ کیسے کر سکتے ہیں انکی وزارت والوں نے اس لوڈشیڈنگ کے خاتمے کیلئے کروڑوں روپے کے اشتہارات بھی پورے ملک میں شائع کروائے ہیں جس میں باقاعدہ 3500 میگاواٹ بجلی دسمبر تک دینے کا وعدہ درج ہے اس کا شیڈول بھی دیا گیا ہے ھنوز دلّی دور است۔

آج سے دو سال قبل میرے ایک دوست جو دبئی میں ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتے تھے اس کمپنی کے مالکان نے اپنی سالانہ سیلز کانفرنس اسی شرم الشیخ میں رکھی تھی جو 5 روز جاری رہی۔ واپسی پر میرے

پاکستانی دوست نے مجھے فون پر شرم الشیخ کی اتنی تعریف کی کہ سمندر کے کنارے اور پہاڑوں کے بیچوں بیچ جنت نما جزیرہ ہے اگر شرم الشیخ نہ دیکھا تو سمجھیں کچھ بھی نہیں دیکھا وغیرہ وغیرہ۔ جتنے مقامات وہ گنوا سکتے تھے یقیناً وہ بڑھا چڑھا کر گنوا دیئے۔ اتفاق سے میں نے مصر نہیں دیکھا تھا سوچا چلو اس ملک کو بھی دیکھا جائے۔ قاہرہ، اسکندریہ اور شرم الشیخ کا ایک ہفتے کا پروگرام بنایا میرے ایک دوست بھی ساتھ ہو گئے۔ پہلے ہم قاہرہ ائیر پورٹ پر اترے جو بہت واجبی سا ائیر پورٹ تھا۔ ہمارا کراچی اور لاہور کا ائیر پورٹ اس کے آگے بہت خوبصورت ہے باوجود اس امر کہ صرف قاہرہ میں ایک کروڑ سیاح اہرام مصر اور فرعون کے عجائب گھر کو دیکھنے آتے ہیں۔ میرا یہ ہفت روزہ پروگرام بھی میرے دبئی والے دوست نے ترتیب دیا تھا۔ اس کی مرضی کے ہوٹل، سیاحت، اہرامِ مصر، فرعون کا عجائب گھر، اسکندریہ کے تاریخی مقامات، شرم الشیخ میں سیاحتی جگہیں، کروز (سمندری بڑے جہاز) کی سیر تفریح شامل تھی۔ قاہرہ میں اہرامِ مصر دیکھے یقین نہیں آیا جب پتھروں کے دور میں بجلی اور کرینیں موجود نہیں تھیں تو یہ کئی ٹنوں وزنی تراشے ہوئے پتھر پہاڑوں جیسی اونچائی میں کیسے چڑھائے گئے ہونگے۔ ہر پتھر ایک ہیرہ تکون شکل میں بنا کر ایک دوسرے سے ملا کر رکھنا شاید آج بھی ناممکن ہے اسی وجہ سے یہ اہرامِ مصر دنیا کے چند عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ شہر قاہرہ ہمارے کراچی کی آبادی کی طرح بہت گنجان ہے مگر اہرامِ مصر قاہرہ کے مضافات میں پایا جاتا ہے۔ راستے میں بہت غربت دیکھی۔ عمارتیں بیشتر ہماری کچی آبادی کی مماثلت رکھتی تھیں۔ بہت سی عمارتوں کو جو شاہراہوں پر بنی تھیں کسی پر بھی اینٹوں پر پلاستر نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو میرے رہنما نے بتایا کہ ان کے پاس پلاستر کے پیسے نہیں بچے جب کبھی کئی سال بعد پیسے بچیں گے تو وہ پلاستر کروالینگے۔ قاہرہ میں فرعون کے عجائب گھر بھی گئے۔ بڑے بڑے پُرانے مصر کے بادشاہوں کے پتھر سے بنی خوبصورت مورتیاں بھی رکھی تھیں۔ اس زمانے کی ممی بھی دیکھی اگرچہ وہ ہزاروں سال پہلے (Preserve) محفوظ کیا گیا تھا اب وہ کالی پڑ چکی

ہیں۔اس عجائب گھر کی عمارت خود بھی عجائب گھر لگ رہی تھی جگہ جگہ سے اہرامِ مصر کی طرح پلاستر پھٹ چکا تھا۔اس کا ملبہ بھی اسی طرح نیچے پڑا تھا صرف اس زمانے میں ایئر کنڈیشنر نہیں ہوتا تھا مگر یہ عمارت ایئر کنڈیشنر تھی۔ہزاروں سیاح گاڑیوں، بسوں، بڑکوں میں بھر بھر کر آتے ہیں اور تقریباً ایک دن درکار ہوتا ہے۔آپ اس کی تاریخ کے حساب سے دیکھیں تو اس زمانے کی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔قاہرہ شہر میں امیر لوگ رہتے ہیں۔بڑے بڑے فائیو اسٹار ہوٹل دریائے نیل کے دونوں طرف بنے ہوئے ہیں۔اگرچہ کافی مہنگے ہیں مگر رات کو دریائے نیل (جس میں فرعون مع اپنے لشکر غرق ہوا تھا) روشنیوں سے جگمگاتا ہے۔ایک عجیب سماں پیدا ہوتا ہے۔اسی دریا میں رات کا کھانا ایک کروز میں بُک تھا۔وہاں رات 10 بجے شروع ہوتی ہے۔ہماری طرح مصری بھی رات گئے دیر تک جاگتے ہیں اور کھانا 11 بارہ بجے کھاتے ہیں۔ہمیں علم نہیں تھا کہ کروز پر کیا پروگرام ہوگا۔ہم وقتِ مقررہ پر یعنی 10 بجے وہاں پہنچے۔کروز کے ایک طرف کھانے کا انتظام تھا، بوفے تھا اس میں 20 پچیس اسٹائلز عربی قسم کی سبزیاں، سلاد، پنیر، کھجور، زیتون، ہولی، ٹماٹر، سموسہ نما تلی ہوئی چیزوں کے علاوہ ہمہ اقسام کا باربی کیو، گوشت اور چاولوں پر رکھی ہوئی ران، دسیوں قسم کے میٹھے رکھے ہوئے تھے۔پہلے مشروبات کا دور چلا۔بہت ہی عمدہ تازہ جوس اور دوسرے کونے میں بار تھا جس کو جو پیا ہو وہ خود جا کر پی سکتا ہے بیرے والی سروس نہیں تھی۔کول ٹیبلیں لگیں تھیں درمیان میں اسٹیج تھا۔جب کھانے کا دور ختم ہوا تو اسٹیج پر رنگ برنگی لائٹیں جلنے لگیں پھر ڈھول اور مصری طرز کی موسیقی شروع ہوئی تو ایک نوجوان حسینہ تھرتھراتی نمودار ہوئی پھر جو دھما چوکڑی ہوئی اور ایسے ایسے ناچ پیش کیے گئے کہ یورپ میں بھی ایسے بے پردگی اور بے ہودگی نہیں دیکھی تھی جو مصر جیسے اسلامی ملک جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ جامعہ الازہر یونیورسٹی بھی ہے جس سے لاکھوں علماء نکل کر پوری دنیا میں پھیلے اور اسلام کی تبلیغ کی۔مگر آج اسی کے دامن میں اتنی آزادی یقین نہیں آتا۔دوسرے دن شہر گھومنے کا موقع ملا جگہ جگہ مسجدیں بھی بہت تھیں

۔مغرب اور عشاء کی مصری طرز کی اذانوں نے بھی بہت متاثر کیا۔پرانے بازاروں میں نہانے کے حمام بھی دیکھے، بڑے بڑے پتھروں سے بنی عمارتیں اور نئے نئے پلازے دیکھے پھر وہاں سے شرم الشیخ بذریعہ ہوائی جہاز جو صرف 2 گھنٹے کی مسافت طے کر کے پہنچے۔جس ہوٹل میں ہمارا کمرہ بُک تھا ایئر پورٹ سے وہاں پہنچے۔اس کا نام Sun Rise (طلوع آفتاب) تھا اس میں 1400 سے زائد کمرے تھے۔10 بارہ سوئمنگ پول کے علاوہ سمندر کا کنارہ بھی تھا ہر سوئمنگ پول پر مشروبات کے کاؤنٹر تھے۔میرے دوست نے تین دن کیلئے فُل بورڈ یعنی تینوں وقت کا کھانا سب شامل تھا بُک کروایا تھا۔دن بھر تو ٹھیک رہا مگر جیسے ہی اندھیرا بڑھا سوئمنگ پول پر جو لڑکوں اور لڑکیوں کی یلغار ہوئی وہ مناظر قلم بند نہیں ہو سکتے۔الغرض رات جیسے تیسے کاٹی اور صبح ہی واپسی کا ارادہ کر کے بغیر اسکندریہ دیکھے کراچی روانہ ہو گئے۔جس سمندر پر ہم ٹھہرے ہوئے تھے کئی میلوں تک صرف ہوٹل اور ریسٹورینٹ تھے۔اسرائیل نے اس دوستی کے عوض دیگر علاقوں کے علاوہ خصوصاً یہ شرم الشیخ کا علاقہ مکمل مسمار کر کے میدان کی صورت میں واپس کر دیا اس کے پہاڑی علاقوں میں آج بھی بدو رہتے ہیں وہ وہاں سڑکیں اور بجلی نہیں لانے دیتے۔ان کا کہنا ہے کہ نیچے شہر میں بے حیائی بھری پڑی ہے وہ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔اس پرانے اسلامی ماحول میں خوش ہیں۔اپنی عورتوں اور نوجوانوں کو شہر میں نہیں جانے دیتے۔شرم الشیخ کا ہوائی اڈہ سعودی عرب کے ایک پرنس نے تحفتاً بنا کر دیا ہے۔اس شہر میں ان کے اور موجودہ حکمران حسنی مبارک صاحب اور فیملی کے افراد کے سب سے زیادہ ہوٹل ہیں۔خود حسنی مبارک نے اپنا محل بھی یہیں بنا رکھا ہے جس میں سرکاری ضیافتیں ہوتیں ہیں اور وہ سال کا بیشتر حصہ یہیں گزارتے ہیں۔خلیجی ممالک کے سربراہان شرم الشیخ کی تاریخ جانتے ہیں اور وہ چھٹیاں گزارنے کیلئے بیروت کی تباہی کے بعد اس شہر کو ترجیح دیتے ہیں۔کئی سال پہلے اس بے حیائی سے تنگ آ کر پہاڑی بدوؤں نے نیچے اُتر کر ان ہوٹلوں پر حملہ بھی کیا تھا جس میں بہت سے غیر ملکی مارے گئے مگر صدر حسنی مبارک نے سختی

سے ان کو گھیر گھیر کے مروا دیا اور پہاڑی علاقوں پر چیک پوسٹ بنا دی گئیں اور وہ اسلام پسند افراد کو چیک کر کے ہی آنے جانے دیتے ہیں جس پر شک ہو جائے اس کا بعد میں پتہ بھی نہیں ملتا۔ کم لکھے کو ذیادہ پڑھا جائے تو شرم الشیخ کی کہانی سمجھ میں آجائے گی۔ میں دو سال سے اس کو چھپائے ہوئے تھا مگر جب ہمارے وزیراعظم وہاں جا کر آ گئے تو مجھ میں بھی لکھنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔

کینیڈا میں ایک ہفتہ

خدا خدا کر کے پاکستان میں سیاسی حالات کچھ بہتر ہوئے ججز بحال ہوئے چیف جسٹس بھی بحال ہو گئے ۔کینیڈا سے ہمارے بہت پرانے سیاسی دوست بیرسٹر انور نقوی صاحب جو 30 سال پہلے پاکستان کی سیاست اور ملکی حالات کی وجہ سے کینیڈا میں جا کر آباد ہو گئے تھے ہر سال پاکستان سردیوں میں آتے تھے اور کینیڈا آنے کی دعوت دیتے تھے ۔صبح ہی صبح فون پر مبارک باد دی کہ اب ملک میں عدلیہ کی آزادی ہو گی عوام کو انصاف ملنے کی توقع ہو رہی ہے ساتھ ساتھ پھر کینیڈا آنے کی دعوت دی سوچا ایک ہفتے کیلئے کینیڈا گھوم آؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا بہت خوش ہوئے اکثر امریکہ تو جاتا ہی رہتا تھا سوچا 15 سال بعد موقع مل رہا ہے کینیڈا پہنچ گیا۔ کینیڈا دنیا میں سویڈن کے بعد دوسرے نمبر پر انسانی حقوق کی آزادی کا علمبردار مانا جاتا ہے جہاں انسانوں کا ہی نہیں جانوروں، پرندوں اور درختوں کا ذمہ بھی حکومت لیتی ہے ۔اگر کسی پرندے کو بھی نقصان پہنچایا تو اس پر اسی طرح سزا ملتی ہے جتنا کسی انسان کو نقصان پہنچانے پر ملے گی۔ کینیڈا کے سب سے بڑے شہر ٹورنٹو جس کی آبادی صرف 57 لاکھ ہے۔ اس شہر کی اکثریت باہر سے آئے ہوئے چینی، بھارتی، کورین اور پاکستانی ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا علاقہ ہونے کے باوجود کینیڈا کی کل آبادی کراچی سے صرف دگنی یعنی سوا تین کروڑ ہے۔ بہت سرسبز جھیلوں، دریاؤں، پہاڑوں اور سمندر کی وجہ سے جنت نظیر ملک ہے۔ یہاں انصاف اور تمام مذاہب کی

مکمل آزادی ہے۔جگہ جگہ بے پناہ مساجد،مندر،گردوارے اور گرجا گروں کی بہتات ہے۔اسلام کے بنیادی اصولوں جس میں انصاف، معاشی سہولتیں، تعلیم، علاج معالجہ سب حکومت کی ذمہ داری میں شمار ہوتا ہے ہر کینیڈین کا حق سمجھا جاتا ہے۔یہاں ایک بھی پرائیویٹ ہاسپٹل بنانے کی اجازت نہیں ہے نہ ہی امریکہ کی طرح پرائیویٹ یونیورسٹی ہے البتہ ہر مذہب کو اجازت ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اسکی تعلیم دے۔یہاں مسلمانوں کیلئے حلال گوشت ہی نہیں تمام حلال اشیاء با آسانی فراہم ہیں۔بہت سے کھانوں، چاکلیٹ، بسکٹ سمیت حلال ہر جگہ دستیاب ہیں۔کینیڈا میں جگہ جگہ اسلامی فاؤنڈیشن والوں نے مساجد کے ساتھ ساتھ اسکول کھول رکھے ہیں جہاں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور سب سے بڑی بات ان پر سختی سے عمل بھی کیا جاتا ہے۔قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں کوئی بھی شخص قانون توڑنے کا نہیں سوچ سکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو یا ایک معمولی ورکر ہو وہ غلطی کرنے پر سزا سے نہیں بچ سکتا۔یہاں سب سے بڑا جرم جھوٹ بولنا ہے۔غلط بیانی یا غلط معلومات فراہم کرنے پر کمپنیوں پر زبردست جرمانہ ہوسکتا ہے۔اگر کسی اشیاء کے لیبل پر غلط بات ثابت ہو جائے تو ایک عام شہری اس بڑی سے بڑی کمپنی سے ہرجانہ وصول کرسکتا ہے۔اگر آپ کو چیز خریدنے کے بعد پسند نہ آئے تو آپ بل دکھا کر واپس کرسکتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے البتہ ہم نے اس کو چھوڑ دیا بلکہ ہمارے پاکستان میں بہت سے کیش میمو پر لکھا ہوتا ہے ''فروخت شدہ مال واپس یا تبدیل نہیں ہوگا'' خواہ وہ مال خراب ہی کیوں نہ ہو۔مگر ان غیر مسلموں نے اسلام کے اس سنہری اصول کو اپنا کر اپنی معیشت کو مستحکم کرلیا ہے جس طرح خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بیت المال سے غرباء کی مدد کی جاتی تھی۔کینیڈا میں کوئی بھوکا نہیں مرسکتا تمام علاج معالجہ، تعلیم مفت ہے۔بے روزگاری الاؤنس، بزرگوں اور بوڑھوں کو رہائش فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔65 سال کے ہر باشندے کو 900 ڈالر الاؤنس ملتا ہے تاکہ بڑھاپے میں وہ اپنا گزارا کرسکے۔کینیڈین باشندے بات کے پکے اور سچے، بہت خوش اخلاق ہوتے ہیں، ہر ایک کی مدد کو تیار

ہوتے ہیں۔بہت پرسکون ملک ہے۔امریکہ اور دوسرے ممالک کی طرح کینیڈا پر ایشیائی باشندوں کے سلسلے میں بہت دباؤ ہے۔اس ملک کو بہت مین پاور کی ضرورت ہے ہر سال لاکھوں افراد کو دنیا بھر سے کینیڈا امیگریشن ملتی ہے جو 3 سال کے بعد کینیڈا کا پاسپورٹ دے دیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اصلی کینیڈین اب اقلیت ہوتے جارہے ہیں۔مقامی کاروبار باہر سے آئے ہوئے باشندوں کے پاس ہے جبکہ امریکہ کی تجارت میں مکمل عمل داری ہے۔امریکی ہر شعبہ میں چھائے ہوئے ہیں جیسا اوپر لکھا ہوا ہے کینیڈین باشندے بہت شریف النفس ہوتے ہیں یہاں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ہر سال لاکھوں افراد دنیا بھر سے نیاگرا آبشار دیکھنے آتے ہیں جو دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔مذاہب کی جتنی آزادی کینیڈا میں ہے شاید اتنی مسلمانوں کے فرقوں میں پاکستان میں بھی نہیں ہے۔مجھے بتایا ایک نئے علاقے میں جب وہ آباد ہوا تو ایک جگہ کیلئے مسلمانوں نے مسجد بنانے کی اجازت مانگی اور اسی مخصوص جگہ کیلئے چرچ کی بھی اجازت مانگی گئی تو حکومت نے مسلمانوں کو مسجد بنانے کی اجازت دی اور کہا کہ چرچ یہاں سے کچھ فاصلہ پر موجود ہے جبکہ مسلمانوں کی عبادت گاہ دور دور تک نہیں ہے۔یہاں کا موسم سردیوں میں بہت سرد یہاں تک کہ درجہ حرارت منفی 20 سے 25 تک ہو جاتا ہے جو 7 آٹھ ماہ تک رہتا ہے۔گرمیاں صرف 4 ماہ تک ہوتی ہیں صرف انہی 4 ماہ تک وہ کاشتکاری کرکے پورے امریکہ کو پھل سبزیاں، گیہوں، کارن فراہم کرتے ہیں جبکہ ہم پورے سال کاشتکاری کرکے بھی اچھی طرح فصل نہیں اُگاتے۔نہ ہمارے پاس جدید آلات ٹیکنالوجی ہے، ہمارے پاس تو اصلی کھاد اور دوائیاں تک دستیاب نہیں ہے۔صرف کینیڈین امریکن باڈر سے کنٹینروں کے ذریعے ایک ارب ڈالر روزانہ کی تجارت ہوتی ہے جو خالص کینیڈین اشیاء ہوتی ہیں البتہ کینیڈا امریکہ سے صرف 25 فیصد مال درآمد کرتا ہے۔امریکہ کو سب سے زیادہ بجلی نیاگرہ آبشار سے فراہم کی جاتی ہے۔

کینیڈین حکومت اپنے باشندوں کو علاج معالجے کے متعلق بہت سی اہم معلومات بھی فراہم کرتی رہتی

ہے۔صحت سے متعلق اکثر معلومات کتابوں ،اشتہارات ،کمیونٹی سنٹر؛ ہسپتالوں میں سیمینار منعقد کر کے فراہم کرتی ہے ۔اتفاق سے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں کے مقامی اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی وہ کینسر کے علاج سے آگاہی کے متعلق تھی ۔میں نے وہاں جا کر وہ سیمینار اٹینڈ کیا جو نہ صرف مفت تھا بلکہ شرکاء کیلئے ہائی ٹی بھی رکھی گئی تھی ۔پورا ایڈیٹوریم بھرا ہوا تھا موضوع تھا کہ آپ آنتوں کے کینسر سے کیسے بچ سکتے ہیں ۔آج پوری دنیا میں آنتوں کے کینسر سے ہر سال لاکھوں افراد مر رہے ہیں ۔میں اس سیمینار سے حاصل شدہ معلومات اپنے پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کو فراہم کر رہا ہوں ۔ایک گھنٹے کے لیکچر میں انہوں نے بتایا کہ آنتوں میں کینسر کیسے شروع ہوتا ہے اور اس کے آثار کیسے پیدا ہوتے ہیں اور بچاؤ کے کیا طریقے ہیں؟ان کے پروفیسر نے بتایا کہ آنتوں کے کینسر سے بچاؤ کیلئے اکثر 50 سالہ مرد اور عورتوں کو چاہئے کہ اپنے ڈاکٹر کی معرفت اسکی تشخیص کروائے اس کی (CT-COLONOGRAPHY) سی ٹی کولونوگرافی کروا کے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی آنتوں میں ایک قسم کی گٹھلیاں چھوٹی چھوٹی آنتوں سے چپک جاتی ہیں جس کو با آسانی آنتوں سے الگ کر کے مریض کی جان بچائی جا سکتی ہے ۔اگر یہ شروع میں نہیں الگ کی گئیں تو خطرہ مزید بڑھنے کی صورت میں لاعلاج ہو سکتا ہے اسی وجہ سے دیر میں تشخیص کی وجہ سے ہمارے ملک میں 65 سے 70 سال کے مرد،عورت آخری اسٹیج میں پہنچ جاتے ہیں اس وقت کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے پھر مریض بستر پر لیٹے لیٹے موت کی گھڑیاں گن کر مر جاتا ہے ۔جب مرض کی علامات شروع ہو جاتی ہیں تو مریض کو ڈائریا یا قبض کی شکایت ہوتی ہے ۔پھر پاخانے میں خون آنا شروع ہو جاتا ہے یا پھر پاخانے کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے ۔بہت سے مریضوں کو پیٹ میں اکثر درد رہتا ہے جب یہ کینسر میں تبدیل ہوتا ہے تو اچانک بغیر کسی وجہ کے وزن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بہت سے مریضوں میں ایسی علامات ظاہر نہیں ہوتیں اس لئے بہتر ہے کہ 50 سال کے بعد ہر 5 سال بعد دوبارہ ٹیسٹ کروالیں یہ کوئی

مشکل ٹیسٹ نہیں ہے ۔علامات کا انتظار نہ کیا جائے یہ کسی وقت بھی کسی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے ۔جوں جوں یہ مرض بڑھے گا اس کے ٹیسٹ بھی پیچیدہ ہوتے جائیں گے ۔اس طرح اس کا علاج بھی مشکل ہوتا جائے گا ۔ہمارے ملک میں صرف پولیو اور ڈینگی بخار تک ہی عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے ۔پروفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا اکثر عورتوں میں چھاتی کا کینسر بچوں کو اپنا دودھ نہ پلانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور 40 فیصد عورتوں کا چھاتیوں کا کینسر سگریٹ اور شراب پینے کی وجہ سے تشخیص ہوا ہے ۔ہماری حکومت کو بھی چاہئے کہ عوام کو ان کے علاوہ دوسری خطرناک بیماریوں سے پیشگی آگاہ کرے ۔

ایک ہفتے کینیڈا میں رہنے کے بعد یہاں کا سکون ،انصاف ،قانون کی حکمرانی ،سڑکوں کی صفائی ستھرائی دیکھ کر دل نے کہا کاش کوئی پاکستان میں بھی ایسا نظام لے آئے جس کیلئے ہم نے یہ ملک بنایا تھا۔

کینیڈا کی سیر

امریکہ سے ملحق کینیڈا جانے کا اکثر اتفاق رہتا ہے اس سال گرمیاں آنے سے قبل اس ملک میں جانے کا اور ایک ماہ رہنے کا موقع ملا۔ بہت قریب سے اس ملک کا مطالعہ کیا۔ دنیا میں جنت کا گمان ہوتا ہے بہت مہذب قوم ہے۔ اتنا بڑا ملک ہے جس میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانے میں 10 دس گھنٹوں کا سفر درکار ہوتا ہے۔ ایک کروڑ اسکوائر کلومیٹر والے ملک کی آبادی صرف ساڑھے تین کروڑ سے بھی کم ہے۔ خوبصورت سڑکیں، مکانات ہی نہیں قدرتی حسن سے مالا مال دریا، جھیلیں، پہاڑ، نہریں، آبشار، سمندر، جنگلات سب کچھ اس ملک میں موجود ہے۔ جمہوریت کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے انسانی حقوق اگر صحیح معنوں میں کسی ملک میں رائج ہیں تو کینیڈا اب سے آگے نظر آتا ہے۔ بچوں کے ہی نہیں اس ملک میں عورتوں کے حقوق دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جانوروں، حیوانوں، چرند، پرند سب کے حقوق قانون میں نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے پالتو جانور کو بھی نہیں مار سکتے اور نہ ہی بھوکا مار سکتے ہیں۔ اگر پولیس کو معلوم ہو جائے تو آپ کو سزا ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ رات کا کھانا کھا کر گھر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں رات کے 12 بجے پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سامنے ایک ہرن کسی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی پڑا تھا ایمبولینس بھی ساتھ کھڑی تھی۔ ایک ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا اور جس گاڑی سے ٹکرایا اس کے ڈرائیور سے تفتیش کی جارہی تھی حالانکہ ساتھ والے جنگل

سے نکل کر وہ خود سڑک پر آیا تھا، سڑک کے کنارے بورڈ لگا تھا ''یہاں ہرن سڑک پر آسکتا ہے لہٰذا آہستہ گاڑی چلائی جائے''۔ اگر یہ ثابت ہوگیا کہ گاڑی والا اسپیڈ سے چلا رہا تھا تو اس کا چالان ہوگا اور پھر جرمانہ بھی ہوسکتا ہے۔ گاڑی والا اگر رات کے اندھیرے میں نہ رکے اور زخمی جانور مر جائے تو پولیس اس کی پوری طرح تفتیش کرتی ہے اور کھوج لگاتی ہے کس گاڑی سے ٹکرایا ہوگا۔ اس ملک میں آپ اپنے بچوں کو بھی نہیں مار سکتے اگر بچے نے اپنے ٹیچر سے شکایت کردی تو یہ ٹیچر کا فرض ہے کہ وہ پولیس کو اطلاع کرے پھر والدین کو تھانے میں بلا کر پولیس تنبیہ کرتی ہے یا اگر پھر وہ ماریں تو بچے کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے اور ماں باپ جو بھی اس میں ملوث ہوگا اس کو قید و جرمانہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق مرد کے برابر ہوتے ہیں۔ آپ اپنی بیوی سے زبردستی نہیں کر سکتے اگر عورت خوشی سے حقوق زوجیت نہ ادا کرے تو آپ اس سے زبردستی نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ خلاف قانون اور عصمت دری تصور ہوگا۔ ایک دعوت میں گئے تو ایک دوست نے بتایا۔ ان کے دوست کے ہاں دعوت تھی ایک مہمان نے میزبان کے لڑکے کو جو بہت خوبصورت تھا اس کے گال پکڑ کر پیار کردیا بچے کو برا لگا اس نے دوسرے کمرے میں جا کر پولیس کو (911) پر فون کردیا پولیس آئی لاکھ میزبان نے پولیس سے اپنے مہمان کو بچانے کی کوشش کی مگر پولیس نے اس میزبان کو ڈانٹ دیا اور بچے کے کہنے پر اس مہمان کو تھانے لے گئے اور مقدمہ درج کرلیا۔ حالانکہ مہمان خود پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ کو ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا مگر قرائن قیاس ہے کہ اس مہمان کو سزا ہوسکتی ہے۔ بچوں کی پیدائش سے ہی بچوں کا وظیفہ حکومت مقرر کردیتی ہے۔ اسی طرح 65 سال کے بعد ہر کینیڈین کا پینشن بحال ہو جاتا ہے اور مرتے دم تک اس کو سینئر سٹیزن تصور کیا جاتا ہے۔ تمام سرکاری ٹرانسپورٹ مفت مہیا کی جاتی ہے ہر شہری کا مفت علاج معالجہ ہوتا ہے۔ اگر کسی شہری کا ملک میں علاج ممکن نہ ہو تو اپنے خرچے پر امریکہ۔ یا یورپ جہاں علاج ممکن ہو حکومت کرواتی ہے۔ کینیڈا میں تمام مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اس لئے تمام

مذاہب کی مکمل آزادی ہے۔ہر طبقہ، ہر فرقے کو آزادی کے ساتھ اپنی اپنی عبادات کرنے کی اجازت ہے۔اس سال محرم میں تو اہل تشیع کو محرم میں جلوس نکالنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔پولیس اسکارڈ اس جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔امن اور سکون کا نام کینیڈا۔2اڑھائی سو کلومیٹر کا سفر تو معلوم ہی نہیں ہوتا۔دنیا کا ایک بڑا (Mall) بھی کینیڈا میں واقع ہے جو تین لاکھ اسکوئر میٹر پر واقع ہے۔سب سے بڑا آبشار بھی کینیڈا میں ''نیاگرہ فال'' کے نام سے مشہور ہے جسے دیکھنے لاکھوں سیاح باہر سے کینیڈا آتے ہیں۔ہر 50 کلومیٹر کے اندر خوبصورت جھیلیں واقع ہیں ان کے کناروں پر خوشنما گھر بنے ہوئے ہیں۔ٹورنٹو سے 250 کلومیٹر پر ایک دریا جزیرہ نما ''ہزار آئیر لینڈ'' کے نام سے مشہور ہے۔جس پر ہزاروں گھر بنے ہوئے ہیں جو جزائر کی شکل میں واقع ہیں۔بہت مہنگے گھر ہیں اور صرف گرمیوں میں مالک مکان چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں۔یہ کینیڈا کے امیر ترین لوگوں کے ہیں صرف 5 ماہ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔جن پر صرف بڑی لانچوں یا بوٹس کے ذریعے آیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمد و رفت ممکن نہیں ہے۔کینیڈا میں 7 ماہ بہت سخت سردی بارشیں اور برفباری ہوتی ہے۔درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 25-20 تک کم ہو جاتا ہے۔بس یہی 7 ماہ تکلیف دہ ہوتے ہیں بقایا 5 ماہ ہر طرف ہرا بھرا ہوتا ہے۔کینیڈا کی فی کس آمدنی 35 ہزار کینڈین ڈالر ہے جو تقریباً امریکن ڈالر سے 5 فیصد کم ہوتے ہیں۔اس مناسبت سے مہنگائی کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک درجن اورنج جو کینیڈا میں پیدا ہوتے ہیں 8 سو روپے میں ملتے ہیں۔ایک درمیانی تربوز 500 روپے میں اور ایک کلو پپیتا 300 روپے میں ملتا ہے۔اسی طرح سبزیاں 300 روپے کلو سے کم نہیں ملتیں۔خواہ کدو، بھنڈی، کریلا ہی کیوں نہ ہو۔مرغی کا گوشت 4 سو روپے فی کلو ملتا ہے۔حلال گوشت مسلمان 100 روپے مہنگا کر کے بیچتے ہیں۔یہاں حلال اور حرام کی بہت احتیاط ہوتی ہے۔اسلامی سینٹر بہت متحرک ہیں۔یہاں تقریباً سوا لاکھ پاکستانی باشندے بستے ہیں انتہائی ڈسپلن میں رہتے ہیں۔جمعہ اور بقرہ عیدوں پر مساجد

بھری ہوتی ہیں۔ہر لحاظ سے پاکستان سے زیادہ بہتر اور اسلامی اقداروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ایک ماہ کے دوران بہت اچھے اچھے مقامات دیکھنے کو ملے مگر ایک آدھ پولیس کی گاڑی نظر آئی۔البتہ کسی بھی جگہ پولیس والا دیکھنے میں نہیں آیا۔لوگ خود قانون کی حفاظت کرتے ہیں۔حکومت کی حکمرانی قابل دید ہے ہر چیز مہنگی ہے حتیٰ کہ پاکستان سے بھی زیادہ مہنگا پیٹرول ہے اس کی وجہ کینیڈا پیٹرول تو پیدا کرتا ہے مگر آئل ریفائنری امریکہ میں ہے آنے اور جانے سے وہ امریکہ سے بھی مہنگا پڑتا ہے اور امریکی معاہدے کے مطابق کینیڈا اپنے ملک میں ریفائنری نہیں لگا سکتا ہے۔اسی طرح امریکہ کینیڈا سے بجلی خریدتا ہے کینیڈا ہر صورت امریکہ کو ناراض نہیں کر سکتا کیونکہ امریکہ 70 فیصد مال کینیڈا سے خریدتا ہے جبکہ کینیڈا امریکہ سے 51 فیصد امپورٹ کرتا ہے۔گویا کینیڈا کی معیشت امریکہ کی مرہون منت ہے۔کینیڈا دنیا کا واحد ملک ہے جس کی اس دباؤ والی معیشت میں پراپرٹی کے دام کم نہیں ہوئے بلکہ بہت جگہ دام بڑھ گئے ہیں۔اس کی وجہ کینیڈین حکومت اضافی مکانات نہیں بنانے دیتی جتنی ضرورت ہو اتنے ہی مکان بن سکتے ہیں۔ہماری طرح بلاضرورت کوئی مکان نہیں بنتا اور اسی طرح پراپرٹی ٹیکس بھی بہت زیادہ ہیں۔انکم ٹیکس بھی دنیا میں سب سے زیادہ یعنی 55 فیصد تک ہوتا ہے البتہ سیلز ٹیکس صرف 7 فیصد تک ہے۔ہر شخص ٹیکس دیتا ہے اور حکومت بہتر سروس دینے کی پابند ہے۔جانوروں کے حقوق پر یاد آیا میں اپنے دوستوں کے ہمراہ ''ہزار آئی لینڈ'' دیکھنے گیا تو سڑک کے کنارے ایک سرکاری بورڈ پر تحریر تھا کہ ایک کتا گم ہو گیا ہے۔اس کتے کی بیماری کا حوالہ تھا کہ وہ 10 دن سے فلاں بیماری میں مبتلا ہے اور اس کو 8 گولیاں فلاں دوا کی دی گئی ہیں اور اسکا 28 دن کا علاج باقی ہے۔کتا بہت فرینڈلی ہے اگر کسی صاحب کو ملے تو براہ مہربانی نزدیکی تھانے میں مطلع کرے یا کم از کم اس کا علاج ضرور کرائے ورنہ وہ مر جائے گا۔کینیڈا میں دو بڑی قومیں ہیں ایک انگریزی بولتی ہے تو دوسری فرانسیسی بولی جاتی ہے جو الگ الگ ملک بنانا چاہتی ہیں۔ہر دس سال بعد ان کا ریفرنڈم ہوتا ہے پچھلے ریفرنڈم میں

ان کو49فیصدووٹ ملے تھے اگر 50فیصد سے زائدووٹ مل جائیں تو وہ بھی اپنا ملک الگ کرلیں گے ۔یہ جمہوری روایت کی حد ہے ۔اگر آپ الگ ہونا چاہتے ہیں تو بے شک اکثریت کی بنیاد پر آپ الگ بھی ہوسکتے ہیں ۔کینیڈا کو بیرونی لیبر اور ہنرمند ہروقت درکار ہوتے ہیں ۔اس لئے امیگریشن ہروقت کھلی ہے آپ ان کے قوائد پورے کریں تو وہاں کی شہریت مل سکتی ہے ۔پچھلے 9/11 میں جب امریکہ نے بہت سختیاں کیں تو پاکستانیوں کیلئے کینیڈا نے انسانی کردار ادا کرتے ہوئے اپنی سرحدیں کھول دیں اور بارڈر پار کیمپ بھی لگائے اور انہیں کینیڈا میں آنے کی اجازت بھی دے دی ۔ایک ماہ کا پتہ نہیں چلا کہ کیسے گزر گیا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے مگر ہر کام خود کرنا پڑتا ہے کوئی گھریلو نوکر نہیں ہوتے ۔کھانا پکانا ہی نہیں ،گھر کی صفائی ستھرائی بھی خود کرنی پڑتی ہے ۔گھر کے باہر کی برف بھی خود ہٹانا پڑتی ہے ۔سردی کا موسم نہ ہوتو یہ جنت سے کم نہیں ہے ۔

استنبول کی سیر

پچھلے ہفتے راقم نے ترکی کے شہر ازمیر میں اعزازی قونصل کنونشن کی روداد لکھی تھی جسے قارئین نے کافی پسند کیا اور راقم کو کئی خطوط اور ای میلز میں ایسے معلوماتی کالم لکھنے کی استدعا کی تھی ۔اس کنونشن کے ایک ترک اعزازی قونصل جنرل جو استنبول میں رہتے تھے مجھے استنبول آنے کی دعوت دی راقم نے حامی بھر لی ۔اس سے قبل بھی استنبول جاتا رہا ہوں مگر گذشتہ 10 سال میں ترکی نے معاشی طور پر زبردست ترقی کرلی ۔خصوصاً کنسٹرکشن میں تو دنیا کے چند ممالک کی صف میں گنا جاتا ہے ۔بڑی بڑی عمارتیں اور شاہراہیں تو قابل دید ہیں ۔استنبول کا نیا ہوائی اڈا بھی اس میں شامل ہے جس میں بیک وقت دو ڈھائی سو جہازوں کے اُترنے کی گنجائش ہے ۔ایک زمانے میں ترکش ائیر لائن بہت چھوٹی ائیر لائنوں میں شمار ہوتی تھی اور ہماری قومی ائیر لائن پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائن کا شمار بڑی کامیاب ہوائی کمپنیوں میں ہوتا تھا ۔پھر پی آئی اے نے ترکش ائیر لائن کو نئے سرے سے ترقی دی ۔آج وہ دنیا کی بڑی ائیر لائنز میں شمار ہورہی ہے اور ہم دوسرے اور تیسرے درجے کی ائیر لائنز میں شمار ہوتے ہیں ۔تقریباً 50فیصد اسٹاپس (Stations) ہم نے کم کردیئے ہیں جہاز بھی ہمارے پرانے اور ناکارہ ہورہے ہیں ۔اربوں روپے خسارے میں بھی جا چکے ہیں ۔اس کے برعکس ترکش ائیر لائن اب دنیا کے ہر بڑے شہر میں آجارہی ہے اور اس کا ہوائی بیڑہ بھی ہم سے 20 گنا بڑا ہو چکا ہے ۔ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ نے 600 سال دنیا پر

حکومت کی اور پھر سمٹ سمٹ کر صرف ترکی تک محدود ہوگئی۔اس کی وجہ آخری دور میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلیفہ اور بادشاہ بڑے بڑے محلوں اور عیاشیوں میں لگ گئے۔آخری خلیفہ کے تین بڑے بڑے محل تھے۔ ایک انقرہ دوسرا ازمیر اور تیسرا استنبول میں واقع تھے۔جس کو 1923ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے آنے کے بعد ان تینوں کو قصرِ صدارت کیلئے ایک چھوٹے سے حصے کو زیرِ استعمال رکھا گیا جہاں پہلے صدر مصطفیٰ کمال رہائش پذیر تھے۔وہ محل استنبول کا سب سے خوبصورت محل سمجھا جاتا تھا۔جب مصطفیٰ کمال پاشا کا انتقال ہوا تو انہوں نے تینوں محل عوام کیلئے وقف کر دیئے۔آج دنیا بھر سے لاکھوں سیاح ان محلوں کو دیکھنے آتے ہیں ہم نے بھی اس محل کی سیر کی یہ محل 1843 میں سلطان عبدالمجید نے تعمیر کروایا تھا۔اس کی تعمیر میں 13 سال لگے۔بہت خوبصورت، جدید اور ترک اسٹائل دونوں آرٹ پائے جاتے ہیں۔اس محل کی ڈیڑھ لاکھ مربع فٹ کنسٹرکشن کی ہے جس میں 248 کمرے ہیں۔44 بڑے بڑے ہال ہیں اور 68 بیت الخلا کے ساتھ ساتھ 6 ترکش حمام ہیں۔حمام آج کے زمانے میں SOANA باتھ کی طرح ہوتے ہیں۔اس محل میں زنانہ علاقہ جہاں خواتین رہتی تھیں اس کو حرم کہتے ہیں وہاں کوئی غیر مرد نہیں جا سکتا تھا صرف اس وقت کے بادشاہ اور اس کی فیملی کیلئے مخصوص ہوتا تھا۔اس محل میں کئی حصے تھے جس میں مہمانوں کیلئے 27 کمرے وقف تھے۔جس میں بادشاہ کے مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔محل کے حرم کی تمام ذمہ داریاں مادرِ ملکہ کی ہوتی تھیں۔جس خاتون کو باہر جانا ہوتا تھا ملکہ سے اجازت لے کر ہی باہر جا سکتی تھی۔بادشاہ کی 4 بیویاں ہوتی تھیں اور لاتعداد کنیزیں، لونڈیاں الگ ہوتی تھیں۔جو حرم میں الگ الگ حصوں میں رہائش پذیر ہوتی تھیں۔اس محل میں ایک بہت بڑا ہال نیلے رنگ کا بھی تھا۔ترک باشندے نیلے رنگ کا بہت خیال رکھتے ہیں جس میں نظر بٹو بھی شامل ہے جو ہر گھر میں نمایاں کول پتھر سے بنا لٹکا ہوا نظر آئے گا۔ان کا خیال ہے کہ یہ حاسدوں کی نظر سے بچاتا ہے۔اس نیلے ہال میں رمضان کی تقاریب اور عید، بقرعید کی تقاریب کیلئے وقف ہوتا تھا۔صرف ایک کمرہ کمال اتاترک نے اپنے ذاتی

استعمال میں رکھا تھا ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا۔10 نومبر 1938ء میں کمال اتاترک کا اس کمرے میں انتقال ہوا۔اس بستر کو ترکی کے لال جھنڈے سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔اس کمرے کے ساتھ ان کا اسٹڈی روم بھی تھا جس میں کتابیں تھیں۔ایک بہت بڑا ہال جس میں تقریباً 10 ہزار افراد کی گنجائش تھی شاہی تقریبات کیلئے استعمال ہوتا تھا۔سردیوں کے دنوں میں اس کو گرم کرنے کیلئے تین دن درکار ہوتے تھے پھر تقریب منعقد ہوتی تھی۔البتہ پورے سال گرمیوں میں 40 فٹ کی اونچائی اور کھڑکیوں کی وجہ سے یہ محل سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے قدرتی ٹھنڈا رہتا تھا۔بڑے بڑے فانوس قابلِ دید آج تک لگے ہوئے ہیں۔جاپانی طرز کے کمرے بھی بنے ہوئے ہیں۔ایک سرخ ہال ہے اس کے بھی نقش و نگار قابلِ دید ہیں۔اس پنک ہال میں مادرِ ملکہ کی رہائش ہوتی تھی۔قالینوں سے مزین پورا حصہ بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے اور آج بھی ایسا لگتا ہے نیا بنا ہوا ہے۔جبکہ ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں جگہ جگہ فرنچ آرٹ بھی نمایاں ہیں۔

اس محل کے دروازے پر ہر چار گھنٹے کے بعد ایک سپاہی کی تبدیلی کی جاتی ہے اس سپاہی کے ہاتھ میں بندوق ہے اور یہ چار گھنٹے تک بغیر پلک جھپکائے ایسا کھڑا ہوتا ہے جیسے اٹیچو ہو عوام اس کے پاس کھڑے ہو کر تصویر کھچواتے ہیں۔محل کے بڑے بڑے دالان اور راہداریوں پر چل چل کر سیاح تھک جاتے ہیں ان کے ستانے کیلئے کرسیاں اور بنچیں رکھی گئی ہیں۔ہر 15 منٹ کے بعد گائیڈ کی موجودگی میں جو انگریزی اور ترکی زبان میں گروپ کی شکل میں سیاح روانہ ہوتے ہیں۔ایک گھنٹے کا ٹور ہوتا ہے 25 یورو یعنی 3000 روپے داخلے کا ٹکٹ ہوتا ہے۔صبح ہی سے سیاحوں کی بسیں بھر بھر کے اس محل کو دیکھنے آتی ہیں جس سے اربوں ڈالر صرف سیاحت کی مد میں ترکی کی معیشت مضبوط ہو رہی ہے۔استنبول کو مسجدوں کا شہر بھی کہتے ہیں لاتعداد بہت خوبصورت طرز کی مساجد قطار در قطار بنی ہیں۔خصوصاً ایک بلیو مسجد جس میں ایک لاکھ افراد کی گنجائش ہے عیدین اور جمعہ کیلئے بہت موزوں ہے۔یہاں بھی پرانے ترک طرز کے

میناروں سے مرقع بلیورنگ کی مسجد ہے۔اس کو دیکھنے بھی سیاح دور دور سے آتے ہیں۔استنبول دراصل ایشیاءاور یورپ کا سنگم ہے۔ایشیاء کی طرف پرانے مکانات اور بلڈنگیں ہیں جبکہ یورپ کی طرف استنبول بالکل جدید طرز پر تعمیر کیا ہے دونوں سروں کو ملاتا ہے۔تمام دن رات عوام ایک سے دوسرے سرے پر آتے جاتے رہتے ہیں۔جنوب میں اس استنبول کے علاقے میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار ہے۔بہت پرانا شہر ہے جس طرح استنبول یورپی نمونہ طرز پر بنا ہوا ہے۔اس مزار کے علاقے میں بہت سادہ گاؤں طرز کا شہر ہے۔یہاں خواتین باپردہ اور مرد بہت مذہبی رہتے ہیں۔غربت بھی ہے مگر سادگی سے طرز زندگی عام ہے۔جب قسطنطنیہ (استنبول کا پرانا نام) امیر معاویہ کے دور میں فتح ہوا تھا تو حضرت ابوایوب انصاریؓ بہت بیمار تھے پھر بھی اس فوج کے ہمراہ پانی کے جہاز میں یہاں پہنچے۔حضرت ابوایوب انصاریؓ وہ صحابی ہیں جنہوں نے حضور ﷺ سے سن رکھا تھا کہ جو فوج قسطنطنیہ فتح کرے گی وہ تمام کی تمام جنتی ہوگی۔اتفاق سے دورانِ جنگ ان کا جہاز میں انتقال ہوگیا۔آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی لاش سمندر میں نہ ڈالی جائے بلکہ قسطنطنیہ کی سرزمین میں دفن کی جائے۔اللہ کی شان لاش جہاز میں سلامت رکھی رہی اور جب مسلمان قسطنطنیہ فتح کر کے داخل ہوئے تو انہوں نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کو اس علاقے میں دفن کر دیا اور اس کے ساتھ مسجد بھی ہے۔یہاں بھی لاکھوں مسلمان ان کی قبر کی زیارت کرتے ہیں الغرض 4 دن استنبول میں خوب سیر کی ایک بڑے جزیرے پر بھی گئے جس کا نام پرنس آئی لینڈ ہے۔یہاں صرف گھوڑے کی سواری کی اجازت ہے آلودگی سے پاک رکھنے کیلئے وہاں ہر قسم کی گاڑیوں پر پابندی ہے۔یہ بہت بڑا خوبصورت جزیرہ ہے یہاں لوگ خصوصاً سی فوڈ جو بہت تازہ ہوتا ہے کھانے آتے ہیں۔ترک پاکستانیوں سے بہت محبت سے پیش آتے ہیں اور پاکستان کو اپنا دوسرا گھر تصور کرتے ہیں۔میرے میزبان نے بھی دل کھول کر استنبول کی سیر کرائی جو عرصے تک یاد رہے گی۔واپسی پر میں نے اس کو پاکستان آنے کی دعوت دی جو اس نے خوشی خوشی قبول کر لی۔ہم بھی اپنے وطن عزیز میں خیریت سے واپس آ گئے۔

ایک امیر ترین ملک

مسلمان ملکوں میں ایک بہت چھوٹا ملک برونائی دارلسلام جس کی آبادی 4 لاکھ سے بھی کم ہے اور جس کے صدر سلطان ال بلکیا ہیں ان کا شمار دنیا کی سب سے امیر ترین شخصیات میں ہوتا ہے جن کی صرف تیل کی آمدنی تقریباً 3 ہزار ملین یورو ہے پاکستانی کرنسی میں سالانہ 3 کھرب روپے بنتی ہے جبکہ پاکستان دنیا میں بڑا ملک ہے جس کی آبادی 16 کروڑ سے زائد ہے۔اس کا سالانہ بجٹ 10 کھرب سے کچھ زیادہ ہے۔صدر برونائی کا محل دنیا کے سب سے بڑے محلوں میں شمار ہوتا ہے۔اس محل میں صرف 1788 کمرے ہیں جس میں 257 کمروں کے باتھ روم سونے اور ڈائمنڈ سے آراستہ ہیں۔اس محل میں 110 گاڑیوں کے کھڑے کرنے کی گنجائش ہے۔مہمانوں کیلئے 650 سوئیٹ کمرے اضافی بھی موجود ہیں جس کے ہر کمرے میں 2 کروڑ روپے کی لاگت سے صرف فرنیچر رکھا گیا ہے۔سلطان برونائی کو سونے اور جواہرات سے بہت لگاؤ ہے۔ان کے کپڑوں میں سونے کی کشیدہ کاری (Embriodry) ضرور ہوتی ہے۔ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے یہ سونے کا چمچا منہ میں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ان کے پاس 6 چھوٹے جہاز، 2 ہیلی کاپٹر اور 747 جمبو جہاز بھی ہیں۔اس جہاز کی مالیت 100 ملین ڈالر ہے۔انہوں نے اس جہاز کو گھر کی آسائش کیلئے 150 ملین ڈالر خرچ کئے۔جس کمرے میں سلطان برونائی رہتے ہیں اس کے بستر بھی سونے سے آراستہ ہیں۔ان کے جہازوں میں

ٹیبل اور کرسیوں میں سونے کا استعمال کیا گیا ہے ۔بہت شاہ خرچیلے ہیں ۔تمام کٹلری بھی سونے کی بنی ہوتی ہے ۔ایک سے ایک بڑھ کر مہنگی گاڑیاں جن کا شمار 5ہزار سے زائد ہے ۔بعض گاڑیاں ان کی فرمائش پر ڈیزائن کی جاتی ہیں تا کہ وہ صرف منفرد گاڑیوں میں گھومیں ۔ایک اندازے کے مطابق 531مرسڈیز، 367فراریز، 362بگلے، 185بی ایم ڈبلیو، 177جیگوار، 160پورشے اور 130رولس رائز ہیں ۔سلطان برونائی کی بیٹی کی شادی پر 14دن تقریبات منعقد کی گئیں جس میں 25ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی ۔اس ضیافت پر 5ملین ڈالر یعنی 40 کروڑ روپے خرچ کیے گئے اور پورے ملک میں جشن منایا گیا ۔ان کی صاحبزادی کے ملبوسات میں بھی سونے جواہرات جڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ پھولوں کے گل دستے بھی سونے اور جواہرات سے جُڑے ہوئے تھے ۔شادی پر جو تاج پہنایا گیا وہ بھی سونے اور جواہرات سے بنوایا گیا ۔اس لاگت کا اس کو علم نہیں ہے وہ سلطان کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

برونائی کی 67فیصد آبادی مالے (Malay) باشندوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ 15فیصد چائنیز اور 18فیصد مکس آبادی ہے جو اس کے پڑوسی ممالک کے باشندوں پر مشتمل ہے اس لئے وہاں 3زبانیں بولی جاتی ہیں ۔سرکاری زبان مالے ہے ۔انگریزی اور چینی زبان بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔اکثریت مسلمانوں کی ہے جو دو تہائی ہیں ۔جبکہ ایک تہائی عیسائی اور بدھ مت کی ہے ۔93فیصد پڑھے لکھے افراد ہیں ۔40لاکھ روپے فی کس آمدنی سالانہ ہے اس میں ڈیڑھ لاکھ مزدور بھی شامل ہیں جو اس ملک میں کام کرتے ہیں اس ملک کی سب سے بڑی آمدنی تیل کی پیداوار ہے جو سلطان برونائی کی ذاتی ملکیت ہے ۔اس کے علاوہ ڈیڑھ بلین کی اشیاء ایکسپورٹ کی جاتی ہے جس میں چاول، سبزیاں، لائیو اسٹاک شامل ہیں جبکہ برونائی میں ڈیڑھ بلین کی امپورٹ ہوتی ہے جن میں کیمیکل، مشینریز، کھانے پینے کی اشیاء شامل ہیں ۔ملک میں صرف 2ٹیلی ویژن نیٹ ورک اور 10ریڈیو اسٹیشن ہیں

۔4لاکھ آبادی کے پاس صرف ڈیڑھ لاکھ موبائل فون ہیں ۔برونائی کے صدر کا بھائی کے ساتھ وراثت کا جھگڑا ہے ان پر اربوں ڈالر غبن کا الزام ہے اسی طرح برونائی سے اور ملائیشیاء سے بھی تیل کی پیداوار پر 2003ء سے جھگڑا چل رہا ہے ۔اس کے پڑوس میں جاپان، سنگاپور اور انڈونیشیا ہیں ۔سب سے حیرت انگیز بات اتنے امیر ترین ملک میں 4فیصد بے روزگار لوگ بھی رہتے ہیں ۔برونائی دارالسلام 1984ء میں برطانیہ سے آزاد کیا گیا تھا جبکہ سلطان حسن ال بلکیا 1967ء سے حکومت کر رہے ہیں ۔حکومت مفت علاج کے علاوہ کھانے کی اشیاء آدھی قیمت پر مہیا کرتی ہے ۔برونائی دارالسلام بہت خوبصورت ملک ہے جس میں شراب کی ممانعت ہے اور شراب خانوں پر پابندی ہے ۔ملک میں امن ہی امن ہے ۔بادشاہت بھی ہے جمہوریت نہیں ہے ۔ملک کا میڈیا مخالف پروپیگنڈا نہیں کر سکتا ۔سیاحت بھی بہت ہے ۔ہر لحاظ سے بہترین نظام نافذ ہے ۔

میں سوچتا ہوں کہ ہمارا ملک 16 کروڑ آبادی ہونے کے باوجود اتنے چھوٹے ملک سے کتنا پیچھے ہے جبکہ ہمارے ملک میں بھی تیل پیدا ہوتا ہے ۔زمین کے اندر جواہرات کے پہاڑ ہیں، ملک سرسبز ہے مگر عوام درجنوں چینی کے کارخانوں، آٹے کی ملوں کے باوجود لائن میں لگے ہوئے ہیں ۔اتنا بڑا فرق کیوں ہے؟ ہمارے ماضی اور آج کے حکمران اس مسئلے کو حل کیوں نہیں کر سکے ۔

ایک مسلمان ملک ملائیشیا میں کیا دیکھا

9/11 کے بعد دنیا بہت تبدیل ہو رہی ہے خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت تعصّبانہ ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان تو اب عراق، ایران اور افغانستان کی طرح ریڈ زون میں تبدیل کر دیا گیا ہے اس کی وجہ سے غیر ممالک کے باشندے پاکستان نہیں آ جا رہے ہیں۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد تو وہ پاکستان کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں پوری دنیا میں میڈیا اُن کو بہت بھیانک صورتحال بتا رہا ہے۔ ملائیشیا سے ایک یورپین کمپنی جس کا پلانٹ ملائیشیا میں ہے اکتوبر کے آخر میں ان کا تجارتی وفد پاکستان آ رہا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد اُس کے ہیڈ کوارٹر نے پاکستان آنے سے معذرت کر لی اور تجویز دی کہ راقم کو ملائیشیا آنا ہوگا ورنہ کنٹریکٹ منسوخ کر دیا جائے گا۔ راقم کو دبئی میں کام تھا لہٰذا براستہ دبئی ملائیشیا کا پروگرام بنانا پڑا۔ 2 ہفتے تک دبئی سے کوالالمپور کی فلائٹ میں بزنس کلاس کی سیٹ نہیں مل سکی تو کراچی سے ڈائریکٹ قومی ائیر لائن میں سیٹ بک کروائی تو فوراً مل گئی آدھے سے زیادہ جہاز خالی تھا۔ کراچی سے ہفتہ میں صرف 2 فلائٹیں جاتی ہیں جبکہ دبئی سے 12 فلائٹیں صرف امارات کی جاتی ہیں اُن میں جگہ نہیں ملتی خالی جہاز دیکھ کر بہت دکھ ہوا کیونکہ ملائیشیا نے پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے لئے ویزہ کی پابندی ختم کر کے ائیر پورٹ پر ہی ویزے کی سہولت دے رکھی ہے۔

9/11 کے بعد ملائیشیا کی حکومت نے یہ آسانی مہیا کر رکھی ہے پھر بھی ہمارے جہاز خالی جا رہے ہیں

اس کی وجہ صرف پاکستان کا نام دہشت گرد ممالک میں شامل ہونا ہے جبکہ ہمارے ملک میں نہ کوئی جنگ رہی ہے میڈیا نے ساری دنیا کو ڈرا رکھا ہے باقی رہی سہی کسر ایمرجنسی نے پوری کر دی۔

عوام کی اطلاع کیلئے تحریر کر رہا ہوں کہ ملائیشیا ہم سے 10 سال بعد 1957ء میں آزاد ہوا یہ بھی اسلامی ملک ہے جس میں 60 فیصد آبادی ملائیشین مسلمان 25 فیصد چائنیز بدھ مذہب، 10 فیصد بھارتی ہندو اور 5 فیصد دیگر مذاہب کی اقلیتی قومیں آباد ہیں۔ تمام قومیں امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں آج تک اُن میں مذہب اور قومیت کے نام پر جھگڑا نہیں ہوا۔ 1980ء میں ڈاکٹر مہاتیر محمد نے اقتدار سنبھالا اور معاشی اصلاحات کیں۔ غیر ممالک جن میں یورپی اور جاپانی کمپنیوں نے اپنے اپنے جدید پلانٹ لگائے اُس وقت اُن کا رینگٹ (Ringut) ہمارے ساڑھے تین روپے میں ملتا تھا۔

ڈاکٹر مہاتیر محمد 5 مرتبہ وزیراعظم بنے، صرف 25 سال مہاتیر محمد کے اقتدار میں آج رنگٹ 20 روپے تک پہنچ گیا۔ چھوٹے چھوٹے مکانات اور دفاتر کی جگہ کوالالمپور اور دیگر شہروں میں بڑی بڑی عمارتیں اور دنیا کا سب سے بڑا ٹوئین ٹاور آج ملائیشیا میں تعمیر ہو چکا ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی کمپنیوں کے پلانٹ بنیادی صنعتیں آج ملائیشیا میں بن چکی ہیں اور صرف پام آئل بنانے والا ملک ترقی کر کے انڈسٹریل اسٹیٹ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بڑی بڑی سڑکیں، ہائی ویز، انڈر بائی پاس اور اوور ہیڈ پلوں کی تعمیر سے مسلمان ممالک میں سب سے بڑا ایڈوانس ترقی پذیر ممالک میں شامل ہو چکا ہے۔ 100 فیصد تعلیم یافتہ ممالک میں شمار کیا جاتا ہے تعلیم مفت اور کمپلسری ہے ہر بچے کو اُس کی اپنی زبان کے علاوہ ملائیشیا کی زبان میں تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے اگر والدین بچے کو اسکول نہ بھیجیں تو والدین کو سزا دی جاتی ہے اور سب سے بڑی وجہ یہی تعلیمی نظام تھا جس نے ملائیشیا کو آج ہم سے پچاس سال آگے پہنچا دیا ہے۔ سیاست آزاد ہے مگر تعصب کی سیاست کی اجازت نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی میں آج وہ کوریا اور جاپان کے ہم پلہ بن چکا ہے۔ تمام قوموں کو اپنی اپنی مذہبی تعلیم دینے کی اجازت ہے اسی

طرح ملائیشیا میں عید، دیوالی، چائنیز نیو ائیر، کرسچن کو کرسمس کی چھٹیاں سرکاری طور پر منائی جاتی ہیں اور سرکاری چھٹیاں بھی اُس حساب سے ہوتی ہیں۔فری ایکسپورٹ زون بھی ہیں مگر تمام مشینوں پر کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔حکومت بہت سستے داموں پر پلانٹ لگانے کیلئے زمینیں فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف بڑی بڑی عمارتیں عوام کے رہنے کیلئے بھی زمینیں بلڈروں کو دی جاتی ہیں تا کہ سستی اور اچھی رہائش عوام کو ملتی رہیں کم از کم تنخواہ 20 ہزار روپے (پاکستانی) ہے آسان اقساط پر ہر ایک کو رہائش دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔اسی وجہ سے عوام ڈاکٹر مہاتیر محمد کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے ملائیشیا نے بے مثال ترقی کی اس سال ملائیشیا 50 سالہ جشن منا رہا ہے اور ہم 60 سالہ جشن بھی نہ منا سکے۔پیٹرول جو صنعتوں کیلئے سب سے زیادہ ضروری ہے عوام کو سبسڈی کے طور پر 37 روپے فی لیٹر فراہم کیا جاتا ہے جبکہ ملائیشیا میں پیٹرول بہت کم پیدا ہوتا ہے۔بیرونی سرمایہ کاری کیلئے حکومت نے بہت مراعات کا اعلان کر رکھا ہے اگر آپ ایک مکان خریدیں تو آپ کو رہائشی ویزہ بھی مل سکتا ہے۔ملائیشین عوام بہت خوش اخلاق اور تعصب سے پاک مسلمان، ہندو عیسائی بغیر تفریق کے زندگی گزار رہے ہیں جو دنیا میں کسی بھی اسلامی ملک میں نہیں پایا جاتا۔ملائیشیا کی حکومت میں مسلمان، بدھ مت، ہندو عیسائی وزرا شامل ہیں آج ہم 90 ڈالر بیرل پیٹرول جس کی قیمت خرید تقریباً 32 روپے لیٹر ہے ہم اپنے عوام کو بے وقوف بنا کر دگنے داموں میں فروخت کر رہے ہیں ہم کیسے بین الاقوامی ممالک سے سستے داموں اپنی اشیاء فروخت کر سکتے ہیں جبکہ چائنا کی یلغار روکنے اور بھارت کے مقابلے میں ہم اپنی صنعتوں کا جال بڑھانے کے بجائے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ویزہ پالیسی کی نرمی کی وجہ سے ہم اپنی لیبر بھی ملیشیا بھجوا سکتے ہیں۔کراچی سے صرف 6 گھنٹوں کے فاصلے پر کوالالمپور واقع ہے۔تنخواہ اور لیبر کی مراعات کے علاوہ تعلیم اور رہائش مفت ہو اور خصوصاً ماحول غیر متعصب لبرل ہو تو اچھے کام کرنے کیلئے مسلمان ملک ملائیشیا سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔اسلحہ کی ایک گولی کارتوس اور منشیات کی سزا سزائے

موت ہے۔ملاوٹ کا تصور تک نہیں ہے چند سال قبل ہی کوالالمپور آیا تھا یقین نہیں ہوتا کہ چند سال میں بھی اُن کی ترقی کی رفتار کم ہونے کے بجائے اور تیز ہوتی جا رہی ہے۔سستا ٹرانسپورٹ عوام کیلئے خصوصاً جدید ٹرام وے زمین دوز نہیں بلکہ اوہیڈ برقی نظام اپنی مثال آپ ہے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کیلئے عوام کو بہت سہولتیں مہیا ہیں البتہ کوالالمپور کی ڈاؤن ٹاؤن علاقوں میں ٹریفک جام ہوتی ہے جس کے ازالہ کیلئے بہت لمبی سرنگ 10 کلومیٹر تعمیر کی گئی ہے جس کی وجہ سے نہ ٹریفک جام ہوتا ہے بلکہ اندرون شہر نیچے ہونے کی وجہ سے بارش کے پانی کو بھی جمع نہیں ہونے دیتا۔ملائیشیا میں بارش بھی بہت ہوتی ہے مگر میں نے چار دن میں کہیں پانی جمع نہیں دیکھا۔سڑکیں کشادہ اور مضبوط پل بہت ہی محفوظ اور جدید پلروں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔آج تک اُن میں ایک بھی کریک نہیں آیا۔10 دس سال پرانے ہیں ایسا لگتا ہے کل ہی تعمیر ہوئے ہیں سینکڑوں فائیو اسٹار ہوٹل ہیں جو غیر ملکیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور کرایہ میں بھی ہم سے کم ہیں یورپین امریکن سے کم یعنی 50 سے 100 ڈالر میں کمرہ مل جاتا ہے۔کمرہ کشادہ اور جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور خوش اخلاق عملہ کھانے پینے کیلئے ہر قوم کے مزاج کا کھانا کم قیمت پر دستیاب ہے۔نہایت صاف ستھرے ریسٹورنٹ ملیشین عوام کی ترجمانی کرتے ہیں۔شاپنگ پلازوں کی بھرمار ہے ایشیاء میں سب سے سستے الیکٹرونک آلات، کپڑے، پرفیوم، کھانے پینے کی اشیاء اگر کسی ملک میں مہیا ہے تو وہ ملیشیاء ہے اتنی مہذب مسلمان قوم شاید ہی آپ کو کہیں ملے۔

اتنی بڑی تمہید لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے بنیادی اصول ترک کر دیئے ہیں تعلیم کو غیر ضروری سمجھ کر پس پشت ڈال رکھا ہے غیر مسلم اقوام سے متاثر ہو کر اپنا کلچر چھوڑ رکھا ہے۔خود اپنی تباہی کو دعوت دیکر اپنی قومیت کو بھلا دیا ہے۔پاکستان کس لئے آزاد کرایا تھا، آج اُس کو بھلا دیا ہے جذباتی فیصلے عوام کی بھلائی کے بجائے اپنی اپنی جیبیں بھرنے پر مشغول ہیں صرف ایک مثال دیتا ہوں عوام کیلئے سستا گھر حاصل کرنے کیلئے بینک صرف 6 فیصد سود لے سکتے ہیں جبکہ ہم گھروں گاڑیوں حتیٰ کہ فیکٹری

لون مشینری لون پر اسلامی قرضوں کے نام پر 18 سے 24فیصد لیزنگ کے نام پر وصول کر رہے ہیں ان میں غیر ملکی بینک ہمارے عوام کو بیوقوف بنا رہے اور حکومت خاموش ہے اسٹیٹ بینک بھی اس طرف توجہ نہیں دے رہا ہے کاش ہمارے حکمران ہی اس لوٹ کھسوٹ کو روکیں انہیں تو صرف اپنی حکومت کو بچانے کی فکر ہے اور ہماری عوام بھی خوابِ غفلت میں پڑے ہیں۔غیر معیاری اور مہنگی اشیاء ادھار خرید کر بہت خوش ہیں۔کب ہمارے عوام اور معاشرہ اس دھوکہ دہی سے آگاہ ہوگا۔یہ کسی کو نہیں معلوم الیکشن آئیں گے اور گزر جائیں گے پھر پرانی بوتل میں نئی شراب بھر کر یہی سیاستدان اگلے 5 سال کیلئے منتخب ہو کر عوام کو بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جائینگے۔آج صرف 5 دن کے بعد میں کراچی واپس جا رہا ہوں میرا دل بہت دکھی ہے کاش ہم اپنا مستقبل ہی بچالیں یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔کیا آج 60 سال بعد بھی ہم کو ایسا لیڈر دستیاب ہے جو ڈاکٹر مہاتیر محمد کی راہ پر چل سکے؟

شام کے دارلخلافہ دمشق میں 5 دن

پاکستان کا نام ہمارے ہمسایہ ملک نے زبردستی دہشت گرد ممالک کی فہرست میں مشہور کر رکھا ہے جس کی وجہ سے مغربی ممالک کے کاروباری افراد خلیجی ممالک میں میٹنگ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور کراچی آنے سے گریز کرتے ہیں۔ایسی ہی ایک کاروباری میٹنگ کے سلسلے میں گزشتہ ہفتے چند روز کیلئے ملک شام کے دارلحکومت دمشق جانے کا اتفاق ہوگیا۔اس سے پہلے میں خلیج کے دیگر ملکوں میں تو جاتا رہا ہوں۔مگر دمشق جانے کا پہلا موقع تھا۔میرے ایک مہربان دوست جو مکہ میں رہتے ہیں وہ اکثر دمشق جاتے رہتے تھے اُن کو میں نے فون کیا کہ دمشق میرے لئے اجنبی شہر ہے وہ اپنے کسی دوست کو رہنمائی کیلئے فون کردیں۔انہوں نے کہا میں بندوبست تو کرسکتا ہوں مگر میرے شامی دوست کو صرف عربی آتی ہے میں نے کہا میں گزارا کرلونگا بقول میرے دوست کے مقولے کہ ''نامانوں سے کانا ماموں بہتر ہے'' پر عمل کیا اور ایک سہانی شام میں دمشق پہنچ گیا بہت سردی تھی ابر آلود موسم تھا میرے پاس کوئی خاص گرم کپڑے بھی نہیں تھے ائیر پورٹ کے باہر وہ دوست میرے نام کا بورڈ تھامے کھڑا تھا میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ بڑھایا تو اُس نے مجھے گلے لگا کر عربی اسٹائل میں معانقہ کیا جو میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا جیسے ہی اُس کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو ایک پولیس والے نے ہاتھ دیکر اُس کو روک لیا وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اُسکے پاس گیا۔جیب سے ایک نوٹ 50 کا نکال کر اُس کی مٹھی میں رکھا جواب میں

پولیس والے نے 25 کا نوٹ واپس کر دیا۔پولیس والا دوسرے طرف ہنستے ہوئے روانہ ہوا میرا دوست پھیکی ہنسی میں آ کر سیٹ پر بیٹھ گیا میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں پوچھا کیا ماجرا تھا۔اُس نے بتایا میں نے غلطی سے نو پارکنگ پر گاڑی کھڑی کر دی تھی۔اس پولیس والے نے چالان کرنے کو کہا تو میں نے اُسے 25 میں مُک مکا کر لیا چونکہ میرے پاس 50 کا نوٹ تھا اس لئے اُس نے 25 کا نوٹ واپس کر دیا۔مجھے ایسا لگا جیسے میں ابھی تک پاکستان میں ہی ہوں،قارئین کی اطلاع کیلئے ایک ڈالر میں 50 ریال ملتے ہیں یعنی تقریباً ہمارے روپے سے 10 کم تھے۔ہمارے روپے ڈالر کے مقابلے میں شام کے ریال سے کمزور تھا۔ائیر پورٹ دمشق شہر سے کافی دور 30 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔سڑکیں پکی اور دونوں طرف ہریالی تھی،درختوں کی قطاریں بہت اچھی لگ رہی تھیں ہوٹل پہنچے تو پہلی مرتبہ یہ تجربہ ہوا کہ ائیر پورٹ کی طرح اسکریننگ مشین پر سوٹ کیس چیک کیا گیا اور چند افراد کا سوٹ کیس بھی کھول کر چیک کیا گیا۔پھر ریسپشن پر مجھے چابیاں دیں اور میرا پاسپورٹ ضروری کاروائی کیلئے لیا گیا۔شام میں داخلے کیلئے دبئی طرز کا نظام ائیر پورٹ پر ایڈوانس ویزے کا بندوبست کرنا پڑتا ہے اکثر اسپانسر صاحبان خصوصاً پاکستانی وزیٹر سے ائیر پورٹ پر ہی پاسپورٹ لے لیتے ہیں کیونکہ انہیں خطرہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ بیروت جو شام کی سرحد سے ملا ہوا ہے۔Slip کر کے یورپ نہ بھاگ جائیں مگر میرے اسپانسر نے میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا۔البتہ یہ ضرور کہا کہ آپ جس دن واپس جائیں مجھے مطلع ضرور کر دیں تا کہ میں آپ کا واپسی پر ویزہ جمع کرا دوں۔اگر واپسی پر ویزہ نہیں جمع کرایا گیا تو آپ واپس نہیں جا سکیں گے۔ویزے کی مدت صرف 15 یوم تھی۔15 یوم سے زیادہ ٹھہرنے پر 10 ڈالر فی اضافی دن جرمانہ بھرنا پڑے گا۔دوسرے دن کاروباری میٹنگ ختم ہوگئی میرے میزبان میرے سایہ کی طرح میرے ساتھ رہے انہوں نے میٹنگ سے فارغ ہو کر مجھے دمشق گھومنے کی دعوت دی میں نے نیکی اور پوچھ پوچھ والے فارمولے پر عمل کیا اور اُن کی دعوت قبول کر لی۔سب سے پہلے

انہوں نے پرانے دمشق کی پیدل سیر کرائی۔ایک عربی ریسٹورنٹ میں خالص عربی کھانا کھلایا ایک درجن سے زیادہ اسٹارٹر تھے انہیں کھا کھا کر پیٹ بھر گیا،بیرا تمام پلیٹیں معہ تھالی اٹھا کر لے گیا پھر ایک دوسری نئی تھالی لایا اُس میں بھُنا ہوا گوشت ہمہ اقسام نہایت نفاست سے سجایا ہوا تھا۔ہم تو سمجھے تھے کہ جو اسٹارٹر تھے اُس میں بھی کباب تھے،مکس سبزیاں بھنڈیاں بھنی ہوئی بیگن کا رائتہ پسے ہوئے کابلی چنے کا خموس طرح طرح کے زیتون طرح طرح کی پنیریں،باربی کیو مرغی کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں یہی بہت تھیں۔میں نے اپنے میزبان سے کہا اتنا کھانا کیوں منگوایا اُس نے کہا یہ تو صرف 2 آدمیوں کیلئے کافی ہوتا ہے۔میں نے ساتھ دینے کیلئے چند گوشت کے ٹکڑے اپنی پلیٹ میں ڈالے اور تھالی میزبان کے آگے کر دی، عربی ریسٹورنٹ میں کرسیوں پر گاؤ تکیے بہت آرام دہ تھے۔پاس ہی عربی حقہ جسے آج کل شیشے کا نام دیا جاتا ہے ہر شخص کے پاس رکھ دیا جاتا ہے خواہ کوئی مانگے یا نہ مانگے یہ جس طرح کھانے کے ساتھ پانی لازم ہوتا ہے۔تقریباً ہر شخص کھانے کے ساتھ ساتھ حقہ ضرور پیتا ہے۔میرے میزبان دوست نے ماشاءاللہ تمام گوشت کے ٹکڑے ختم کر لئے تو عربی قہوہ آیا جو اس گوشت کو ہضم کرنے کیلئے بہت ضروری ہوتا ہے۔خوب ڈٹ کر پیا آخر میں بل کے ساتھ میوہ تھا۔میں نے بل دینا چاہا تو میرے دوست نے ناراضگی کے ساتھ بل میرے ہاتھ سے لیا اور عربی میں کہا کہ مکہ والے دوست کا نام لے کر کہا میں اُس کو کیا منہ دکھاؤں گا۔مجھے بہت ٹوٹی پھوٹی عربی آتی تھی جو میں نے عمرہ اور حج کے دوران سیکھی تھی آج وہ کام آ رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اب وہ مجھے دمشق زیارتوں پر لے گیا۔یہاں مجھے انکشاف ہوا کہ دمشق حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہے کیونکہ ایک پہاڑی پر ہم گئے جو دمشق سے 40 کلومیٹر دور تھی تو وہاں ایک لمبی قبر تھی یوں سمجھئے ایک بہت بڑے ڈرائنگ روم کے برابر قبر تھی۔اُس پر بورڈ لگا ہوا تھا نام حضرت ہابیل علیہ السلام لکھا تھا مجھے وہاں کے گائیڈ نے بتایا یہ وہی حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے

جنہیں قابیل قتل کر کے دمشق بھاگ گیا تھا۔ یہ پہلے انسان تھے جنہیں قتل کیا گیا تھا۔ اُن کی عمر ہزار سال سے زیادہ تھی اور اُس نے بتایا کہ عمر کے ساتھ ساتھ قد بڑھتا تھا۔ اُس زمانے میں سات گز لمبے انسان ہزار سال زندہ رہنے کے بعد لمبے ہوتے جاتے تھے۔ 7 میٹر لمبائی کا موازنہ اُس نے 7 آسمان، ہفتے کے 7 دن اور یہ ہی نہیں وہ عربی میں کیا کیا بولتا گیا میرے پلے جو پڑا وہ میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ شام بہت غریب ملک ہے ہم سے بھی زیادہ غریب۔ اُس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہ بے شمار زیارتیں ہیں۔ جو اہل تشیع خصوصاً اور اہل سنت دونوں ہی ایران، پاکستان، عراقی زائرین قافلوں کی شکل میں آتے ہیں یہاں حضرت بی بی زینبؓ، حضرت بی بی سکینہؓ بنت حضرت امام حسین کے مزارات پر بے پناہ مرد و عورتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ان تینوں مزارات کو ایرانی حکومت نے بہت خوبصورت تعمیر کروا کر شامی حکومت کو دیا ہے۔ پرانے دمشق میں باب صغیر میں داخل ہوتے ہی ایک طرف حضرت بلال حبشی جو حضورؐ کے زمانے میں مسجد نبوی کے موذن تھے۔ بہت سادہ مزار تھا۔ ان کے نزدیک حضرت ام سلمہؓ اور رامُ حبیبہؓ کے مزار ہیں۔ اُس سے 50 کلومیٹر کے فاصلے پر امیر معاویہؓ کا مزار ہے۔ انہی مزاروں کے قریب جو لوگ کربلا میں شہید ہوئے اُن کے سروں کی شبیہیں رکھی ہوئی ہیں۔ عورتیں مزار پر جانے سے پہلے برقعہ پہنتی ہیں جوان کو بلا معاوضہ دیا جاتا ہے اور واپسی پر لے لیا جاتا ہے۔ دمشق کے بیچ میں بازار شام ہے جس میں دمشق کی سب سے بڑی جامع مسجد معاویہ ہے اس مسجد میں حضرت یحیٰؑ کا مزار ہے۔ بازار شام سے باہر نکلتے ہی صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے۔ ان مزاروں کے اردگرد سیاحوں کی خریداری کیلئے ان گنت دکانیں ہی دکانیں ہیں جن میں کپڑوں کی اقسام شام کی سوغاتیں، عطر ہاتھ سے بنی ہوئی گھڑیاں، نہانے کیلئے عربی حمام، کھانے پینے کیلئے ریسٹورنٹس، قہوہ خانے ٹھیلوں پر بچوں کے کھلونے، گڑیاں عربی تمغے فروخت ہوتے ہیں۔ آپ جی بھر کے مول تول کر سکتے ہیں۔ بسا اوقات ایک تہائی قیمت تک بھی میں نے مول تول کی تو دکاندار برا نہیں

مناتے البتہ جب وہ دیکھتے ہیں خریدار جا رہا ہے تو آواز بھی دے کر ایک تہائی قیمت پر دے دیتے ہیں۔ دکاندار بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں نے آپس میں کسی کو بھی لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ پرانی طرز کی مارکیٹیں جن پر چھپر پڑا ہوتا ہے پرانے دمشق میں بے پناہ ہجوم میں سیاحوں سے گھری رہتی ہیں۔ البتہ دمشق کا پوش علاقہ بہت خوبصورت ہے اگرچہ حافظ الاسد موجودہ حکمران کے والد جو سوشلسٹ مانے جاتے تھے۔ اُن کے محلات اسی پوش علاقے کے پہاڑوں پر دور سے نظر آتے ہیں۔ لائن سے بنے ہوئے ہیں۔ اُن پہاڑوں پر حکومتی ارکان کے علاوہ عام پبلک نہیں جا سکتی۔ اس علاقے میں جدید فائیو اسٹار ہوٹل، ڈانس کلب، پاکستانی، انڈین، چائنیز، عربی، جدید ریسٹورنٹس ہیں جو کافی مہنگے ہیں عام سا کھانا 800 سے 1200 شامی ریال میں ملتا ہے البتہ فائیو اسٹار میں بوفے 2500 ریال یعنی پاکستانی تقریباً 3000 روپے میں ملتا ہے۔ اگر ڈانس کلبوں میں جائیں تو 5 ہزار فی کس بھی پڑ سکتا ہے۔ عربی کیبرے، ڈانس کلب تو ہر گلی میں بیروت کی طرز پر پائے جاتے ہیں۔

دمشق کے باہر بھی بہت سی زیارتیں ہیں جن میں صحابہ رسول حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کا مزار بھی دمشق سے تقریباً 20 کلومیٹر دور ایک عام سے کھیت میں ہے جہاں بہت زنگ آلودتا لا پڑا ہوا تھا جیسے کئی برس سے مزار کھولا ہی نہیں گیا۔ سدیانہ بھی بہت خوبصورت علاقہ ہے جہاں مسلمان اور عیسائی ساتھ ساتھ رہتے ہیں یہ پہاڑی علاقہ ہے اس پر اسلام آباد کی پہاڑیوں کا گمان ہوتا ہے۔ جگہ جگہ سیاحوں کیلئے کھانے پینے کے ریسٹورنٹ شیشوں کی دیواروں کی شکل میں بنے ہوئے ہیں جہاں سے آپ باہر کے مناظر دیکھ سکتے ہیں انہی پہاڑوں کے مختلف سمت دوسرا پہاڑی سلسلہ ہے۔ جہاں تقریباً 250 سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک مقام ہے جس کا نام اربعین ہے یہاں قابیل نے عورت کی رقابت میں ہابیل کا سر پھوڑ کر مارا تھا۔ سات سو سال سے عیسائی فیملی اُس کی حفاظت کر رہی ہے یہاں اصحاب کہف کا غار بھی ہے۔ یہاں سے 15 کلومیٹر دور پہاڑ کی چوٹی پر جیسا میں نے اوپر بتلایا تھا

حضرت ہابیل کا مزار ہے۔الغرض دمشق کے چاروں طرف زیارتیں ہی زیارتیں دو دن کیلئے گیا تھا مگر 5 دن میں بھی زیارتیں اور تفریحی علاقوں سے دل نہیں بھرا،میرے میزبان نے بھی ان پانچوں دن بھرپور طریقے سے حمس، زینبیہ اور نہ جانے کتنے علاقے گھمائے جو مجھے ان کے نام بھی یاد نہیں۔پھر بھی اکتاہٹ نہیں دکھائی خوش اسلوبی سے مہمان نوازی سے لطف اندوز کیا۔اُس مہربان میزبان کا نام ابو معظم تھا۔جس کی عمر تقریباً 60 سال تھی بس ایک عادت اس کی مجھے پسند نہیں تھی وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا تھا۔اس کا فرنیچر کا کاروبار تھا۔اُس کا احسان مند ہونے کے ساتھ شکریہ ادا کیا پھر ائیر پورٹ پر جب الوداع کہہ رہا تھا تو بہت جذباتی ہو کر اُس نے پوچھا اب دوبارہ شام کب آؤ گے میں نے کہا انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔اُس نے گلے لگا کر عربی طریقہ سے بھیجا اور گرم جوشی سے الوداع کیا۔پاکستان پہنچنے پر میں نے اُس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے فون کیا تو اُس نے یاد رکھنے پر شکریہ کہا اور پھر دہرایا کہ میں کب دوبارہ اُس سے ملوں گا۔میں نے پھر یہی کہا انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔

سری لنکا سے تجارت

حال ہی میں پاکستان نے پہلی مرتبہ سری لنکا سے فری ٹریڈ ایگریمنٹ (F.T.A) پر دستخط کئے ہیں جس کی رو سے پاکستان تقریباً 230 اشیاء سری لنکا سے درآمد کرے گا جس پر کوئی ڈیوٹی نہیں ہوگی جس میں چائے، کوکونٹ، چھالیہ، کراکری، پتھر، پان سرِفہرست ہے جبکہ پاکستان سے 102 اشیاء بغیر ڈیوٹی ادا کئے سری لنکا درآمد کرے گا جس میں ہمارا باسمتی چاول، ادویات، کپڑے، فروٹ سرِفہرست ہیں۔دونوں حکومتوں نے اگرچہ دستخط تو کر دیئے ہیں مگر اس پر عمل درآمد کی تاریخ درج نہیں ہے کہ یہ کب سے نافذ العمل ہوگا۔غالباً سری لنکا اور پاکستان کی بیوروکریسی ایک ہی جیسی پیش رفت کی روایت رکھتی ہے۔پاکستان نے انگریزوں سے 1947ء میں آزادی حاصل کی تھی جبکہ سیلون (سری لنکا کا پرانا نام تھا) نے 1948ء میں انگریزوں سے حاصل کی تھی۔

اس سلسلہ کی مزید معلومات کیلئے میں سری لنکا گیا وہاں پاکستان کے ہائی کمشنر عزت مآب جناب بشیر ولی محمد صاحب اور ڈپٹی ہائی کمشنر جناب اشتیاق اندرابی (ANDRABI) صاحب سے ملاقات کی۔دونوں صاحبان نے بہت گرم جوشی سے یہاں کی سیاست اور تجارت پر بہت معلوماتی گفتگو کی۔ہمارے اکثر قونصل جنرل صاحبان کے متعلق یہ شکوہ رہتا ہے کہ وہ کسی بھی پاکستانی تاجروں سے ملنے سے کتراتے ہیں۔مگر ہمارے ایک مشترک دوست جو سری لنکا کے سابق سینیٹر پوناوگنا راجہ کی معرفت

ملاقات ہوئی یہ سینیٹر اکثر پاکستان بھی آتے رہے ہیں اور ان کا شمار پاکستان کے ہمدرد دوستوں میں ہوتا ہے۔وہ بھی اس گفتگو میں نفسِ نفیس موجود تھے اور اپنی سیاسی بصیرت سے سری لنکا اور پاکستان کی دوستی سے آگاہ کر رہے تھے۔انہوں نے بتایا کہ سری لنکا کی حکومت اور عوام پاکستان سے زیادہ دوستی رکھنا چاہتے ہیں جبکہ بھارت کی حکومت سری لنکا پر دباؤ اور اپنا بڑا پن ظاہر کر کے ہمیشہ خوف زدہ رکھ کر اپنا سیاسی عمل دکھانا چاہتی ہے۔انہوں نے کئی مثالیں دیں مثلاً پاک بھارت 1971ء کی جنگ میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے سری لنکا کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ دورانِ جنگ پاکستانی جہازوں کو سری لنکا سے نہ گزرنے دے تا کہ مشرقی پاکستان جانے کے تمام راستے بند ہو جائیں مگر سری لنکا کی حکومت نے نہ صرف جہازوں کی پرواز کی اجازت دی بلکہ تیل بھی فراہم کیا تا کہ اضافی پرواز کی وجہ سے ری فیولنگ ضروری تھی یہ بہت ہی ضروری اقدام تھا جو کہ بھارت کی ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر کیا گیا۔دوسرا انہوں نے بتایا کہ اب صرف پاکستان کے عوام بغیر پیشگی ویزہ سری لنکا آجاسکتے ہیں جبکہ خود سری لنکن کو پاکستان آنے کیلئے پیشگی ویزے کی ضرورت پڑتی ہے انہوں نے شکایتاً کہا کہ اب F.T.A کے بعد تو کم از کم پاکستان آنے کیلئے سری لنکن عوام کو پیشگی ویزے کی پابندی سے آزاد کر دینا چاہیے۔تیسری اہم بات انہوں نے یہ بتائی کہ سری لنکا اُن پہلے دس بڑے ممالک میں شامل ہے جو پاکستان کی برآمد (Export) میں شامل ہے جبکہ اس کے جواب میں پاکستان سری لنکا سے برابری کی بنیاد پر درآمد (Import) نہیں کرتا۔

ہمارے ہائی کمشنر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اب سری لنکا نے پہلی مرتبہ پاکستان سے چاول بھارت کے مقابلے میں زیادہ درآمد کیا اور بھارتی حکومت اور تاجروں کی ناراضگی کی پرواہ نہیں کی۔انہوں نے بتایا کہ پاکستان سے سری لنکا کی عوام بھارت کے مقابلے میں زیادہ تجارت کرنا چاہتے ہیں۔

مگر پاکستانی تاجر ہمارے ملک نہیں آتے جبکہ بھارت سری لنکا کی منڈی پر 60فیصد تک چھایا ہوا ہے

۔باوجود اس امر کے نہ بھارت کی پیکنگ اچھی ہے نہ ادویات معیاری ہیں اور بھارت بہت مہنگے دام سری لنکا کو برآمد کرتا ہے انہوں نے مجھ سے خاص طور پر کہا کہ آپ اپنے کالم میں پاکستانی صنعتکاروں اور تاجروں کو سری لنکا کی اہمیت سے آگاہ کریں۔اس سلسلے میں وہ اپریل اور مئی میں سری لنکا میں نمائش (Exhibition) بھی کر رہے ہیں تا کہ پاکستان سے زیادہ سے زیادہ تاجر اس نمائش میں حصہ لیں۔

انہوں نے بتایا کہ انکی کوشش سے اب پی۔آئی۔اے اور سری لنکن ائیر لائن ایک ایک پرواز کا اضافہ کر رہی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ کارگو بھی آجا سکے۔سری لنکا کی عوام گذشتہ سونامی کے واقعہ پر حکومتِ پاکستان اور پاکستانی عوام کی عملی اور مالی امداد پر بہت خوش ہے۔جو انہوں نے بروقت سامان اور فوج بھیج کر بہت قیمتی جانیں بچائیں۔جبکہ بھارت سارک (SAARC) کا ممبر ہوتے ہوئے بھی اس نے ہمدردی کے دو بول بھی نہیں بولے۔بھارت سری لنکا پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کیلئے وہاں کی حکومت کے کارندوں کو بھی استعمال کرتا ہے۔خاص طور پر حکومت کو ڈرانے کیلئے اس نے تامل ٹائیگر کو آلہِ کار بنایا ہوا ہے۔جو اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔جس سے سری لنکا کی معیشت آج تک نہیں پنپ سکی۔مجھے امید ہے کہ ہمارے ہائی کمشنر صاحب کی کوششوں سے اور نئے F.T.A کے نافذ ہونے کے بعد سری لنکا اور پاکستان کی تجارت بہت آگے بڑھے گی۔دونوں حکومتوں کو چاہئے کہ وہ بھارت کا زور توڑنے کیلئے اہم اقدامات کریں تا کہ دونوں ممالک کے صنعتکار تاجر بینکر ایسوسی ایشن چیمبرز کے ارکان ایک ساتھ بیٹھیں اور تجارت کو بڑھانے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

صومالی لینڈ کے حکمران

ایک سال قبل راقم نے ایک کالم میں افریقہ کے ایک ملک صومالی لینڈ کا سرسری جائزہ تحریر کیا تھا جس نے 26 جون 1961ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ بہت سے لوگ صومالیہ اور صومالی لینڈ کو ایک ملک سمجھتے ہیں دراصل یہ دونوں الگ الگ ملک ہیں۔ جو 20 سال تک خانہ جنگی کا شکار رہے اور لاکھوں مسلمان اس جنگ میں مارے گئے۔ صومالی لینڈ کی 100 فیصد آبادی مسلمان ہے مگر دیگر بہت سے ممالک کی طرح UNO نے ابھی تک اُسے بھی تسلیم نہیں کیا ہے صرف صومالیہ کو تسلیم کر رکھا ہے۔

ایک ماہ قبل راقم کی صومالی لینڈ کے وزیر زراعت سے ہمارے ایک دوست صومالی لینڈ کے باشندے محمد عثمان نے ملاقات کروائی تھی۔ وزیر زراعت نے دوبارہ صومالی لینڈ کے دارالخلافہ ہرگیسا آنے کی دعوت دی۔ دبئی سے ایتھوپیا سے (Hergesia) جانا پڑتا ہے یا پھر دبئی سے جبوتی پھر ہرگیسا پھر تیسرا روٹ بذریعہ نیروبی غرض ہر روٹ پر چھوٹے چھوٹے جہاز چلتے ہیں اور کنکشن کیلئے کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے اور روز فلائٹ بھی نہیں جاتیں الغرض وعدہ کے مطابق راقم نے اپنے صاحبزادے سلمان کے ساتھ صومالی لینڈ کا دورہ کیا۔ بہت غریب مگر خوددار عوام کا نام صومالی لینڈ کہا جا سکتا ہے۔ آپس کی جنگ کے بعد ہرگیسا 100 فیصد تباہ ہو گیا تھا جس کی انہوں نے خود ہی دوبارہ آبادکاری کی اقوام متحدہ البتہ خوراک فراہم کرتی ہے وہ بھی صرف غریبوں کیلئے، جرائم غربت کے باوجود صفر کے برابر

ہیں اس سے اندازہ لگائیے کہ کرنسی خریدنے اور بیچنے کے کاروبار میں 60 فیصد خواتین ہیں جو سڑکوں پر ایک چوکور جالی نما لکڑی کے بکسوں میں رکھ کر خرید و فروخت کرتی ہیں اور نماز کے اوقات میں یہ بکس اُسی طرح مارکیٹ میں تالہ بند پڑے رہتے ہیں کسی کی مجال نہیں جو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے کوئی بھی غیر مسلم شخص میں نے نہیں دیکھا۔ موسم یہاں کا نیم سرد گرمیوں میں ہوتا ہے میں نے قصر صدارت کے علاوہ کہیں بھی ائیر کنڈیشنر نہیں دیکھے۔ 95 فیصد کمروں میں پنکھے بھی نہیں لگے ہوتے کسی کو بھی میں نے عجلت میں نہیں دیکھا بہت صابر اور قناعت پسند لوگ ہیں ایمانداری سے کاروبار چلاتے ہیں مویشی پالنا ان کا سب سے بڑا ذریعہ معاش ہے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ دنبے اور بکروں کے علاوہ لاکھوں اونٹ اور گائے بھی پالی ہوئی ہیں جو خصوصاً سعودی عرب میں قربانی کے موقع پر برآمد ہو جاتی ہیں۔ کھالوں کا کاروبار بھی بہت بڑا ہے اس کے علاوہ سمندر بھی ہے مگر اُس سے ابھی تک جدید طریقے سے مچھلیاں، جھینگے کریب لابسٹر ہونے کے باوجود فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے اس کیلئے قیمتی اور جدید ٹرالر درکار ہیں وہ ان کے پاس نہیں ہیں باوجود اس امر کہ 100 کلومیٹر سے بھی لمبا اور صاف ستھرا ساحل ہے اور بار برنامی بندرگاہ بھی ہے۔

اس کے علاوہ صومالی لینڈ کے باشندے دیار غیر سے بھی کافی زرمبادلہ بھیجتے ہیں۔ اقوام متحدہ اور ورلڈ بینک نے 1988 میں سروے کیا تو معلوم ہوا صومالی لینڈ میں تیل اور گیس دونوں کے ذخائر موجود ہیں مگر آج تک اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اُس کیلئے بہت رقم درکار ہے جو صومالی لینڈ والوں کی دسترس سے باہر ہے۔ ڈائمنڈ اور بہت قیمتی پتھر بھی ان کے پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ اُس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا یہ بھی وسائل کی کمی کا شکار ہیں بہت چھوٹا ائیر پورٹ ہے جہاں صرف چھوٹے جہاز اتر سکتے ہیں۔ ویزہ فیس 50 ڈالر کے قریب ہے اور 30 ڈالر واپسی پر بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ سرکاری کرنسی شلنگ ہے ایک ڈالر میں 6500 بازار میں ملتے ہیں جبکہ ائیر پورٹ پر

3500 کے حساب سے 50 ڈالر لازمی خریدنی پڑتی ہے۔ دوکانوں پر ڈالروں میں قیمتیں لکھی ہوتی ہیں جو 6000 شلنگ فی ڈالر سے منسلک ہوتی ہیں۔ جنگ کی تباہی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1961ء میں ایک ڈالر میں صرف ڈھائی شلنگ ملتے تھے۔ آج 6500 شلنگ ملتے ہیں غربت کے ساتھ ایمانداری کی دوسری مثال یہ ہے مجھے ایک 20 کلومیٹر دور جنگل میں اپنا ایک زرعی اور مویشی فارم دکھانے میرے دوست عثمان کچے راستے سے لے گئے۔ کچی سڑک کے دونوں طرف کچھ کچھ فاصلے سے مختلف قسم کی بوریاں رکھی تھیں میں نے دریافت کیا کہ یہ بوریاں جنگل میں کیوں پڑی ہیں مجھے بتایا کہ تمام دن یہ بوریاں جن میں آٹا، چاول، تیل اور دیگر ضروریات کا سامان ہوتا ہے گاڑیاں شہر سے خرید کران گاؤں والوں کے آرڈر کے مطابق رکھ جاتے ہیں اور گاؤں والے دودھ پنیر وغیرہ جو شہر بھجوانا ہوتا ہے وہ اپنا سامان لے جاتے ہیں یہ اُن کی جگہ رکھ جاتے ہیں پھر جمعہ یا جب بھی ضروری ہوتا ہے حساب کتاب کرلیا جاتا ہے میں نے پوچھا اس جنگل میں کوئی ان کا محافظ بھی نہیں ہوتا غربت بھی ہے تو کوئی اُٹھا کر نہیں لے جاتا۔ اس نے جواب دیا آج تک ایسا نہیں ہوا نہ گاؤں والے چوری کرتے ہیں اور نہ شہر کے لوگ چور ہیں اور یہی لین دین شہر اور گاؤں کے درمیان برسوں سے قائم ہے وہ اپنی ضرورت کی فہرست دودھ اور پنیر کے ڈبوں کے ساتھ لکھ کر باندھ دیتے ہیں تو وہ شخص جس سے ان کا کاروبار ہے وہی اس کو اُٹھاتا ہے ہر ایک گاؤں بندھے ہوئے ہیں دوسرا شخص اُن کی طرف بھی نہیں دیکھتا۔ وزیر زراعت جناب عیڈن اسماعیل کا دفتر بھی دیکھا بہت سادہ دفتر تھا ایک بھی چپڑاسی نہیں تھا وزیر موصوف نے خود دفتر کی کھڑکیاں کھولیں کرسیاں سیدھی کیں البتہ ایک خاتون جو دروازے کے ساتھ بیٹھی تھی اُن کی سیکرٹری تھیں انہوں نے آکر چائے پانی کا پوچھا اندر سے ایک گھنٹے کے بعد فارغ ہوئے تو وہ خاتون نماز پڑھنے چلی گئیں اور باہر سے تالا بھی لگا گئیں جس کا ہمیں چپڑاسی کے نہ ہونے کا پورا یقین ہوگیا واپسی پر انہوں نے باہر سے تالا کھولا ہمیں معذرت کی۔ جنگ کی ہلاکتوں سے بہت

خاندانوں کے سربراہ مارے گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہوگئے ہمیں یہ وزیر زراعت ایک یتیم خانہ بھی دکھانے لے گئے جہاں چند ماہ سے لے کر 18 بیس سال تک کے بچے بڑے اور چھوٹے کمروں میں دکھائے گئے یہ چھوٹے بچے اُن ماؤں کے ہوتے ہیں جو غربت کی وجہ سے نہیں پال سکتیں تو وہ یتیم خانہ میں بھجوا دیتی ہیں صدر صاحب کی اہلیہ اس یتیم خانے کی سرپرست اعلیٰ ہیں جو بذات خود موجود تھیں۔ ہم نے 5 ہزار ڈالر کا عطیہ بھی انہیں پیش کیا۔ انہوں نے پاکستانیوں کا شکریہ ادا کیا اور رات ہم کو قصر صدارت میں صدر صومالی لینڈ کے ساتھ کھانے کی دعوت دی اور کہا آپ کا کھانا میں خود پکاؤنگی، صومالی لینڈ کا دستور ہے وہ اپنے مہمان کیلئے کھانا خود اپنی بیگمات سے پکواتے ہیں رات ہم کھانے کی دعوت پر گئے قصر صدارت دیکھ کر ہمیں اپنے حکمران بہت یاد آئے بہت سادہ کمپاؤنڈ میں جو غالباً چار ہزار گز پر کچا پکا لان پر مشتمل دو منزلہ سادہ سی عمارت تھی گیٹ پر لسٹ میں ہمارا نام لکھا تھا اور چونکہ وزیر زراعت جناب عیڈن صاحب اور محمد عثمان موجود تھے لہٰذا گیٹ کھول دیا گیا تین چار فوجی کپڑوں میں گارڈ تھے۔ محل کیا تھا سادگی کا نمونہ تھا نہ کوئی اے ڈی سی نہ پرنسپل سیکرٹری نہ آگے پیچھے مسلح گارڈ صدر صاحب کا دفتر اور گھر پہلی منزل پر واقع تھا۔ وہاں پہنچے تو صدر صاحب اکیلے ہی ہمارا انتظار کررہے تھے۔ بہت سادگی کے ساتھ وہ میرے اور صاحبزادے سلمان کے بغل گیر ہوئے ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے صومالی لینڈ کے مطابق بہت کارآمد باتیں بتائیں۔ مجھ سے کہا کہ آپ پاکستانیوں کو کہیں کہ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کریں ہم بہت مراعات دیں گے ساتھ انہوں نے صومالی لینڈ کی بہت سی معلوماتی کاروباری کتابچے بھی دیئے۔ یہاں بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ مگر سیمنٹ کا کوئی کارخانہ نہیں ہے۔ تمام اشیاء پڑوسی ملک ایتھوپیا یا جبوتی سے درآمد کرنی پڑتی ہیں ہم ابھی باتیں کررہے تھے کہ ایک شخص نے دروازہ بجا کر کہا کہ جناب کھانا لگ گیا ہے صدر صاحب عزت مآب داہر ریلے کاہن (Dahir Rayale Kahin) نے کہا چلئے پہلے کھانا کھاتے ہیں باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی

وہ شخص اکیلا ایک خوان میں مچھلی کے بنے ہوئے کٹلٹس لے کر پہلے میری طرف آیا تو میں نے اصرار کیا نہیں پہلے جناب صدر آپ تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ایسا ہماری روایات کے خلاف ہے چار و ناچار میں نے اپنی پلیٹ میں کٹلٹس ڈلوایا وہ پھر میرے صاحبزادے کی پلیٹ میں ڈال کر صدر صاحب کی طرف گیا اور اُن کی پلیٹ میں بھی ایک کٹلٹس ڈالا پھر وزیر زراعت اور میرے دوست کی پلیٹ میں ڈال کر خوان واپس لے گیا پھر برابر کے باورچی خانہ سے پھر آیا اب کے خوان میں چاول تھے اُسی ترتیب سے اُسی نے چاول ڈالے پھر چلا گیا پھر واپس اکیلا خوان لے کر آیا اُس میں بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا تین دن سے ہی بھنا گوشت کھا کھا کر میرا دل بھر چکا تھا کیونکہ یہی صومالی لینڈ والوں کی اہم ڈش ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں White Meat مچھلی کھانا پسند کرونگا اُس نے خوان ٹیبل پر رکھا باورچی خانے گیا اور دوبارہ وہی مچھلی کے کٹلٹس کا خوان اٹھایا اور میری پلیٹ میں ڈال کر دوبارہ بکری کے گوشت کا خوان اٹھا کر اُسی ترتیب سے سب کی پلیٹ میں ڈال کر چلا گیا۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ مچھلی سے مراد نئی قسم کی مچھلی کی ڈش ہوگی مگر حکمرانوں کی سادگی جو عوام کی سادگی کی طرح میں نے پورے صومالی لینڈ میں پائی وزیر زراعت خود اپنی گاڑی چلا رہے تھے سادہ سی سلاد بھی ٹیبل پر رکھی گئی تھی آخر میں فروٹ مکس کی خاطر تواضع آخری آئٹم تھی۔ کھانے کی میز سے اُٹھ کر صدر صاحب کے ساتھ واپس کمرے میں آیا تو سب سے پہلا سوال میرا یہ تھا کہ آپ کے قصر صدارت میں سالانہ بجٹ کیا ہے؟ صدر صاحب نے فرمایا تمام فوجی گارڈ، بجلی، گیس بمعہ میرے خاندان اور مہمانوں کی خاطر و مدارت تین لاکھ ڈالر یعنی ایک کروڑ اسی لاکھ روپے سالانہ یعنی 15 لاکھ روپے ماہانہ جس میں غیر ملکی دورے بھی شامل ہیں یہ حکومت صومالی لینڈ کی طرف سے ملتا ہے جس میں صدر صاحب کی تنخواہ بھی شامل ہے میں نے صرف اپنے غریب صدر سے موازنہ کیا جس میں نہ تنخواہ شامل ہوتی ہے نہ غیر ملکی سفر کے اخراجات صرف اور صرف 29 کروڑ اور وزیر اعظم 23 کروڑ روپے اسلام آباد والے صدارتی اور وزیر اعظم

سیکریٹریٹ کا خرچ ہوتا ہے۔ کراچی، لاہور، کوئٹہ کے اخراجات کا علم مجھے ابھی تک نہیں ہو سکا البتہ اس قومی اسمبلی کے 534 ارکان پر اگر وہ اسمبلی کے 5 سال چلے تو 900 کروڑ کے اخراجات ہوتے ہیں ۔صومالی لینڈ کے وفاقی وزیر (وہاں صوبائی وزیر نہیں ہوتے) اُن کی تنخواہ صرف 500 ڈالر یعنی 30 ہزار روپے ماہانہ ہوتی ہے۔ مجھے ہرگیسا کے گورنر سے بھی ملوایا گیا جس کی سادگی کا اندازہ اس سے لگائیں کہ وہ صرف ایک لنگی اور لنگی کے اوپر شرٹ پہنے ہوئے تھے۔ صرف ایک گاڑی میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ ملنے آئے تھے نہ آگے پیچھے سائرن نہ پولیس کی موبائلیں نہ پی اے نہ پرنسپل سیکرٹری واہ اللہ کیا سادگی میں نے دیکھی یقین نہیں آتا کہ حکمران ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔

کینیڈا میں مذہبی آزادی

میں سال میں دومرتبہ کم ازکم کینیڈا امریکہ اور یورپ جاتا ہوں ایک گرمیوں میں دوسرا سردیوں میں ۔سردیوں میں جب کینیڈا اورلندن برف سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے جیسا کہ آج کینیڈا میں درجہ حرارت منفی 28 سینٹی گریڈ ہے ہرطرف برف ہی برف جمی ہوئی ہے سڑکیں ویران ہیں کیونکہ محکمہ موسمیات نے مزید سردی کی پیشگی اطلاع کے ساتھ سخت جھکڑ چلنے کا عندیہ دیا ہوا ہے خصوصاً خواتین اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ گھروں میں رہنے کا مشورہ دیا ہوا ہے لہٰذا میں بھی گھر میں بیٹھ کر سکون سے کالم لکھ رہا ہوں ۔آج کل پاکستان کے موجودہ حالات کی وجہ سے تقریباً اکثر پاکستانی صنعتکاروں کے کاروبار اور فیملیز پاکستان سے باہر جانے پر مجبور ہو چکی ہیں خصوصاً گذشتہ 7 آٹھ سال سے ہر کوئی دہشتگردوں، بھتہ خوروں سے ڈرا ہوا رہتا ہے مگر جب سے سانحہ پشاور کا واقعہ ہوا ہے تو پورا پاکستان ہل کر رہ گیا مگر جب ہماری افواج کی طرف سے فوجی عدالتیں لگنے کا عمل شروع ہوا تو قوم نے سکون کا سانس لیا اور پھانسی کے مجرموں کو لٹکانا شروع کیا تو اب امید ہو چلی ہے کہ پاکستان کے حالات میں یقیناً تبدیلی آئے گی ۔جب ماضی میں راقم کینیڈا میں کسی بھی پاکستانی دوست یا رشتہ دار سے ملتا تھا تو وہ سب سے پہلے پاکستان کے بگڑے حالات پر تبصرہ کئے بغیر نہیں رہتا تھا مگر اس مرتبہ فوجی عدالت کی وجہ سے یہاں

پر رہنے والے لاکھوں پاکستانیوں میں خاصی تبدیلی بھی دیکھنے میں آئی ہے اور اب وہ یہ دوبارہ سمجھتے ہیں کہ اگر دہشت گردوں کا مکمل طور پر صفایا نہ کیا گیا تو حالات مزید بگڑ سکتے ہیں جس سے قوم اور فوج دونوں کو ہوشیار رہنا ہوگا ۔ہمارے دشمن ممالک کو اب تک ہمارا ایٹمی پروگرام ہضم نہیں ہو سکا اور ماضی کا مضبوط پاکستان اور اسکی بہادر افواج آج بھی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں ۔وہ پاکستان کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے اُن کے ایجنٹ آج بھی پاکستان میں بیٹھ کر ہر طرح کا نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اسی طرح کچھ سیاسی جماعتیں بھی ان کے ساتھ ملکر دانستہ طور پر رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتیں ہیں خصوصاً جب انکے مفادات کو نقصان پہنچے تو وہ کھل کر سینہ سپر ہو جاتی ہیں فوجی عدالتیں چونکہ فوری طور پر انصاف دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ان کا کوئی مفاد بھی نہیں ہوتا اس وجہ سے مذہبی جماعتیں مدارس کی آڑ میں غلط کام بھی کروانے کی کوشش کرتی ہیں اگر صحیح معنوں میں تجزیہ کیا جائے تو مدارس حقیقی درسگاہوں کا درجہ رکھتے تھے، علماء کا بہت احترام ہوتا تھا علماء دنیاوی کاموں خصوصاً سیاست سے دور رہ کر اسلام کی تعلیم دینے میں دلچسپی رکھتے تھے مگر آج یہ بھی ایک کمائی کا ذریعہ بن چکا ہے اب تو بہت سے مفتی اور علماء نے تو حد ہی کر دی اربوں کھربوں روپے کے مضاربوں کی آڑ میں عوام کو لوٹا جا رہا ہے دین کو تجارت بنا کر قوم کو بیوقوف بنا رکھا ہے ۔یہاں میں حکومت کو ایک صائب مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تمام مدارس اور اسکولوں میں جہاں جہاں قرآن پڑھایا جاتا ہے لازمی طور پر اس کا ترجمہ بھی پڑھایا جائے تاکہ پڑھنے والے بچے کو پتہ چلے کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے جس طرح انگریزی کا ترجمہ کرایا جاتا ہے بالکل اسی طرح قرآن کا عربی سے اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ پڑھایا جائے تو یقیناً آنے والے زمانے میں ہمارے بچے بھی قرآن کے صحیح معنوں میں مسلمان بنیں گے ورنہ لاکھوں حافظ قرآن زبانی تو پورے قرآن کو حفظ کر لیتے ہیں مگر بدقسمتی سے ایک لفظ کے معنی بھی نہیں جانتے اس لئے وہ عملی طور پر لاعلم ہی رہتے ہیں مگر جب وہ معنی کے ساتھ قرآن پڑھیں گے تو وہ بہکانے والے مولویوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے اور

اسی لاعلمی کی وجہ سے ان سے آج غلط کام کروا کر اسلام کو بدنام کر دیا گیا ہے۔آج پوری دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمانوں میں عربوں کو چھوڑ کر 99 فیصد مسلمان قرآن کی ہدایت سے ناواقف ہیں مفتیان وعلماء اُن کو مسلکوں میں الجھا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں آج صبح کینیڈا کی خبروں میں پیرس کے واقعہ کا ردِعمل بھی دیکھنے اور سننے میں آیا جس میں بتایا گیا کہ فرانس کے جریدے نے جو 60 ہزار کی طباعت کرتا تھا تیس لاکھ اشاعت کر کے پوری دنیا میں فروخت کر دیا ہے اب مزید تیس لاکھ اور چھاپ کر فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے دو لاکھ تو کینیڈین قوم بھی خریدے گی اعلانات میں بتایا گیا ہے کہ جمعہ تک یہ اخبار کینیڈا میں بھی فروخت کے لئے آجائے گا اس سے یقیناً مسلمانوں کے خلاف نفرتیں بڑھیں گی۔پاکستانی علماء اور عوام کی اطلاع کے لئے بتاتا چلوں کہ کینیڈا میں ہر مذہب کو اتنی آزادی ہے جتنی شاید کسی بھی 56 مسلمان ملکوں میں ہو ہمارے محلے میں ایک گرجا گھر ہے جس میں جمعہ کی باقاعدہ نماز اور خطبہ ہوتا ہے ہفتہ کو وہی گرجا یہودی استعمال کرتے ہیں اور اتوار کو عیسائی اپنی عبادت کرتے ہیں آج تک کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔میں بھی اکثر جمعہ کی نماز اسی گرجے میں جا کر پڑھتا ہوں جو دو گلیاں پیچھے واقع ہے اس گرجے کی ایک دن کی بکنگ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے پچھلے سال محرم میں ہم ایک بازار سے گزر رہے تھے تو ایک طرف کی سڑک بند تھی جب دوسری طرف سے ہم گزرے تو دیکھا اہل تشیع ماتم کر رہے تھے اور کینیڈین تعجب سے دیکھنے کے لئے جمع تھے۔جلوس کے ساتھ ساتھ چند پولیس والے بھی چل رہے تھے۔گذشتہ سال چند خواتین نے جمعہ کی نماز پڑھانے کا اعلان کیا تو اس مسجد میں تو بیس پچیس خواتین نماز با جماعت خاتون کی امامت میں پڑھ رہی تھیں البتہ سینکڑوں مرد حضرات انہیں دیکھنے جمع ہو گئے تھے مگر یہاں کے قانون کے مطابق کوئی کسی پر اعتراض نہیں کر سکتا آزادی کی ایک جھلک یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ ایک سرکاری زمین جو کمیونٹی سروس کے لئے خالی تھی تو مسلمانوں نے مل کر مسجد بنانے کی درخواست دی ساتھ ساتھ عیسائیوں نے بھی گرجے کی درخواست دی

تو انتظامیہ نے وہ قطعہ اراضی مسلمانوں کو الاٹ کر دیا کیونکہ اس علاقے میں گرجا گھر پہلے سے موجود تھا مگر مسجد نہیں تھی اور مسلمانوں کے گھر بھی زیادہ تھے۔اکثر مسلمان جہاں مسجد ہوتی ہے اس کے نزدیک رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اس وجہ سے وہاں حلال سامان کی دوکانیں بھی کھل جاتی ہیں جس سے مسلمانوں میں جن میں اکثریت پاکستانی اور ہندوستانی ہوتے ہیں سب بہت محبت کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔کیا پاکستان میں ایک مسلک کی مسجد میں دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والے امامت کر سکتا ہے۔جہالت کی وجہ سے ہم خود آپس میں بٹے ہوئے ہیں اسی وجہ سے ہم کمزور ہو چکے ہیں یہاں اگر کوئی پانچ سال رہے تو اس کو کینیڈین شہریت مل جاتی ہے کیا کسی مسلمان ملک میں بیس بیس سال سے پاکستانی رہتے ہیں ان کو شہریت تو کجا لاکھوں روپے لیکر بھی کفیل اور سرکاری فیس کی مد میں خرچ کر کے ہر دو سال بعد اُس کی تجدید کرانی پڑتی ہے۔

کینیڈا میں پاکستانیوں کی خدمات

پچھلے ہفتہ کے دن ہمارے ایک دوست شاکر رحمت اللہ نے جو کینیڈا میں گزشتہ 20 سال سے مقیم ہیں، بہت بڑے بلڈر بھی ہیں۔ ہمیں ایک دن ایک ڈاکومنٹری فلم میپل مورننگ (Maple Morning) دیکھنے کے لئے مدعو کیا جو پاکستانی سفارتخانے کے سابق قونصل جنرل ڈاکٹر اصغر کولو کی خواہش پر پاکستانی آرٹسٹ و کیروگرافر جناب فہیم حامد علی خان نے بہت خوبصورت فلم بنائی جس میں صرف پاکستان سے تعلق رکھنے والے کامیاب ترین پڑھے لکھے ہنر مند تاجر، صنعت کار، بلڈرز، ڈاکٹر، پروفیسرز، انجینئرز جو گزشتہ نصف صدی سے لے کر گزشتہ 10 سال سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ جس میں آغا خانی، بوہری، قادیانی فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی کی عکاسی کی گئی ہے، یہ فلم تقریباً ڈھائی 3 گھنٹوں پر محیط تھی۔ جس کو کھچا کھچ بھرے تھیٹر میں بڑے شوق اور اطمینان سے مقیم پاکستانیوں نے دیکھا اور کامیابیوں کو سراہا۔ اس فلم میں صرف کاروباری یا ہنرمندی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ان کی کینیڈین کمیونٹی کی خدمات کو بھی اُجاگر کیا گیا تھا اور متفقہ طور پر ہر شخص نے اپنے اپنے پیشے کے لحاظ سے کمیونٹی کے لئے بہت وقت نکالا اور عوام الناس کی خدمت کی۔ فلم میں بہت بڑی لسٹ میں شامل ہمارے پاکستانی ایم پی حضرات یاسر نقوی، محترمہ اقراء خالد، سلمٰی زاہد، ممبر

پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق قادری، سینیٹر سلمٰی عطاء اللہ جان صاحب، سابق ایم پی خالد عثمان صاحب شامل تھے۔ کاروباری حضرات میں کلیم صدیقی، شاکر رحمت اللہ، علی قلزلباش، ڈاکٹر محبوب الٰہی کے علاوہ درجنوں قابل قدر افراد شامل ہیں۔ اس فلم میں خصوصاً کینیڈا اور پاکستان بزنس کونسل کے صدر جناب سمیر ڈوسل کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا ہے۔ جن کی بدولت ان دونوں ملکوں کی درآمدات اور برآمدات کا ہدف ایک ارب ڈالر سالانہ تک پہنچ گیا ہے۔ فلم کے اختتام پر مارکھم شہر کے میئر جناب فرانک اسکارپٹی نے تقریر میں مزید حیرت زدہ کر دیا کہ مارکھم میں سب سے زیادہ پاکستانی تجارت اور پڑھے لکھے پیشوں سے وابستگی کے ساتھ ساتھ کمیونٹی سروس میں دوسرے ممالک سے آئے ہوئے امیگرینٹس میں سب سے آگے ہیں اور مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قانون کے احترام میں بھی سب سے آگے ہیں۔ مارکھم ہسپتال کی مد میں 56 ملین ڈالرز کی خطیر رقم کونسل کو جمع کر کے مارکھم کا سب سے اہم مسئلہ حل کرایا۔ پھر مہمان خصوصی اونٹوریو کی پریمیئر (چیف منسٹر) آنریبل کیتھلین وائن صاحبہ نے بھی خطاب میں کمیونٹی کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ ان سے میں اپنے سیاسی کیریئر میں شروع ہی سے متاثر رہی ہوں۔ ان کی انتھک خدمات کی وجہ سے میں آج اس عہدے پر 2 مرتبہ منتخب ہو کر پہنچی ہوں۔ یہ کمیونٹی سب سے اعلیٰ کردار کی حامل ہے اور میں ان کی شکر گزار رہوں۔ کینیڈا کے وزیر سائنس اور تحقیق کے ڈاکٹر رضا مریدی نے جو ایران سے کینیڈا میں سیٹل ہوئے ہیں نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر عبدالسلام کے شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بہت کچھ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام سے سیکھا۔ آج ان کی بدولت میں یہاں کا وزیر سائنس اور تحقیق ہوں اور کینیڈا میں جو بھی محنت کرتا ہے بغیر کسی رنگ، نسل، زبان، ثقافت و تعصب نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ کینیڈین صرف اور صرف کینیڈین ہوتا ہے اور ہم سب کو کینیڈین ہونے پر فخر ہے۔ آخر میں پاکستان کے قونصل جنرل جناب عمران صدیقی نے بھی تقریر میں پاکستان اور کینیڈا حکومت کے مشترکہ تعاون کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے کراچی میں سمندر ہاکس بے پر کینیڈین پاور

پلانٹ شامل ہے اور دیگر شعبوں میں بھی کینیڈا نے پاکستان سے بھرپور تعاون کیا اور پھر پاکستانیوں کی کینیڈا میں ترقی و کامیابیوں پر خراج تحسین پیش کیا۔ کینیڈا میں اس وقت 5 لاکھ مقیم پاکستانی پڑھے لکھے کامیاب افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں کسی بھی قسم کی نسل پرستی نہیں ہے، سب مل کر خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس فلم میں پی آئی اے کا بھی ابتدائی دنوں میں خدمات کا اعتراف شامل تھا۔ جس نے کینیڈین ائر لائنز کو ہوائی ٹیکنالوجی سے روشناس کرایا اور مانٹریال اولمپکس میں پاکستان کی ہاکی ٹیم کے گولڈ میڈل کا بھی ذکر تھا۔ الغرض پاکستانیوں کی روشن مستقبل کے لئے کینیڈا ایک لاجواب ملک ہے۔ جس نے ہر ملک کے پڑھے لکھے شہریوں کو اپنے اندر ایک اکائی میں سمو رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز سے بالا تر ہو کر صرف کینیڈین کلچر کو فروغ دیا جاتا ہے۔ دل کو بہت خوشی ہوئی، کاش ہماری حکومت ان 5 لاکھ موتیوں کی قدر کرتی اور ان کو ملک چھوڑ کر جانے پر مجبور نہ کرتی۔ تو یہی ان کروڑوں غیر ممالک میں پاکستانی واپس جا کر اپنے جوہر اپنے ہی ملک میں دکھاتے تو آج ہم کہاں سے کہاں ہوتے۔ اس تقریب کے دوسرے ہی دن کینیڈا کے شہر کیوبیک کی مسجد میں ایک دہشت گرد نوجوان نے رات عشاء کی نماز کے وقت بزدلانہ حملے میں 6 مسلمان نمازیوں کو شہید اور 20 مسلمانوں کو گولیوں سے زخمی کر دیا۔ تو پورے کینیڈا میں سوگ کے بادل چھا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی وفاقی، صوبائی حکومتیں حرکت میں آ گئی۔ قاتل کو دوسرے ہی دن گرفتار کر کے مقدمات بنا کر جیل میں ڈال دیا اور ہر طرف مسلمانوں سے ہر طرح کی یکجہتی دیکھنے میں آئی۔ کیوبیک مسجد کے باہر ہر قوم، مذہب، نسل کے باشندے اظہارِ یکجہتی کے لئے جمع ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا کینیڈا سوگوار ہو گیا ہے۔ میں نے آج تک دیارِ غیر میں مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہمدردیاں خود مسلمان ملکوں میں نہیں دیکھی جو کہ کینیڈا میں دیکھی۔ خود یہاں کے وزیراعظم جسٹن ٹروڈو اس قتل کے خلاف ایسے ڈٹے کہ جس کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی ہے۔ وزیراعظم نے ان مسلمانوں کے جنازے میں پہلے دن شرکت کی جو انتقال کر چکے تھے اور

دوسرے دن 3 مسلمانوں جن کی تدفین کینیڈا میں ہوئی، ذاتی طور پر شرکت کی۔ اس طرح ہزاروں غیر مسلموں نے نماز جنازہ میں شرکت کی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ کیا اس طرح کی مثال 52 مسلمان ممالک کے رہنماؤں اور شہریوں نے اپنے ملک میں قائم کی ہے۔ اس کے برعکس کچھ مسلمان دشمن عناصر جو غصے میں بھرے ہوئے تھے، ردِعمل کے طور پر مساجد پر پتھراؤ بھی کیا۔ ہر شخص خواہ وہ کسی بھی مذہب، فرقے ملک سے تعلق رکھتا تھا، قاتل پر تھوتھو کرتا تھا۔ مساجد اور گرجا گھروں میں یکجہتی کے لئے افراد جمع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانو یہ تمہارا ملک ہے، ہم تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں، سٹی سینٹرز میں تعزیتی جلسے ہوئے جس میں مسیحی پادریوں نے خصوصی طور پر کیونکہ قاتل کا تعلق مسیحی برادری سے تھا خاص طور پر مذمت کی اور کھل کر مسلمانوں کو مخاطب کر کے اپنے گرجا گھروں میں بھی اظہارِ یکجہتی کیا۔ مرنے والوں کے لئے جہاں مسلمانوں نے فاتحہ خوانی کی، انہوں نے مسجد کے باہر پھولوں کے انبار لگا دیئے اور شمع جلا کر ثابت کیا کہ وہ واقعی کینیڈین ہیں اور بس صرف کینیڈین کے علاوہ کچھ نہیں۔

کینیڈا میں بچوں کا ہسپتال

پاکستان کی آبادی 20 کروڑ سے بھی بڑھ چکی ہے ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں نے عوام سے صرف ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ ڈھونڈ رکھا ہے۔یعنی طرح طرح کے ٹیکس جو دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ہمارے بیوروکریٹس حضرات نے جبراً مسلط کر رکھے ہیں جبکہ یہ حکمران اور بیوروکریٹس نے ہر ممکن اُن سے بچنے کے طریقے بھی وضع کر رکھے ہیں اور ہمارے مظلوم عوام خاموشی سے اُن کو ادا کر کر کے ہلکان ہو چکے ہیں۔گزشتہ ایک چوتھائی صدی میں ایک درجن سے زائد نئے ٹیکس ایجاد ہوئے ۔حتیٰ کہ شیر خوار بچے کی غذا سے لے کر بوڑھے افراد کو بھی نہیں بخشا گیا۔اس کے برعکس اس عرصہ 25 سال میں ایک نیا ہسپتال، کالج، یونیورسٹی یا کوئی فلاحی ادارہ حکومت نے تشکیل نہیں دیا، جو ترقی ہوئی وہ خود عوام نے اپنے مدد آپ خود تشکیل کی۔اگر پرائیویٹ اسکول نہ ہوتے تو ہم ترقی پذیر ممالک کی طرح اچھی تعلیم سے بھی محروم ہوتے۔سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیز کا اسٹینڈرڈ سب کے سامنے ہے۔ہسپتالوں کی حالت سے بھی ہر کوئی واقف ہے۔صرف غریب غربا ءاُس کی طرف رُخ کرتے ہیں۔اور اُن کو بھی خود ادویات لانے کی ہدایت ملتی ہیں، گندے بستر اُن کا مقدر ہیں۔گزشتہ تین ہفتوں سے راقم کینیڈا میں مقیم ہے اتفاقاً ایک عزیز کے صاحبزادے جو ٹورنٹو شہر کے ہسپتال میں داخل تھے اُن

کی تیمارداری کے لئے جانا پڑا تو بہت حیرت ہوئی کہ یہاں مریضوں کا کیسے خیال رکھا جاتا ہے۔خصوصاً بچوں کے لئے ایک خصوصی ہسپتال جس کا نام (Sick kids) یعنی بیمار بچوں کے لئے جو پیدائش سے لے کر 18 سال تک کے بچوں کے لئے مخصوص تھا، دیکھ کر دل عش عش کر اُٹھا کہیں سے ہسپتال نہیں لگ رہا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کسی عالی شان فائیو اسٹار ہوٹل میں آ گئے ہوں۔ایسا ہسپتال جس کو ہسپتال نہیں کہا جا سکتا تھا۔داخل ہوتے ہی ہوٹل جیسے استقبالیہ، آپ نے کہاں جانا ہے، رہنمائی کے لئے تندہی سے اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف تھے۔آگے بڑھے تو کسی مال (Mall) کا نقشہ تھا۔10 بارہ ریسٹورنٹس، کافی شاپ، بیٹھنے اور گپ شپ کیلئے بہت خوبصورت علاقہ مخصوص تھا۔ مریضوں کے اہلخانہ اور ملنے والوں کے لئے آسائش سے بھرپور کاؤنٹر تھے۔ساتھ ساتھ گروسری کی دکان بھی تھی۔مریض بچوں کی رہائش بھی قابل دید تھیں۔خوبصورت بستر رنگ برنگے پھولوں کی ٹوکریاں ننھے منھے بچوں کے کھیلنے کے لئے چھوٹے بڑے کھلونے ایسا لگ رہا تھا جیسے بچے پکنک منانے آئے ہوں۔ہر فلور پر مریضوں کے بیٹھنے کے لئے باقاعدہ خوبصورت سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔مریض بچوں کے والدین کو فون پر آنے کا وقت اور کہاں کس ڈاکٹر سے ملنا ہے ایڈوانس مطلع کر دیا جاتا ہے تاکہ کسی کو انتظار کی زحمت بھی نہ ہو اور نہ ہی غیر ضروری بھیڑ بھاڑ لگے۔ہم بتائے ہوئے کمرے میں گئے تو کوئی دقت نہیں ہوئی۔اتفاق سے اُسی وقت مطلوبہ ڈاکٹر بھی کمرے میں آیا۔مریض کے کوائف تیار کر کے نرس نے پہلے ہی بستر پر رکھ دیئے تھے۔ڈاکٹر کے ساتھ 2 جونیئر ڈاکٹرز بھی تھے جن کو وہ مرض اور مریض کی کیفیت بتا کر علاج و ادویات کی تفصیل بتا رہا تھا۔ہم بھی اُن کی باتوں سے متاثر ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ مریض اُن ڈاکٹروں کا رشتہ دار یا خصوصی شخصیت کا حامل ہے۔حالانکہ وہ گورے اور ہم پاکستانی، خود ہمارے ملک میں مہنگے ترین ہسپتالوں میں نرسوں اور ڈاکٹروں کے نخرے دیکھتے رہتے تھے۔کہیں سے محسوس نہیں ہوا کہ ہم کینیڈا میں ہیں وہ بھی دیارِ غیر میں، جان کتنی قیمتی ہے ایک مریض کی

ڈاکٹروں ونرسوں کومعلوم ہے ۔قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کینیڈا میں ہر کینیڈین شہری یا رہائشی کے لئے تعلیم اور علاج معالجہ حکومت کی ذمہ داری ہے ۔وہ بھی صوبائی حکومت کی کیونکہ صوبائی ٹیکس جوصوبوں سے وصول ہوتا ہے وہ اور اُس میں کمی بیشی مرکزی حکومت پورا کرتی ہے ۔کینیڈا کی آبادی تقریباً 36 ملین یعنی ساڑھے 3 کروڑ سے کچھ زیادہ ہے،اس کے 10 صوبے ہیں اور 3 اضافی صوبے جن کو Territories کہتے ہیں، ملا کر 13 صوبے بنتے ہیں ۔ہر صوبے کا اپنا اپنا بجٹ ہوتا ہے ،اس میں بھی کئی شہر ہوتے ہیں ۔ان کے میئر اور صوبائی چیف منسٹر، وزراء ہوتے ہیں ۔یہ سب عوام کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ۔ہم جس شہر میں مقیم تھے اس شہر مارکھم کے میئر سے ملنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ اربوں روپے کا بجٹ ہونے کے باوجود اس میئر کو ڈرائیور نہیں ملتا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں کے میئروں کو تو گاڑی بھی نہیں ملتی ۔یہی حال ان کے وزراء کا بھی ہے،وہ ذاتی کام کے لئے سرکاری گاڑیاں استعمال نہیں کر سکتے ۔خود وزیر اعظم کے لئے صرف ایک رہائش گاہ مخصوص ہے ۔ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں سرکاری دورے پر جائے گا تو مقامی ہوٹل میں ہی ٹھہرے گا۔کسی دوست کے ہاں بھی نہیں ٹھہرے گا۔کہیں وہ دوست اس سے سرکاری کام نہ کرائے یا کوئی اضافی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے ۔وہاں ہر شخص عوام کو جوابدہ ہے ۔کسی قسم کی رشوت یا رشوت نما فائدہ قابل جرم ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹیکس دینے والوں کا حق ہے کہ ان کا پیسہ غیر ضروری خرچ نہیں ہونا چاہئے ۔دنیا کے 50 سے زائد ممالک دیکھنے کے بعد (جس میں مسلمان خلیجی ممالک نہیں، جہاں بادشاہت ہے) ان جمہوریت پرست ممالک میں ترقیوں کی وجہ صرف کرپشن سے پاک سیاستدان ہی حکمران بن سکتے ہیں ۔اس میں کینیڈا کا نمبر 1 ہے، جہاں عوام سے مذہب، زبان، تہذیب وتمدن کے بجائے صرف اور صرف کینیڈین کا تشخص سمجھا جاتا ہے ۔یہاں کسی کے ساتھ کوئی خصوصی یا کمی کا برتاؤ قانونی جرم ہے ۔ تعصب کا دور دور تک واسطہ نہیں ہے ۔ہر قوم یہاں آ کر آباد ہے، خواہ وہ مسلمان، یہودی، عیسائی،

لامذہب ہوں اس سے سرکار کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۔آپ کسی سے اقرار پر وری نہیں کر سکتے ،قانون کی سختی سے حفاظت کی جاتی ہے ۔حتیٰ کہ آپ اپنے بنگلے کے سامنے رات 2 بجے کے بعد گاڑی سڑک پر نہیں کھڑی کر سکتے تا کہ سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں کے لئے رکاوٹ نہ ہو اور آڑی ترچھی گاڑی کھڑی کرنے سے آپ کا چالان ہو سکتا ہے ۔انسان ہی نہیں یہاں جانوروں، درختوں کی بھی حفاظت اسی طرح کی جاتی ہے، جیسے انسانوں کی قدر کی جاتی ہے ۔اسلام میں جن جن باتوں کی عوام سے ہمدردیاں اور ضروریات کی اہمیت بتائی گئی ہے وہ سب کینیڈا میں آپ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں ۔اگر کسی کا روزگار ختم ہے، اس کی دیکھ بھال حتیٰ کہ رہائش بھی حکومت کی ذمہ داری ہے ۔اس میں نقد امداد بھی شامل ہے، جیسے خلفائے راشدین کے زمانے میں بیت المال کا کردار، آپ کو موجودہ دور میں بھی کینیڈا میں نظر آئے گا۔کاش ہمارے مسلمان ممالک اس سے سبق سیکھیں جہاں 1 درجن سے بھی زیادہ قومیں آزادی کے ساتھ رہتی ہیں ۔ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو بنیادی طور پر مقامی کینیڈین کو حاصل ہیں۔

کینیڈا کے شب و روز

کینیڈا میں جوں جوں سردی اور برفباری کا زور ٹوٹتا ہے تو دھوپ نکل آتی ہے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے، عورتیں، بوڑھے بچے سب کے چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ کینیڈا میں پڑھے لکھے پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ جس میں ڈاکٹرز، انجینئرز، آئی اسپیشلسٹ، گریجویٹ ان سب کو کینیڈین حکومت کے ذریعہ باہر سے بلوایا جاتا ہے جس کی وجہ کینیڈا کی اپنی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہے اب تو بہت سے علاقوں میں چینی، کورین، پاکستانی، بھارتی اور سری لنکن کی واضح آبادی نظر آتی ہے۔ کینیڈا رقبے کے اعتبار سے دنیا میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ مگر آبادی چند کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ بیشتر زمین زیر کاشت رہتی ہے۔ بجلی کینیڈا نیاگرہ فال سے پیدا کرتا ہے اور امریکہ کو خصوصاً نزدیکی شہروں خاص طور پر نیویارک کو سپلائی کرتا ہے۔ اسطرح کینیڈا تیل کی پیداوار میں بھی خود کفیل ہے مگر یہ تیل صفائی کیلئے امریکہ کی ریفائنریوں میں صاف کر کے واپس کینیڈا کو لوٹا دیا جاتا ہے معاہدے کے مطابق کینیڈا میں تیل صاف کرنے کی کوئی ریفائنریاں نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تیل کی ٹرانسپورٹیشن کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور اس طرح کینیڈا کو مہنگا تیل بیچنا پڑتا ہے۔ کینیڈا میں ہر قوم اور مذاہب کی پوری آبادی ہے مگر کینیڈین حکومت صرف عیسائی کمیونٹی کو امداد دیگران کے گرجوں، مشنیوں کی

کفالت کرتی ہے اس کے علاوہ کینیڈا میں دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے جگہ جگہ مساجد اور اسلامی اسکولوں کا بہت بڑا نیٹ ورک قائم ہے جس کو مختلف ممالک کے مسلمان آپس میں چندہ جمع کر کے چلاتے ہیں۔ اسلامی اسکولوں کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ ان پر مساجد کے اخراجات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ کینیڈا میں آپ کوئی گرجا یا دوسرے مذاہب کی عمارتیں خرید کر ان کو مساجد اور سکولوں میں تبدیل کر کے آزادی سے اپنے مذہب کی رسومات ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ سب کچھ چار دیواری میں اس طرح کیا جاتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں یعنی خطبے اور اذانوں کی آوازیں اندر تک محدود ہونی چاہئیں۔ بہت سی مساجد میں 2 جمعہ کی نمازیں اور کئی کئی عیدین کی نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس مرتبہ جب میں اپنے گھر پر ٹھہرا تو میرے صاحبزادے خرم خلیل نے بتایا کہ محلے کے مسلمانوں نے مل کر ایک گرجے کی عمارت کرائے پر لے کر جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ اس کو مصلاء کہا جاتا ہے 12 بجے سے 3 بجے تک وہ گرجے کی عمارت خالی کرنی پڑتی ہے۔ ساتھ میں پارکنگ کا بھی بندوبست کر لیا گیا ہے لوگوں کو خیال ہے اگر یہ گرجے کی عمارت بیچنی پڑے تو مسلمان مل کر چندا اکٹھا کر کے اس مصلاء کو مسجد میں تبدیل کر سکتے ہیں کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ البتہ مذہبی اداروں پر حکومت اور مقامی کاؤنٹیز کا کوئی ٹیکس نہیں ادا کرنا پڑتا اور اس پر عطیات انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ ہوتے ہیں مگر اس کے لئے حکومت سے اجازت اور ہر سال آڈٹ کرانا ضروری ہے۔ میں سوچتا ہوں ہمارے مسلمان ممالک میں مساجد میں ایک دوسرے مسلک کی نمازیں ادا نہیں کی جا سکتی اگر ایسا ہو جائے تو خون خرابہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں طرف مسلمان ہی ہوتے ہیں یہاں کسی عیسائی، ہندو، سکھ، یہودیوں کو اعتراض کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی نے ایسی شرارت کرنے کی کوشش بھی کی تو فوراً پولیس حرکت میں آ کر کسی کو بھی نہیں چھوڑتی۔ کینیڈین حکومت کی سادگی کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ یہاں ہر شہر کا ایک MP ہوتا ہے جس کا اس علاقے میں دفتر ہوتا ہے اور اس کے اوقات درج ہوتے ہیں یہی سینیٹروں کا

کام ہے وہ اپنے اپنے علاقوں کی عوام کی تکالیف نا صرف سنیں بلکہ ان کو حل بھی کرتے ہیں۔کینیڈا کا دارلخلافہ اٹاوہ ہے۔اگر وزیراعظم کسی بھی دوسرے شہر میں وزٹ کرے گا تو وہ مقامی ہوٹل میں ٹھہرے گا کوئی وزیراعظم یا گورنر ہاؤس نہیں ہوتے۔ان کی حفاظت کا معمولی سا انتظام ہوتا ہے۔صرف ایک پولیس گاڑی یا پھر چند گارڈ آگے پیچھے ہوتے ہیں۔جس علاقے میں ہماری رہائش ہے وہاں کا میئر بہت ہنس مکھ اور ہر ایک سے بڑی عاجزی سے ملتا ہے اس علاقے میں پاکستانیوں کی اکثریت ہے تو ہمارے پاکستانی MP اور دیگر عہدیداران اکثر اس کو بلاتے رہتے ہیں میری بھی ملاقات رہتی ہے۔ہر دفعہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتائیں۔میں نے اس کو بتایا میں اپنی چھٹی کتاب ''صوبے کیوں ضروری ہیں'' کی لانچنگ کرنا چاہتا ہوں اس نے نا صرف فلیٹو مارکھم آڈیٹوریم دیا جو ایک مقامی پاکستانی شاکر رحمت اللہ کے نام ان کی خدمات کی وجہ سے منسوب ہے۔یہ بھی ایک پاکستانیوں کیلئے اعزاز ہے۔پھر تقریب میں بھی شرکت کے تمام انتظامات جناب شاکر رحمت اللہ اور مقامی سابق MP خالد عثمان صاحب نے چند دنوں میں ہی کر دیئے۔تقریب میں ہمارے پاکستانی قونصل جنرل محمد نفیس ذکریا صاحب بنفس نفیس تشریف لائے اور اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔اس تقریب کو جناب تسلیم الٰہی زلفی صاحب جو اردو ٹی وی کینیڈا کے مالک ہیں کینیڈا کے عوام کو بھی اپنے چینل سے دکھایا اس تقریب کو جیو ٹی وی کے بدر منیر چودھری صاحب نے بھی کور کیا اور کینیڈا میں جیو چینل سے نشر کیا۔تقریب کو کینیڈا میں راول ٹی وی کے محمد افضل صاحب نے بھی کور کیا اور بعد میں نشر بھی کیا یہ پاکستانی چینل کینیڈا میں رہنے والوں کیلئے ایک نعمت سے کم نہیں ہیں جو خبروں کے علاوہ مختلف تقریبات دکھاتے رہتے ہیں اس طرح اسی ہفتے ہمارے قونصل جنرل پاکستان جناب محمد نفیس زکریا صاحب نے ایک مشاعرہ بھی منعقد کروایا جس میں پاکستان سے بہت سے شعراء امجد اسلام امجد، محمود شام، پیرزادہ قاسم خصوصی طور پر مدعو تھے۔مشاعرہ کینیڈین پاکستانی شاعروں نے محفل لوٹ لی رات دیر تک

جاری رہا اسی طرح تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے ایک اور مشاعرہ مقامی شاعروں کا منعقد کیا جس میں خواتین شاعرہ بھی شامل تھیں۔ابتداء میں ایک مقامی شاعر جناب صالح اچھا صاحب کی کتاب دیدہ حیران کی بھی رونمائی ہوئی جس کی صدارت خود راقم نے کی۔کھانے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ویک اینڈ کی وجہ سے وہ بھی رات دیر تک جاری رہا۔اس میں بھی مقامی لوگوں نے بھرپور شرکت کی۔اس تقریب میں بھی ہمارے قونصل جنرل محمد نفیس زکریا صاحب بھی شریک ہوئے۔قارئین کینیڈا میں زندگی اتنی آسان نہیں ہے جتنی یہاں رہنے والے پاکستانیوں کو میسر ہے۔خود گاڑی چلانی پڑتی ہے۔گھر کا سامان خواتین خریداری کرتی ہیں۔ان کے ذمہ گھر کی صفائی، کھانا پکانے کے علاوہ بچوں کو سکول سے لانا اور لے جانا بھی ہوتا ہے کیونکہ مرد حضرات ڈیوٹیوں پر ہوتے ہیں صرف ویک اینڈ یعنی جمعہ کی شام سے اتوار کی رات تک لوگ تفریح کرتے ہیں۔ہر طرف سکون ہی سکون ہے۔قانون کی حکمرانی ہے، سڑکوں پر بہت کم پولیس نظر آتی ہے، ہر شہری کو سکول تک مفت تعلیم کا بندوبست، ہسپتال، علاج معالجہ مفت ہوتا ہے۔مارکھم ہسپتال کو مزید بڑھانا تھا 50 ملین ڈالر کی اپیل کی گئی تو مقامی لوگوں نے 56 ملین جمع کرا دیئے اس میں بہت سے پاکستانی، بھارتی اور دیگر بھی شامل تھے۔اگر آپ کے گھر یا دفتر میں آگ لگ جائے تو منٹوں میں فائر بریگیڈ آجائے گا مگر بعد میں آنے والے اخراجات کا بل بھیج دے گا ہر چیز میسر ہے مگر اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ہر ایک کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ذمہ داری ہے۔اسی وجہ سے اب زیادہ تر پڑھے لکھے اور صنعتکار باہر کا رخ کر رہے ہیں کینیڈا اس میں سرفہرست ہے اگر ہماری حکومت نے لاء اینڈ آرڈر ٹھیک نہیں کیا تو نقل مکانی میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے۔ویسے بھی پاکستان میں بجلی کی لوڈشیڈنگ ماضی سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے حکومتی وعدے خود حکومت کے الیکشن وعدوں کا منہ چڑا رہے ہیں خصوصاً ایک سال کا وعدہ اب 5 سال تک کے وعدوں تک پہنچ چکا ہے۔

ترکی کے سمندر اور پہاڑی علاقے جہاں سرکاری بجلی نہیں ہے

مسلمان ممالک میں ترکی کا شمار سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔اگر اس کا مذہب اسلام نہ ہوتا تو کب کا یورپی یونین میں شامل ہو چکا ہوتا۔اس کی 2 وجوہات بہت نمایاں ہیں۔اس کا ایک سرا یورپ سے ملتا ہے تو دوسرا سرا ایشیاء سے ملتا ہے۔ترکی کے حکمرانوں نے گذشتہ 10 بارہ سالوں میں پوری کوششیں کر ڈالیں کہ یورپی یونین ممالک اُس کو بھی دیگر یورپی ممالک کی طرح اسے بھی یورپی یونین کا حصہ سمجھیں۔یورپی یونین کے بہت سے مطالبات بھی اس نے تسلیم کر رکھے ہیں وہ اسرائیل سے بھی اچھے تعلقات رکھتا ہے جبکہ اس نے ساڑھے آٹھ،نو سال تک حکومت کی ہے اور بہت سے یورپین ممالک بشمول اسپین،بلغاریہ،رومانیہ،چیک سلواکیہ اور روسی ریاستیں اس کے قبضہ میں رہی ہیں مگر صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ شینگین ممالک کا درجہ نہیں پا سکا۔صرف چند مراعات اس کو خیرات اور تجارتی سہولتوں کی صورت میں دے رکھی ہیں۔ترکی کے موجودہ حکمرانوں نے اپنے ملک میں تعلیم کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے اور معاشی طور پر وہ بہت سے یورپین ممالک سے بہت آگے ہیں۔معاشی میدان میں سڑکیں اور بلڈنگ کنسٹرکشن میں بہت آگے ہے تو اس نے سیاحت میں بھی بہت سے ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا ہے آپ اگر شینگین ویزا یا پھر کسی بھی یورپی ممالک امریکہ،کینیڈا،

برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کا ویزہ یا اقامہ رکھتے ہیں تو ترکی کا آن لائن ویزا صرف 60 امریکی ڈالر میں گھر بیٹھے مل سکتا ہے۔اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں میری صاحبزادی اور ان کی فیملی جو لندن میں رہائش پذیر ہے انہوں نے لندن سے ترکی کے ایک ساحلی شہر جس کا نام ڈالامان (Dalaman) ہے۔پانچ روزہ ٹور بک کرایا ہم بھی مع بیگم ان کے ساتھ لندن سے ترکی کے اس ساحلی شہر کی سیاحت میں شامل ہو گئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ صرف 150 برطانوی پاؤنڈ یعنی دو طرفہ کرایہ پاکستانی رقم میں 26000 روپے بنتا ہے 4 گھنٹے کی فلائٹ 5 اسٹار ہوٹل کا کمرہ 200 امریکی ڈالر ڈبل بیڈ مع ناشتہ،2 وقت کا کھانا، چائے،مشروبات تمام دن مفت پانچ دن کیلئے گاڑی بڑی آرام دہ 8 سیٹر مع پیٹرول 150 برطانوی پاؤنڈ روزانہ صرف 750 برطانوی پاؤنڈ کا یہ پیکج لیا جو آن لائن بھی مل سکتا ہے نہ ٹریول ایجنٹ کی جھنجھٹ۔ہر کوئی انٹرنیٹ سے لے سکتا ہے اس کی وجہ ترکی کی حکومت نے سیاحت کو فروغ دینے کیلئے وہاں کی ٹورازم کو یورپ اور امریکہ والوں کو ترغیبی مراعات دے رکھی ہیں تاکہ فارن ایکسچینج کے ہدف کو بڑھایا جا سکے۔ہم جب ڈالامان ائیر پورٹ پہنچے تو رات کے 9 بج رہے تھے۔ائیر پورٹ بہت خوبصورت پہاڑی علاقے میں اگرچہ چھوٹا تھا مگر ہماری گاڑی ائیر پورٹ کے باہر نکلتے ہی مل گئی چند منٹوں میں امیگریشن کاؤنٹر سے فارغ ہو گئے چونکہ ہم نے آن لائن 60 ڈالر کے عوض ترکی ویزے لے رکھے تھا۔کوئی قباحت نہیں ہوئی۔سامان بھی چند منٹوں میں ہمیں مل گیا۔سیدھے ہوٹل پہنچے،ہوٹل بہت ہی خوبصورت ہلٹن کی چین تھا،سینکڑوں ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا جس میں 480 کمرے تھے تمام ریزارٹس کی شکل میں سمندر کے اوپر اور پہاڑوں کے درمیان جدید طرز کے ڈبل بیڈ تھے کافی کشادہ ایک سٹنگ ٹیبل اور صوفہ کم بیڈ بھی تھا ہمارے ساتھ چونکہ میری نواسی اور نواسے بھی تھے لہٰذا ان کیلئے آرام دہ بیڈ میسر تھا۔لندن کے برعکس ڈالامان میں موسم بہت خوشگوار تھا۔رات کھانا ہوٹل میں کھا کر سو گئے۔صبح ناشتے میں بھی تقریباً 100 آئیٹم تھے۔طرح طرح کے پھل پنیر،اولیو اور ڈبل روٹی ناشتے

میں ہی نہیں بلکہ ہر کھانے کے ساتھ ضرور کھاتے ہیں اور طرح طرح کی پنیر، گائے، بکری، بھینس قسم قسم کی کھائی جاتی ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہوئے تو دھوپ نکلی ہوئی تھی لندن میں تو سردی اور بارش کا موسم چل رہا تھا جس سے سب بیزار تھے۔ یہاں دھوپ کیا ملی جنت مل گئی سب مرد و خواتین دھوپ سینکنے لگ گئے۔ یہاں اگر دھوپ نکل آئے تو لوگوں کی عید ہو جاتی ہے جیسے ہمارے ملک میں بارش کو نعمت سمجھا جاتا ہے یورپ، امریکہ، کینیڈا میں صبح سب سے پہلے موسم کی بات ہوتی ہے اگر دھوپ کی پیشن کوئی ہو تو سب بچے، مرد، عورتیں خوش ہو جاتے ہیں اور سمندر کے کناروں پر تو میلے جیسا سماں ہوتا ہے۔ یہاں رہنے والے اگر دھوپ نہ سینکیں تو طرح طرح کی جلدی بیماریاں پیدا ہو جاتیں ہیں۔ ہڈیاں بھی کمزور اور گھٹنوں میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ تمام ڈاکٹر صاحبان اپنے مریضوں کو دھوپ سینکنے کی تاکید کرتے ہیں۔ دوسرا سمندر میں نہانا بھی بہت مفید ہوتا ہے اس سے جلدی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ تقریباً ہر بچہ بڑا، بوڑھا، مرد و عورت سبھی تیراکی جانتے ہیں یہ بھی یہاں کا لازمی حصہ ہے۔ یہاں ہوٹل میں بڑے بڑے 6 قسم کے سوئمنگ پول تھے جو نہانے والوں سے بھرے ہوئے تھے سب ہی اس ریزارٹ پر چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ ہر سوئمنگ پول پر کھانے اور پینے کا انتظام تھا تو سب ہی کھانے پینے اور نہانے میں مشغول تھے چونکہ کرایہ میں تینوں وقت کا کھانا مشروبات، چائے، کافی شامل تھے تو کوئی باہر جا کر کیوں کھائے گا سب ہی اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے دوسرے دن ہم نے جو رینٹ اے کار بک کرائی تھی دوسرے سمندری ساحل کی سیر جس کا نام فتایا تھا جو 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آدھا دن وہاں گزارا۔ جس میں بچوں نے سمندر میں سوئمنگ بھی کی آگے ساحل سمندر کے کنارے شہر Bodrum تھا جو جنت سے کم حسین نہیں تھا۔ اسی طرح پہاڑوں میں گھرے ہوئے سمندر کے کنارے سینکڑوں ریزارٹس، فلیٹس، ہوٹل ہر طرح کے تھے یعنی ایک اسٹار سے لے کر 5 اسٹار کے ہوٹل تھے وہاں بھی بہت اونچائی پر ہوٹل سے سمندر کا نظارہ، لوگ کہتے ہیں کہ اگر ترکی میں

Bodrum کا شہر سمندر کا ساحل نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔ اگر ہم نے ڈالامان میں 5 روزہ ہوٹل کی ڈیل نہ لی ہوتی تو یقیناً ہر روز ہم ایک الگ سمندر اور خوبصورت علاقے کا نظارہ کرتے۔ سب سے عمدہ بات وہی یعنی سورج کی روشنی، نہانے اور گھومنے میں جان ڈال رہی تھی۔ ہم چونکہ رات واپس آجاتے تھے لہٰذا تیسرے دن دوسری سمت والے سمندر کی طرف روانہ ہوئے تو ہم Marmirus شہر جو 125 کلومیٹر دور تھا راستے میں رکتے رکاتے اس سمندر اور پہاڑی علاقے میں پہنچے آپ یوں سمجھیں ہم پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیر کر رہے ہیں۔ ہمارے شمالی علاقہ جات میں پہاڑی علاقوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر جھیلیں اور دریا ہیں مگر ترکی کے ان علاقوں میں پہاڑ اور سمندر واقع ہیں تو ان کا مزہ موسم پر منحصر ہوتا ہے چوتھے دن ہم پھر اپنے ہی ہوٹل میں سمندر اور پہاڑوں کی سیر کرتے رہے۔ بچے اور ہم سب کافی سفر کر کے انجوائے کرنے کے ساتھ ساتھ تھک بھی گئے تھے تو ہوٹل میں بہت آرام سے رہے یہاں بھی دھوپ مزہ دے رہی تھی۔ اب میں کچھ باتیں ترکی کی عوام کی بتاتا چلوں یہ بہت ہنس مکھ، ملنسار اور پاکستانیوں سے واقعی محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ ہوٹل اور باہر کے ریسٹورینٹس میں وہ دیگر ممالک کی طرح کھانے کے بلوں میں ڈنڈی ضرور مارتے ہیں ڈالرز، پاؤنڈ یعنی کرنسی تبدیلی میں بھی 5 سے 10 فیصد تک کم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ خریداری میں آپ بارگین 50 فیصد تک دکانداروں سے کر سکتے ہیں۔ دو نمبر مالوں کی بھی بھرمار ہے جو بہت اصل نظر آتا ہے مگر وہ اصل کر کے نہیں بیچتے البتہ زیادہ دام ضرور بتاتے ہیں یا پھر آپ بڑے بڑے سٹورز، ڈیپارٹمنٹل چین میں جائیں وہاں دام بھی مناسب اور اصل مال ملے گا۔ بینک سے کرنسی تبدیل کرائیں۔ ریسٹورنٹس میں پہلے مینو ضرور منگوائیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ عام طور پر چونکہ ترک عوام گوشت خور، باربی کیو کے دلدادہ ہیں لیکن لبنانی، مصری اور عربوں کی طرح پھیکے کباب، بوٹیاں، شوربا کھاتے ہیں تو آپ کو بھی اپنے ساتھ لال مرچ کی ٹباسکو بوتل ضرور رکھیں ورنہ ہر کھانے میں نمک، مرچ نہ ہو تو ہم سے کھانا حلق سے نہیں اترتا۔ دوسری بات ہر

بن میں کباب رکھ کر پیاز اور ٹماٹر سلاد سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا اس کو باور کرا دیں پلیٹ میں سلاد، روٹی، فرنچ فرائز جو مفت ہوتی ہیں۔ کباب کی 2 ہی سیخ ڈلوائیں۔ سب سے اذیت ناک پہلو جو ترکی میں پایا جاتا ہے وہ تمام ہوٹل اچھے اور برے ریسٹورینٹس میں حرام گوشت ساتھ ہی رکھا ہوتا ہے۔ اگر چہ وہ سیاحت کو بڑھانے اور یورپی یونین کی ڈیمانڈ ہے چونکہ ترکی میں غیر ملکی غیر مسلم سیاح بھی ہوتے ہیں اور وہ سور کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں تو لازماً انہیں رکھنا پڑتا ہے۔ شراب کو بالکل برا نہیں مانتے خود بھی بہت پیتے ہیں انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں صرف ترکی کی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ مہنگائی بھی یورپی یونین والوں نے اتنی بڑھا دی ہے کہ 1 ڈالر میں صرف 2 لیرا اور 10 سینٹ آتے ہیں مگر دکاندار 2 لیرا دینے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح وہ یورو جو ترکی کی کرنسی کے بعد سب سے زیادہ چلتا ہے اس میں بھی ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتے۔ جبکہ یورپی یونین ممالک میں ایسا نہیں ہوتا اور نہ ہی یورپ میں اس قسم کی ہیرا پھیری ہوتی ہے۔ پولیس کی ملی بھگت سے وہ ہر چیز کا 2 نمبر تو بنا چکے ہیں اور ہر جگہ بیٹھے مل جاتے ہیں۔ اس 4 سو کلومیٹر کے شہر میں حکومت نے بجلی کا متبادل نظام سولر سسٹم بھی متعارف کرایا ہوا ہے جو ہر بلڈنگ کے اوپر نصب ہے۔ لاکھوں گھروں، مکانوں اور فلیٹوں میں یہ سسٹم رائج ہے۔ اگر ہماری حکومت چاہے تو ترکی کی طرح سولر سسٹم متعارف کروا کر بجلی کی 75 فیصد بچت کر سکتی ہے۔ اس کیلئے سستے اور ڈیوٹی فری سولر کی امپورٹ کی اجازت دے۔ ہمارے بلڈر صاحبان خود بھی سستی بجلی پیدا کر سکتے ہیں۔ ترکی میں لائن سے بڑی بڑی فلیٹوں کی عمارتوں پر یہ نظام بہت کامیاب ہے۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اپنے ماہرین بھیج کر ان بڑے بڑے شہروں کا بجلی کے سولر سسٹم سے فائدہ اٹھا کر عوام کو کم از کم بجلی کے عذاب سے چھٹکارہ دلا سکتے ہیں کیونکہ پاکستان میں سورج ترکی سے زیادہ روشنی دے رہا ہے۔ 5 دن کی چھٹیاں گزار کر واپس لندن لوٹ آئے تو ترکی پاکستان کے علاوہ سیر و تفریح کیلئے آج کل سب سے بہتر چھٹیاں گزارنے کی جگہ ہے۔

کینیڈا کی پتھریلی پہاڑیوں کا سفر

1973ء سے امریکہ اور کینیڈا آتا جاتا رہتا ہوں اور دونوں پڑوسی ممالک کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھتا ہوں۔ اس زمانے میں امریکہ آنے کے لئے ویزے کی ضرورت ہوتی تھی جو بے حد آسانی سے ہم پاکستانیوں کو مل جاتا تھا۔ بعد میں تو امریکہ نے ہمارے لئے بکس ویزہ متعارف کروایا یعنی نہ لائن لگانے کی ضرورت تھی اور نہ خود ویزے کے لئے آنا پڑتا تھا۔ آپ کو اگر ایک مرتبہ ویزہ 5 سال کے لئے مل جاتا تھا تو پھر آپ صرف اپنے اور فیملی کے پاسپورٹ امریکن ایمبیسی کے باہر رکھے ہوئے بڑے صندوق میں ڈال جائیں تو چند دن بعد آپ یا کوئی بھی ٹریول ایجنٹس جا کر ایمبیسی سے وصول کر لیتا تھا۔ اور آپ جب فیملی کے ساتھ امریکہ کے کسی بھی ائرپورٹ پر پہنچتے تھے تو وہ صرف یہ پوچھتا تھا کہ آپ کیوں آئے ہیں امریکہ میں، اگر آپ کہتے ہیں کہ ہم سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں۔ تو وہ دوسرا سوال کرتا تھا کہ آپ کے پاس کتنی رقم ہے۔ یا آپ اپنے رشتہ دار سے ملنے آئے ہیں۔ وہ بھی کافی تھا وہ پاسپورٹ پر مہر لگا کر کہتا تھا ویلکم ٹو امریکہ یعنی خوش آمدید امریکہ میں۔ پھر آہستہ آہستہ سوالات بڑھتے گئے ویزوں پر ہلکی ہلکی پابندیاں لگتی گئیں۔ مگر کینیڈا میں آنے کیلئے اُن دنوں کوئی ویزہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ کو آن آرائیول یعنی ائرپورٹ پر بھی ہم پاکستانیوں کو نہ صرف ویزہ مل جاتا تھا بلکہ ایمگریشن والے پوچھتے تھے کہ آپ کیا

مستقل کینیڈا کے شہری بنا چاہتے ہیں،تو یہ رہائشی فارم بھر دیں پھر وہ چند سالوں بعد آپ کو کینیڈا کا پاسپورٹ بھی دے دیتے تھے۔پھر دنیا بھر کی طرح کینیڈا نے بھی آہستہ آہستہ پاکستان سے کینیڈا آنے والے لوگوں پر ویزے کی پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔پھر وہ پابندیاں بڑھتی گئیں مگر دیگر ممالک کی طرح نہیں کیونکہ کینیڈا رقبے کے لحاظ سے بہت ہی بڑا ملک ہے،یعنی اس کے ملک میں 8 آٹھ گھنٹوں کی فلائٹ چلتی ہیں۔اور مقامی وقت میں بھی 3 گھنٹوں کا فرق پڑتا ہے۔مگر آبادی صرف 36ملین ہے یعنی کراچی کی آبادی کا ڈیڑھ گنا ہے۔اس ملک میں کسی بھی قوم،مذہب،رنگ نسل کی ترجیحات نہیں ہیں۔یکم جولائی 2017ء کو پوری قوم 150 سالہ آزادی منا رہی ہے۔اس کے 10 صوبے ہیں۔اور 3Terrotries یعنی چھوٹے صوبے ہیں۔ہم 200ملین آبادی والے ملک میں صرف 4صوبے اور ایک دارالخلافہ رکھتے ہیں۔میں اکثر قارئین کو اپنے سفروں سے بھی آگاہ کرتا رہتا ہوں۔یعنی میں کینیڈا کے چند شہروں کی معلومات فراہم کرتا رہتا ہوں اس مرتبہ میں کینیڈا کے خوبصورت ترین شہر وینکوور (Vancouver) کی سیر وتفریح سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔کو کہ اس کی آبادی 40لاکھ سے بھی کم ہے مگر اس کا موسم بہت ہی معتدل ہے۔دیگر علاقے کینیڈا میں منفی 50 سینٹی گریڈ تک چلے جاتے ہیں۔مگر یہاں نہ گرمی زیادہ پڑتی ہے نہ سردی۔وینکوور (Vancouver) صوبہ برٹش کولمبیا کہلاتا ہے۔یہاں کی پہاڑیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔اس میں جھیلیں،دریا،سمندر تمام رعنائیاں نظر آتی ہیں۔بہت بڑی بڑی شاہراہیں (Highways) ہیں۔خوبصورت پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنائے گئے ہیں۔ان پہاڑوں کو آنے والے ٹورسٹ کے لئے ایک عجیب ریلوے لائن پہاڑوں ،دریاؤں،جھیلوں سے نکال کر دنیا کا ایک عجوبہ کارنامہ انجام دیا۔اس ٹرین کا نام پتھریلی پہاڑی سلسلہ یعنی (Rocky Mountaineer) ہے۔1960ء میں کینیڈا کی سب سے لمبی ٹرین 41بوگیاں لگا کر چلائی گئی۔اور آج تک وہی ٹرین وینکوور سے 2 دن کے بعد کیم لوپس ایک رات رُکتی ہے اور

دوسرے دن Banff شہر تک پہنچتی ہے،تیسری دن جیسپر جاتی ہے پھر آگے گلیشیر کی طرف جاتی ہے اور آپ 4 پانچ یا 6 دن تک ان پہاڑوں کی سیر کر سکتے ہیں۔میں نے ایسی خوبصورت ٹرین جرنی نہیں دیکھی جو ایک ہفتے میں ایسے ایسے پہاڑوں،جھیلوں،دریاؤں،سمندروں لمبے لمبے پلوں،سرنگوں سے گزار کر دنیا بھر کے ٹورسٹوں کو کینیڈا کی سیر کرواتی ہے۔واقعی دنیا کے عجائبات میں سے ایک تھی جسے ہم دونوں میاں بیوی کو ہمارے امریکہ کے دوست کرنل نواز پیرزادہ اور اُن کی بیگم نے اس علاقے کو متعارف کروایا۔دونوں فیملیاں ان علاقوں سے بہت محظوظ ہوئیں،حالانکہ 10 پندرہ سال سے تو ہم ہر سال آتے جاتے رہتے تھے مگر ہم ٹورنٹو کی سیاحت تک محدود رہے۔انہی علاقوں کے باغات،جھیلیں اور دریاؤں سے انجوائے کرتے رہے۔سب سے بڑی بات اس ٹرین کے اسٹاف کی تھی جو خدمت کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے یعنی صبح 8 بجے جب آپ وینکوور میں ان کے (Rocky Mountaineer) سٹیشن پہنچیں گے۔تو ان کا اسٹاف آپ کی گاڑی سے ہی آپ کو اور آپ کے سامان کو اُٹھا کر سٹیشن کے اندر لائے گا آپ کے ٹکٹ کو بنوا کر آپ کی بوگی میں آپ کو ڑانسفر کرے گا۔پھر صبح صبح ناشتہ جو ٹرین کے نیچے والے حصے میں ٹیبل لگی ہوئیں ہیں اُس میں لا کر کھلائیں گا۔آپ کے مینو کارڈ کے مطابق ڈیڑھ گھنٹے تک آپ جو بھی پھل،سلاد،انڈے،پنیر،ٹوسٹ وغیرہ منگواتے جائینگے وہی وہ لاتے جائیں گے۔پھر 12 بجے سے 2 بجے تک لنچ کا وقت ہوتا ہے۔مینو کارڈ میں مچھلی،جھینگے مرغی گائے کا گوشت (یہ حلال نہیں ہوتا) تو آپ مچھلی،جھینگے،انڈے سبزی وغیرہ کھا سکتے ہیں۔پھر 6 بجے یہ ٹرین کیم کورٹ پہنچتی ہے۔تو آپ کا سامان آپ کے ہوٹل پہنچنے سے پہلے آپ کے کمرے میں پہنچ جاتا ہے۔پھر دوسرے دن صبح ساڑھے 6 بجے آپ کو ہوٹل سے لے کر پھر ٹرین میں بٹھا دیا جاتا ہے پھر خدمت شروع ہو جاتی ہے اس طرح شام کو نئے شہر (Banff) پہاڑی علاقے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔پھر سارے دن ٹرین چلتی رہتی ہے۔اور پھر شام کو نئے شہر میں آپ کو ہوٹل میں

اتار دیا جاتا ہے۔اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ نے کتنے دن کا پیکیج لیا ہے۔وہ 10 پندرہ دن تک آپ کو اس ٹرین کی سیر کرا سکتے ہیں آپ یقین کریں ان کی خدمات کو آپ کسی اور ملک کے جہازوں کے کروزیا ورکر سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔وہ آپ کو کھلا کھلا کر اور خدمت کر کر کے 8 گھنٹوں کے سفر کو محسوس نہیں ہونے دیتے۔اس کا کرایہ عام ٹرینوں سے زیادہ ہے مگر انجوائے منٹ کا جواب نہیں ہے۔اس ٹرین میں 2 کلاسیں ہوتی ہے یعنی اول درجے کی جگہ کو گولڈ لیف اور لوئر درجے کو سلور کہا جاتا ہے۔گولڈ لیف کی بوگی شیشہ سے بنی ہوتی ہے۔آپ کھلا آسمان اور چاروں طرف دیکھ سکتے ہے یہ ٹرین اپریل سے اگست تک چلتی ہے۔تمام راستے آپ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔زندگی میں ایک مرتبہ ضرور اس ٹرین میں سفر کر کے دیکھیں آپ مایوس ہرگز نہیں ہونگے۔

دنیا کا امیر ترین صدر؟

قارئین 3 سال قبل میں نے لاطینی امریکہ کے ایک ملک یوروگوئے کے صدر جوزے موزیکا (Joze Mojica) جن کی عمر 80 سال تھی۔وہ 2010 سے 2015 تک صدر کے عہدے پر رہے۔ان کے ملک کے قانون کے مطابق صدر صرف ایک مرتبہ 5 سال تک صدارت کی کرسی پر رہ سکتا ہے۔چند خصوصیات لکھی تھیں مثلاً وہ صدر بننے کے بعد بھی صدارتی محل میں نہیں رہے۔اپنے پرانے 5 ایکڑز کے فارم پر ہی پورے 5 سال انتہائی سادگی کے ساتھ گزارے۔کوئی صدارتی مراعات نہیں لیں،اُس ایگری کلچرل فارم پر چونکہ وہ،ان کی بیگم جن سے انہوں نے 2005 میں شادی کی تھی دونوں ہی ایگری کلچرل فارمر تھے۔اُس 3 کمروں کے فارم پر وہ اور ان کی بیگم اور ایک معذور کتا جو 3 ٹانگوں سے چلتا تھا اور اُن کی ایک پرانی گاڑی (Bentley) جسے وہ خود ڈرائیو کرتے تھے یہ تھا اُن کا کل سرمایہ۔اس سے آگے سنیئے اُن کی سالانہ صدارتی تنخواہ تقریباً 14000 ڈالرز تھی۔اُس کو بھی 90 فیصد وہ خیراتی اداروں کو دے دیتے تھے۔ان کی بیگم ٹیچر بھی تھی،پڑھائی کے عوض ان کو تقریباً 12000 ڈالرز تنخواہ ملتی تھی وہ بھی 90 فیصد چیریٹی کرتی تھیں۔شام کو دونوں میاں بیوی اور ان کا کتا عام شہریوں کی طرح

بازار میں چہل قدمی کرتے دیکھے جاتے تھے۔ان کو دیکھ کر اُن کی عوام خوش ہو کر تالیاں بجا کر اُن کو خراج تحسین پیش کرتی تھی ۔ان کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی ان کو دنیا کا غریب ترین صدر سمجھا جاتا تھا۔نوجوانی میں سیاست میں آنے کے بعد ان کے ملک میں فوجی انقلاب بھی آیا اُس کی مخالفت میں وہ کافی عرصہ جیل بھی 2بار گئے ۔جمہوریت کی بحالی میں نمایاں کردار ادا کیا۔2مرتبہ عوام نے ان کو سینیٹر بھی چُنا۔ صدارت سے پہلے وہ ایگری کلچر اور لائیو اسٹاک کے وزیر بھی رہے۔ان کی حکومت نے اس سادگی کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے اُن کا نام نوبل پرائز کے لئے بھی پروپوز کیا تھا۔جب وہ صدارتی مدت پوری کر چکے تو بعد میں انہوں نے شہری فارم ہاؤس فروخت کر کے شہر کے مضافات میں اُس سے بھی چھوٹا فارم ہاؤس خرید کر رہائش منتقل کر لی ۔اُن کی حفاظت کے لئے 2پولیس والے اُن کے ویران علاقے میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔اُس سے BBC کے ایک نمائندے نے انٹرویو کے آخر میں پوچھا۔ آپ دنیا کے بہترین سادگی پسند غریب ترین صدر سمجھے جاتے ہیں۔آپ اس پر تبصرہ کریں۔انہوں نے اُس نمائندے کو کیا جواب دیا، ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے انہوں نے کہا کہ میں کیسے غریب ترین صدر ہو سکتا ہوں ۔میں امیر ترین صدر تھا میں اپنی 10فیصد تک تنخواہ پوری نہیں خرچ کر سکا۔غریب وہ ہوتا ہے جسے اور پھر اور پھر اور دولت جمع کرنے کی ہوس ہوتی ہے۔جو کبھی پوری نہیں نہیں ہوتی اور اپنی اس دولت کا انبار بغیر تصرف میں لائے چھوڑ کر دنیا سے چلا جاتا ہے، ہائے بیچارہ، یہ کہہ کر انہوں نے وہی اپنی پرانی گاڑی نکالی ،بیگم کو بٹھایا کتا پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا اور گھومنے کے لئے شہر کے طرف روانہ ہو گئے ۔BBC کا نمائندہ حسرت اور احترام سے ان کے جملے میں کھو گیا ۔ایک دوسری مثال بہت ہی تازہ ،پچھلے ہفتے کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو نے بلجیم کے وزیر اعظم جو آفیشل دورے پر آئے تھے ایک ریسٹورنٹ میں ان کو لنچ کرایا صرف ایک آئٹم کھانے میں سوپ کے ساتھ اور گرمی کی وجہ سے آئس کریم دونوں کے آگے کھانے والی میز پر دیکھی گئی ۔پچھلے دنوں امریکہ کے سابق

صدر اُوباما نے بھارتی صدر کورات کے کھانے میں صرف ایک ویجیٹیرین تھالی پیش کی۔خود امریکہ کے صدر صدارتی محل چھوڑنے سے پہلے آخری لنچ میں اپنے اسٹاف کو خود سرو کرتے ہیں۔آج بھی وہ اپنے گھر کی گروسری خریدتے شگاگو میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دیکھے گئے اور بھی بہت سے امیر ترین ممالک کے سربراہان کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔UK کے آخری سبکدوش ہونے والے وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ کی رہائش گاہ سے اپنا سامان خود ٹرک میں لاد کر لے جاتے دیکھے گئے تھے۔میں عمرے کے لئے مکہ میں تھا کسی نے مجھے واٹس اپ پر ہمارے وزیر اعظم جو حال ہی میں عمرے کے لئے معہ اپنے دوستوں ،وزیروں ،رشتہ داروں کے ہمراہ مسجد نبوی میں پولیس اور فوج کے جوانوں کے جھرمٹ میں داخل ہوئے تو بہت سے دل جلے بھی عبادت کر رہے تھے ۔لوگوں نے اُن کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا۔پیچھے سے جو جملہ کہا وہ لکھنے سے قاصر ہوں پھر اُس سے ملتے جلتے جملوں کی تکرار بھی با آواز بلند سننے میں آئی ۔آخر میں واٹس اپ بھیجنے والے نے لکھا کہ سرکاری خرچ پر ہونے والے ان کے عمروں کا عوام کو ثواب ملے گا کیا؟ ایسے ملتے جلتے ایک واٹس اپ پر ہمارے سابق صدر امریکہ کے ایک بہت مہنگے ہسپتال سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بہت قیمتی سوٹ میں بہت ہی قیمتی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے ۔ایک پاکستانی نوجوان نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور با آواز بلند کہا کہ زرداری صاحب ہر طرف پاکستان میں بم پھٹ رہے ہیں،عوام مر رہے ہیں اور آپ یہاں عیاشی کر رہے ہیں جواب دیں وہ جواب کیا دیتے اُن کے ساتھیوں نے جلدی گاڑی کا دروازہ کھولا اُن کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر روانہ کر دیا۔اور یہ بھی سننے میں آیا کہ کہا کہ یار دیکھنا اُس کی ویڈیو تو نہیں بنی ۔آج کل میڈیا بہت ترقی کر چکا ہے۔عوام بھی بیزار ہوتے جا رہے ہیں ۔آپ نے بھی مولانا فضل الرحمان جو اپنے چند ساتھی صحت مند افراد کے ساتھ لندن کے ایک ریسٹورنٹ سے نکلے تو چند منچلے پاکستانی نوجوانوں نے ان کو گھیرنے کی کوشش کی تو وہ بھی تیزی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے لگے تو آوازیں ڈیزل

،ڈیزل کی کونجتی رہیں۔خود ہمارے خادم اعلیٰ لندن میں بغیر پروٹوکول ایک ٹیکسی کو روکنے کے لئے آگے بڑھے ان کے ساتھ بھی عوام جو بس اسٹینڈ پر بس کا انتظار کر رہے تھے بھڑک اُٹھے۔وہ وہ جملے ان کے لئے کہے گئے بس کیا لکھوں یہ دل جلوں کے دلوں کی آواز تھیں۔وہ ان آزاد ملکوں میں اپنے لیڈروں کو اگر غلط کام کرتے دیکھیں تو نہیں چھوڑتے کیونکہ اُن کے ٹیکس سے حکومتیں چلتی ہیں۔خوسوچیں یہ مقروض ترین ملک جس کا بال بال گروی رکھ کر ہمارے حکمران عیش کی زندگیاں گزار رہے ہیں بھلا ہمارے صدر ممنون حسین کے صدارتی محل کا خرچہ 75 کروڑ روپیہ اور وزیراعظم کا 124 کروڑ روپیہ،خادم اعلیٰ کے لئے 3 ارب کا جیٹ طیارہ اُس پر بھی یہ نعرہ کہ شریف خاندان پر آج تک کوئی کرپشن ثابت نہیں کر سکا۔سپریم کورٹ، جے آئی ٹی دونوں وقت ضائع کر رہی ہیں۔روزانہ صبح 8 بجے اٹھ کر ایک نئی کہانی قوم کو سننے کو ملتی ہیں۔حزب اختلاف،حزب اقتدار کو کرپٹ حکومت کا لقب دیتے ہیں اور حزب اقتدار کہتے ہے کہ پی پی پی ملک کو لوٹ کر کھا گئی۔سارا کا سارا شہر خالی ہو گیا،قاضی بیچارہ ثبوت کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔کس کس کی مثالیں لکھوں یہ ہمارے حکمران گزشتہ 40 سال سے قوم کا پیسہ لوٹ کر کھا چکے ہیں۔آج تک درجنوں اداروں کی موجودگی میں ایک کو بھی سزا نہیں ہو سکی۔

ہائے رے بے چاری پاکستانی قوم!

ایک ہفتہ آذربائیجان کی سیر

پاکستان میں گزشتہ کئی ماہ سے چھٹیوں کی یلغار ہے پہلے عید کی چھٹیاں ہوئیں پھر الیکشن میں یار لوگ لگ گئے۔الیکشن سے نجات ملی تو محرم کی چھٹیاں ہو گئیں۔گزشتہ ایک سال سے سیر و تفریح کے لئے آذربائیجان کے شہر باکو کا نام سامنے آرہا تھا۔بتایا جارہا تھا کہ بہت خوبصورت شہر،خوبصورت مرد و خواتین،سستا اور رنگ برنگا ملک،بہترین تفریح گاہیں،آبشار اور باغات کی بھرمار کا ذکر دوستوں سے سُنا تھا جو باکو کئی بار گھوم آئے تھے۔سوچا کہ فیملی کے ساتھ گھوم لیا جائے اور ایک نئے ملک کی سیر بھی ہو جائے گی اور پاکستانی عوام کو بھی اس ملک کا تعارف کروا دیا جائے گا۔کراچی سے تو براہ راست کوئی فلائٹ نہیں جاتی البتہ اس کے لئے دوبئی سے ٹرانزٹ فلائٹ لی۔تقریباً 4 گھنٹے کی پرواز سے آذربائیجان کے دارالخلافہ باکو کے حیدر علی ائرپورٹ پہنچے۔بہت خوبصورت ڈیزائن سے بھرپور ہمارے کراچی ائرپورٹ کے برابر تھا۔آذربائیجان کے لئے پاکستانی بہ آسانی ویزہ لے سکتے ہیں۔وہ آن لائن 40 ڈالر فی کس فیس ادا کر کے لیا جا سکتا ہے۔یہ ٹریول ایجنٹس حضرات کی معرفت حاصل کر کے جانا ضروری ہے۔البتہ جن پاکستانی پاسپورٹ پر دوبئی،یو اے ای،سعودی اقامہ لگا ہوان کو باکو پہنچنے پر

آن آرائیول ویزہ مل جاتا ہے۔مگر اُس میں لائن میں گھنٹے بھر کاروائی میں لگ جاتے ہیں۔بہتر یہی ہے کہ ایڈوانس آن لائن ویزہ الیکٹرونک لے کر جانا ہی بہتر ہے۔ائرپورٹ کے ایمگریشن کاؤنٹر پر خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ہمارے پاس آن لائن ویزے تھے اُس کے لئے الگ کاؤنٹر تھا چند منٹوں میں فارغ ہوکر گرین چینل سے باکو شہر میں ائرپورٹ سے باہر آئے۔میرے صاحبزادے خرم خلیل اور جنید خلیل نے دو الگ الگ رینٹ اے کار بک کروائی تھیں وہ باہر نکلتے ہی مل گئیں۔ہمارا ہوٹل اندرون شہر سے چند میل کے فاصلے پر تھا خوبصورت اپارٹمنٹ ہوٹل جس میں 4 کمرے تھے ٹی وی لاؤنج،کچن،فریج کٹلری کھانے پکانے کی بہترین سب دھلے دھلائے رکھے تھے۔بہت خوبصورت ہوٹل کے واک وے درختوں،باغات سے بھرے تھے۔پورے اپارٹمنٹ کا کرایہ 225 ڈالر یومیہ تھا وہ بھی آن لائن بکنگ کروائی تھی۔ائرپورٹ سے تقریباً 40 منٹ میں ہوٹل پہنچ گئے۔راستے میں ہم ڈاؤن ٹاؤن (اندرون شہر) سے گزرے۔خوبصورت ہوٹلوں کی بھرمار،شاپنگ مال،سپر مارکیٹس،اور لاتعداد ریسٹورنٹس تھے۔جن میں عربی،ترکی،لبنانی کھانوں کی بھرمار تھی۔باربی کیو اور تندوری روٹیاں،پنیر، زیتون لازمی ڈشز تھیں۔سیاحوں کے لئے پرکشش مساج پارلر اور کیبرے ڈانسنگ ہال جگہ جگہ کھلے ہوئے ہیں۔جو رات رات بھر کھلے ہوتے ہیں۔98فیصد پڑھے لکھے آذربائیجان کے عوام مسلمان ہیں۔زیادہ آبادی کا تعلق اہل تشیع سے ہے۔محرم کے دن تھے مگر سڑکوں پر کوئی ماتم نہیں دیکھا۔صرف ان کی مساجد میں اندر ہی ماتم ہوتا ہے۔بہت مہذب اور مہمانوں سے خوش دلی سے پیش آتے ہیں۔ مگر انگریزی میں بہت کمزور ہیں۔آذربائیجان کی زبان آذری اور ترکی ملی جلی زبان بولتے ہیں۔ پاکستانیوں سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔کل ایک کروڑ کی آبادی ہے جس کے 59 صوبے ہے۔رشیاء (USSR) سے آزاد ہوئے ہیں مگر روس کو پسند نہیں کرتے انہوں نے بہت ظلم کیا تھا۔جنگیں بھی لڑیں،قدرتی گیس اور پیٹرول سے یہ ملک مالا مال ہے۔خود شہر کی سڑکوں کے ساتھ ساتھ پیٹرول

نکالنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔جیسے ہمارے گاؤں میں کنویں سے پانی نکالنے کی پمپ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی پمپ جگہ جگہ آپ کو لگے ہوئے ملتے ہیں۔جو سب کے سب سرکاری ملکیت ہیں۔عوام کی اکثریت شام کو سیر و تفریح کے لئے باہر نکلتی ہے۔ہر علاقے میں تفریحی باغات ہیں۔بچوں کے لئے جھولے اور دوسری چیزیں مفت موجود ہیں۔خوبصورت نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آزادانہ گھومتی پھرتی ہیں۔پردے کا کوئی رواج نہیں ہے مذہبی جنون بھی نہیں دیکھا۔بہت کم مساجد دیکھنے کو ملیں۔البتہ ایک بہت بڑی تاریخی مسجد بی بی حیبات دیکھنے کو ملی مگر اکثر سر راہ گزرتے ہوئے دیکھا بہت کم ہی لوگ آتے جاتے نظر آئے۔البتہ صرف 10 محرم کو اُس مسجد کے باہر لاتعداد گاڑیوں کی قطاریں نظر آئیں۔باکو شہر کی خوبصورتی میں ساحل سمندر بھی تفریحی جگہیں،کشتی رانی،فشنگ لانچیں ٹورسٹ کے لئے اٹریکشن ہیں۔لاتعداد پاکستانی فیملیاں بھی ملیں ہمارے جہاز میں 90 فیصد پاکستانی فیملیاں تھیں۔جو تفریح کے لئے باکو شہر کو آرہی تھیں۔یہاں کے سکہ کا نام منات (Manat) جو 100 ڈالر میں 175 منات ملتے ہیں لوگ بتاتے ہیں کہ 2 سال پہلے تک تمام اشیاء بہت سستی تھیں مگر اب سیاحوں کی آمد و رفت کی وجہ سے مہنگائی بہت بڑھ چکی ہے۔جو ہوٹل 75 ڈالر کا ملتا تھا اب 150 سے 200 ڈالر فی کمرہ ہوگیا ہے۔نوجوان طبقہ تو سیاحت کم اور کیسینوں،مساج پارلرز اور ڈانسنگ کلبوں میں جاکر ساری ساری رات انجوائے کرتے ہیں۔مسلمان ملک ہے مگر روس کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ شراب خانے،مساج پارلرز کی کثرت ہے۔باکو شہر کے چاروں طرف سمندر اور پہاڑیاں کثرت سے ہیں۔رات کو پورا شہر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ہوٹلوں سے بھی نظارہ کیا جاسکتا ہے۔اندرون شہر میں تو پوری گلیاں کھانے پینے اور شاپنگ کی دوکانوں سے بھری پڑی ہیں۔جگہ جگہ پیدل چلنے والوں کے لئے وقف ہیں۔ گاڑیوں کو باہر پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرکے ہی آپ ان بازاروں میں جاسکتے ہیں۔ایک پہاڑی پر گئے وہاں خوبصورت پارک کے ساتھ ایک قطار میں آگ لگی ہوئی تھی جس کی وجہ اندر اُس کے پیٹرول

اور گیس کا ذخیرہ بتایا جاتا ہے۔اُس پر جانے کے لئے ایک ڈالر کا ٹکٹ تھا۔حضرت آدم کے زمانے سے ہی یہاں قدرتی طور پر آگ لگی رہتی ہے حتی کہ بارش اور برف باری میں بھی اسی طرح لگی رہتی ہے ۔سرد موسم تھا تو آگ کی گرمائش بھلی لگی ۔اور بہت سی فیملیاں اس آگ کا مزے لے رہی تھیں ۔اور چند تو اردگرد چٹایاں بچھا کر کھانے اور گپیں لگانے میں مصروف تھیں ۔باکو سے تقریباً 300 کلومیٹر ہائی وے سے ہم ایک تاریخی شہر گنا لا تقریباً 5 گھنٹوں کی مسافت طے کر کے پہنچے ۔یہاں ایک تاریخی آبشار ہے جس کو دیکھنے دُور دور سے لوگ آتے ہیں ۔ایک گاؤں کے اندر کچے راستے سے پہنچے تو تقریباً 500 سیڑھیاں جو بہت دشوار گزار راستے سے چڑھے ۔بہت خطرناک سیڑھیاں تھیں ۔لہذا مزید اوپر جانے کی ہمت نہیں تھی آبشار کا پانی اُس پہاڑی سے نیچے تیزی سے آرہا تھا۔رات بھی ہو چکی تھی بجلی کا بھی خاص انتظام نہیں تھا۔صرف ایک آدھ بلب روشن تھا۔آدھے راستے سے واپس آنے میں غنیمت جانی اور واپسی کا راستہ لیا تو رات کی وجہ سے صرف تین گھنٹوں میں واپس باکو پہنچ گئے ۔خصوصی بات اس ڈھائی 300 کلومیٹر ہائی وے پر چند ایک چھوٹے چھوٹے ہی شہر نظر آئے ۔ٹریفک بھی بہت معمولی تھی گاڑیوں کی 90 کلومیٹر فی گھنٹہ لمٹ تھی اور ہر پانچ کلومیٹر کے بعد ٹریفک چیک کرنے کے لئے ریڈار لگے ہوئے تھے ۔جو سولر پینل سے کام کر رہے تھے اور کئی جگہ ہم کو پولیس کی گاڑیاں بھی چیکنگ کرتے ملیں کم رفتاری کی وجہ سے ہائی وے پر حادثات نہیں دیکھے اور نہ کسی کو تیز چلاتے دیکھا۔ایک ہفتہ آذربائیجان گھومنے پھرنے کے بعد ہم خوشگوار یادیں لے کر واپس پاکستان آئے تو دوبارہ بھی جانے کی تمنا ہے۔کاش ہمارے ملک میں بھی ایسے خوش مزاج عوام بستے تو ہم باہر کیوں جانے کی تمنا کرتے ۔ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ملک کا شمار بھی تفریحی ممالک میں ہوتا تھا۔کاش کوئی اس ہمارے گہن لگے ملک میں دوبارہ جگمگاتا پاکستان واپس لائے ۔جاتے جاتے بتاتا چلوں کہ یہاں کے حکمران حیدر علی (مرحوم) کی قیادت سے اتنے خوش ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد اب اُن کے صاحبزادے

آذربائیجان کی قیادت کر رہے ہیں ۔کوئی کرپشن نہیں ہے کوئی مذہبی فسادات نہیں ہیں ۔یہ ملک کسی کا مقروض نہیں ہے اس کی برآمدات درآمدات سے دُگنی تگنی ہیں ۔غربت نہیں ہے فی کس آمدنی 9 ہزار ڈالر ہے۔شہر میں ایک تنکا بھی سڑک پر نظر نہیں آئے گا۔کب یہ شہر کو صاف کرتے ہیں یہ بھی نظر نہیں آیا۔ ہر چیز لاجواب ہے جس کے لئے ایک کالم کافی نہیں ہے ۔اس میں حیدر علی سنٹر، آذربائیجان کارپٹ میوزیم، باکو ٹی وی ٹاور ، بی بی حبات مسجد، نظامی میوزیم آف آذربائیجانی لٹریچر، نیشنل آبشار پارک اور نیشنل آرٹ میوزیم نہایت ہی قابل دید اور دیکھنے کے قابل ہیں ۔

صومالی لینڈ سے تجارت کریں

2007 میں ہمارے ایک کاروباری دوست نے جو صومالی لینڈ کے باشندے تھے اور دبئی میں بھی کاروبار کرتے تھے، ہم کو صومالی لینڈ آنے کی دعوت دی دراصل وہ صومالی لینڈ اور پاکستان کے درمیان اپنا کاروبار بڑھانا چاہتے تھے اور پاکستان میں صومالی لینڈ کیلئے اعزازی قونصل جنرل کی تلاش تھی۔ اس وجہ سے میں نے اپنے صاحبزادے سلمان خلیل کو بھی ساتھ سفر میں شامل کیا۔ ان دنوں صومالی لینڈ کیلئے دبئی سے بہت چھوٹے جہاز براستہ ادیس ابابا، جبوتی سے ہو کر صومالی لینڈ کے دارالخلافہ ہرگیسا (HERGEISA) تقریباً 5 گھنٹوں میں پہنچتا تھا اگر چہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مگر دو اسٹاپس کی وجہ سے اتنا وقت لگتا تھا صومالی لینڈ آج سے 27 سال قبل صومالیہ کو تقسیم کر کے 2 حصوں میں 10 بارہ سال کی آپس کی جنگوں کی وجہ سے صومالیہ اور صومالی لینڈ میں بٹ گیا تھا۔ اس وقت صومالی لینڈ کے حصہ میں 90 فیصد پہاڑی علاقہ ریگستان اور ایک سمندر بار بر اپورٹ آیا تھا۔ بارشوں سے جنگلوں، کھیتی باڑی، اونٹ بھیڑ بکریاں، گائے وغیرہ سے معیشت کا کل دارومدار تھا۔ غربت زیادہ تھی جنگوں سے آپس کے قبائل میں بہت مرد مارے گئے تھے لاتعداد بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں دونوں طرف کے قبائلی سرداروں نے از خود اس مسئلہ کو حل کر کے امن قائم کیا۔ صومالیہ تو خود کفیل تھا مگر صومالی لینڈ کو کچھ مسلمان ملکوں سے اور یو این آئی سی ای ایف سے امداد ملتی تھی۔ غربت کے باوجود صومالی لینڈ میں امن وامان تھا

اگر چہ صومالیہ نے آج تک صومالی لینڈ کو یو این او کا ممبر نہیں بننے دیا تا کہ وہ غربت کا شکار رہے۔ خیر ہم باپ بیٹے 12 سال قبل دبئی سے رکتے رکاتے صومالی لینڈ کے سب سے بڑے شہر ہرگیسا آ پہنچے۔ ائر پورٹ پر ہمارے دوست جن کا نام محمد عثمان عابدی تھا لینے آئے ان دنوں پاکستان اور صومالی لینڈ کے درمیان ویزا ائر پورٹ پر ملتا تھا اس کیلئے ہر پاکستانی کو 2 سو امریکی ڈالر کیش کروانا لازم تھا جو ایک ڈالر کے عوض 5000 ہزار صومالی لینڈ کی کرنسی لینی پڑتی تھی یہی کرنسی اگر آپ شہر میں تبدیل کروائیں تو ایک امریکی ڈالر کے عوض 10000 ہزار صومالی کرنسی شلنگ مل جاتی تھی گویا 100 سو ڈالر کے عوض ایک بڑا تھیلا بھر کر کرنسی 10 لاکھ نوٹ کو سنبھالنا بھی ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ گویا صومالی لینڈ کی آمدنی کا ایک ذریعہ ٹورسٹوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ خیر ہم ہرگیسا پہنچے بہت چھوٹا شہر چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ، معمولی ائر پورٹ، چند چھوٹی گاڑیوں اور پرانی بسوں سے سفر کیا جاتا تھا، صرف ایک 2 اسٹار ہوٹل ائر پورٹ پر تھا اور 2 تین گیسٹ ہاؤس تھے۔ جس میں سے ایک ہمارے میزبان کا بھی تھا اس میں ہم کو ٹھہرایا گیا۔ صومالی لینڈ میں زیادہ تر اونٹ اور بھیڑ کا گوشت شوق سے کھایا جاتا ہے سبزیاں غریب غرباء کھاتے تھے۔ پورے شہر میں کچے پکے مکانات تھے ہر قسم کی منشیات پر پابندی تھی البتہ مقامی باشندے ایک خاص قسم کی گھاس نما ڈنڈیاں جس کو کاڈ (KADH) کہتے ہیں اس کو کھانے کی اجازت تھی جو صرف خواتین فروخت کر سکتی تھیں۔ دوسرے دن اس چھوٹے شہر کی مین مارکیٹ گئے وہاں پہ یہی کرنسی، کاڈ اور دیگر سبزیاں، کپڑے، جوتے وغیرہ سڑکوں پر ٹھیلوں پر مرد اور خواتین دونوں فروخت کر رہے تھے۔ مقامی کرنسی اور ڈالروں میں لین دین ہو رہا تھا، مسجدوں کی تعداد بھی زیادہ تھی بازار میں بھیڑ بھاڑ بھی تھی۔ غیر ملکی اور صومالی باشندے خرید و فروخت میں لگے ہوئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہوئیں تو تمام ٹھیلے والے اور چھوٹے چھوٹے کیبن والوں نے دروازے بند کر کے ٹھیلوں پر کپڑا ڈال کر مسجدوں کا رخ کیا بہت تعجب ہوا نہ تالا ڈالا نہ ٹھیلے پر حفاظتی اقدام کیا۔ ان

دنوں ہرگیسیا میں حکومت کی جانب سے بجلی، گیس کا کوئی بندوبست نہیں تھا ٹھیکہ پر جنریٹر سے بجلی خریدی جاتی تھی۔ کھانے پینے کا سامان زیادہ تر دبئی سے سمندری جہازوں سے لایا جاتا تھا۔ دوسرے دن ہمارے میزبان نے صومالی وزراء سے ملوایا بہت سادہ لباس صرف ایک لونگی اور قمیض سب پہنے ہوئے تھے، جس میں ہرگیسیا کا گورنر بھی خود معمولی گاڑی میں ہم سے ملنے آیا تھا۔ رات صومالی لینڈ کے صدر نے کھانے کی دعوت دی ایک معمولی سا 2000 گز پر معمولی سا بنا مکان جس میں نیچے ان کا صدارتی دفتر اور اوپر رہائش تھی، کچے پکے فرش کی تعمیر اور اس صدر کی سادگی دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ہم ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو ایک شخص نے آکر دروازہ کھٹکھٹا کر کھانا لگنے کی اطلاع دی ،کھانے کی میز پر صرف ایک ڈش بھیڑ کا گوشت، چاول، سلاد، فروٹ اور کھیر نما میٹھا تھا۔ اللہ اللہ اتنی سادگی سے اس صدر نے کہا ہم آپ کی خاطر تواضع اس سے زیادہ نہیں کر سکتے، 10 بجے رات کرائے کی بجلی چلی جائے گی لہذا جلدی کھانا تناول فرمائیں۔ دوسرے دن صدر نے اپنے فارن منسٹر سے مشورہ کر کے ہمارے صاحبزادے کو صومالی لینڈ کا آنریری قونصل جنرل بنادیا۔ مگر چونکہ یو این او نے ابھی تک اس ملک کو تسلیم نہیں کیا تو سفارتی تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔ تیسرے دن ہمارے میزبان ایک بہت بڑے گھنے جنگل میں لے گئے جو میلوں پھیلا ہوا تھا ہم نے دیکھا جا بجا بوریاں رکھی ہوئی تھیں ہم نے پوچھا یہ کس کی بوریاں ہیں اس نے بتایا کہ اس جنگل میں بھیڑ بکریاں گائے اونٹ پالے جاتے ہیں ۔رات کو ان کا دودھ نکال کر راستہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جو شہر کے دکان دار لے جاتے ہیں اور دوسرے دن اس کے عوض جو چیزیں کھانے پینے کی درکار ہوتی ہیں ان دودھ کے برتنوں کے ساتھ چٹ لگا دی جاتی ہے وہ مہیا ہو جاتی ہیں۔ ہر ہفتے لین دین کا حساب کر لیا جاتا ہے۔ ہم نے پوچھا یہ لاوارثوں کی طرح پڑی ہوئی بوریاں یہ دودھ کے برتن چوری نہیں ہوتے انہی کی زبانی آج تک ایسا نہیں ہوا۔ برس ہا برس سے یہ لین دین چل رہا ہے۔ اتنا امن امان عوام کی سادگی دیکھ کر خوشی ہوئی اتنا مفہوم لکھنے کا

مقصد یہ ہے کہ پچھلے ماہ 12 سال کے بعد دوبارہ ہم باپ بیٹے ہمارے میزبان کی دعوت پر گئے تو یقین نہیں آیا ان 12 سالوں میں صومالی لینڈ کی کایا پلٹ چکی تھی۔ وجہ ان کی بنجر زمینوں میں تیل اور پہاڑوں میں سونا، تانبہ ہر قسم کے ہیرے جواہرات کوئلہ معدنیات کی بدولت۔ صومالی لینڈ میں آج بھی اسی طرح مرد و خواتین اپنی دکانوں ٹھیلوں مارکیٹوں میں کرنسی اور اب سونے کے زیورات ہیرے وغیرہ اسی طرح خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ کوئی دہشت گردی داعش شباب تنظیمیں نام کو بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح آذان کی آواز پر دکانیں ٹھیلے بند ہوتے ہیں۔ عالی شان عمارتیں، 5 اسٹار ہوٹلز لمبی لمبی لینڈ کروزر کی بھرمار قیمتی مکانات صدر اور وزراء کے لئے لائن سے بنے لمبے لمبے باغات اور بنگلے، خوش اخلاق بھی عوام اور حکومتی لوگوں میں اسی طرح دیکھی۔ سپر مارکیٹس اور بڑے بڑے مالز لوگوں کے پاس دولت کی فراوانی اس اسلامی ریاست کا الگ نمونہ پیش کر رہی تھی۔ وہ امن امان کی فضاء وہی وزراء ہم کو سادگی سے ملے وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان سے سفارتی تعلقات قائم ہوں اور دونوں ممالک مل کر ان سے لیں دین کریں اور اب یو این او بھی صومالی لینڈ کو تسلیم کرنے والی ہے۔ پڑوسی ممالک اور افریقن ممالک بشمول یو اے ای، ترکی، سعودیہ بھی اس کو تسلیم کر چکی ہیں اور صومالی لینڈ میں ان کے سفارت خانے بھی کھل چکے ہیں۔ پاکستان کو بھی چاہئے کہ صومالی لینڈ کو تسلیم کر کے تجارتی راستے کھولے دونوں ملکوں کا اس میں فائدہ ہے۔ بھارتی صنعتکاران سے تجارت شروع کر چکے ہیں دنیا بھر سے صنعتکار صومالی لینڈ سے تانبہ، پیتل اور معدنیات خرید رہے ہیں پاکستانی صنعتکاروں کو چاہئے کہ وہ بھی صومالی لینڈ کا دورہ کریں اور اس نئی منڈی سے فائدہ اٹھائیں۔

اُردن میں ایک ہفتہ

پچھلے ہفتے راقم کو اُردن کے شہر عمان ایک علمی کانفرنس برٹش کیمبرج سسٹم پاکستان جو سال میں کئی مرتبہ پاکستان کے بجائے دیگر ممالک میں منعقد کرتی ہے اور پاکستان میں اس سسٹم سے منسلک بہت سے کیمبرج اسکول باہر جا کر شرکت کرتے ہیں۔ بہت تعلیمی معلومات شیئر کرتے ہیں۔ ہمارا تعلیمی ادارہ کے این اکیڈمی تقریباً ہر کانفرنس میں نہ صرف شرکت کرتا ہے، بلکہ بہت سی اضافی تعلیمی معلومات بھی دیگر ممالک سے آئے ہوئے اسکولوں کے مندوبین سے شیئر کرتا ہے۔ پاکستان کے حالات کے پیش نظر بہت سے ممالک کے مندوبین پاکستان آنے سے کتراتے ہیں۔ اس وجہ سے پاکستان میں قائم برٹش ایمبسی اپنے پاکستانی اسکولوں کو دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین سے نہ صرف تعلیمی معلومات شیئر کراتی ہے۔ ان کے مندوبین کے ویزوں، قیام، لیکچروں کا بندوبست کرتی ہے تاکہ دنیا بھر کے تعلیمی اسٹینڈرڈ سے کسی طرح بھی پاکستان پیچھے نہ رہے۔ یاد رہے ایک زمانے تک اُردن خلیجی ممالک میں سب سے پسماندہ ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہاں بھی دیگر خلیجی ممالک کی اکثریت کی طرح بادشاہت کا نظام رائج تھا۔ اُردن کے بادشاہ شاہ حسین نصف صدی تک وہاں کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ مگر ان کی فوج اور عمان کا ائرپورٹ ضیاء الحق مرحوم جب بریگیڈیئر تھے اور اُردن میں تعینات تھے تو اُن کی سربراہی میں موجودہ وزیراعظم شاہد خاقان عباسی کے والد مرحوم خاقان عباسی صاحب کے پلان کے

مطابق فوجی اور رسول ایئرپورٹ بنایا گیا تھا۔ قوم کی معلومات کے لئے اضافی معلومات لکھ رہا ہوں۔ مرحوم ایوب خان کے دور میں شاہ حسین کے چھوٹے بھائی ولی عہد حسن کی شادی ہمارے بیوروکریٹ کی صاحبزادی ثروت اکرام اللہ سے ہوئی تھی۔ بعد میں شاہ حسین نے ولی عہد حسن کو ہٹا کر اپنے بیٹے شہزادہ عبداللہ کو ولی عہد نامزد کر دیا۔ ان کے انتقال کے بعد سے شاہ عبداللہ اُردن کے بادشاہ بن کر اُردنی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دن رات کام کر رہے ہیں۔ چونکہ شاہ عبداللہ نے تمام تعلیم امریکہ میں حاصل کی تھی۔ اسی طرح ان کا رجحان بھی امریکی تعلیم کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جرمن، برٹش نظام تعلیم بھی ساتھ ساتھ اُردن میں رائج ہے۔ اس وقت تعلیم کے معاملے میں اُردن دیگر خلیجی ممالک سے جو بہت امیر کبیر ہیں ان سب سے بہت آگے ہے۔ یہاں تک کہ پڑوسی خلیجی ممالک کے طلباء اضافی تعلیم کے لئے اُردن کا رُخ کرتے ہیں۔ تقریباً 25 سال بعد جب اُردن جانے کا اتفاق ہوا تو کہاں اُردن کے طلباء پاکستان تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ آج اُردن تعلیم کے معاملے میں ہم سے بہت آگے جا چکا ہے۔ بڑی حیرانگی ہوئی اُردن میں عمان یونیورسٹی اور اُس کے کورس دیکھ کر بڑا رشک آیا۔ بڑی بڑی عمارتوں میں ہر ملک کی تعلیمی یونیورسٹیاں بھری پڑی ہیں۔ اُردن کی مادری زبان تو عربی ہے مگر وہاں کثرت سے انگریزی اور فرانسیسی بولی جاتی ہے۔ اُردن میں نہ تیل ہے نہ گیس یہ عرب ممالک سے خصوصاً عراق سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر اب اُس کے اسرائیل کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہو چکے ہیں۔ تو اب نیا معاہدہ تیل اور گیس سستے داموں کا اسرائیل سے ہو چکا ہے۔ چار دن کے قیام کے دوران ہمارا قیام دریائے اُردن جس کو بحر مردار (Dead Sea) بھی کہتے ہیں تھا تو ہم نے اس دریا کی سیر بھی کی اور اُس کی خصوصیت اُس کی مٹی بھی بدن پر ملی۔ جس سے بقول اُردن عوام کے کہ اس چکنی مٹی میں گندھک ملی ہوئی ہے۔ جسم کی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں وہ دریا میں بیٹھتے ہیں۔ سمندر ساکن ہے کوئی ڈوب نہیں سکتا ہر سال لاکھوں سیاح اُردن آتے ہیں۔ اور اس

سمندری مٹی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔اس سمندر کی دوسری طرف اسرائیل ہے جس کو عراق ،شام ،اُردن سمیت لبنان اور مصر نے تسلیم کرلیا ہے مگر ہم نے آج تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہے۔حالات یہ بتاتے ہیں کہ بہت جلد سعودی عرب سمیت تمام خلیجی ممالک بھی اسرائیل کو تسلیم کر لینگے ۔اُردن کے شہروں میں سینکڑوں اصحابہ کرام مدفون ہیں جن میں مسلمان سپہ سالار حضرت عبیدہ بن جراح حضرت معاذ بن جبل اور ان کے صاحبزادے کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں ۔راقم نے فاتحہ خوانی کی ان دونوں باپ بیٹوں کی قبر سے خوشبو آرہی تھی جو ایک معجزہ تھی ۔جو اُس زمانے میں طاعون کی وبا کے سبب انتقال کر گئے تھے ۔اُردن کے عوام بہت نرم گوشہ رکھتے ہیں ۔اس وقت فلسطین ،شام ،لبنان کے مہاجرین اکثریت سے آباد ہیں ۔اُردنی حکومت نے ان کو اقامے بھی دے دیئے ہیں تا کہ وہ نوکریاں اور کاروبار کرسکیں ۔حکومت بنیادی تعلیم اور علاج معالجہ کی مفت سہولت دیتی ہے۔ یہاں اصحاب کہف کا غار بھی ہے اور ٹوٹی پھوٹی شداد کی جنت کے بھی آثار پائے جاتے ہیں ۔ایک بہت بڑی پہاڑی پر فاتح فلسطین سلطان صلاح الدین کا فوجی قلعہ بھی ہے جو فلسطین کی حفاظت کے لئے انہوں نے بنوایا تھا تا کہ بیرونی حملوں سے محفوظ رہیں ۔یہاں حضرت خضر کی مسجد بھی ہے ۔عوام کا خیال ہے کہ وہ یہاں کہیں مدفون ہیں ۔ایک اہم ذریعہ معاش کھیتی باڑی کا نظام ہے جو اسرائیل کی طرح قطرے قطرے پانی سے کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ ہماری طرح کھیتوں میں پانی نہیں چھوڑا جاتا بلکہ قطرہ قطرہ پانی دینے کے لئے پائپ لائنوں میں باریک سوراخ ہوتا ہے جس سے 95فیصد پانی کی بچت ہوجاتی ہیں اسرائیل اور اُردنی افراد اس دریائے مردار کے کناروں سے ایک دوسرے کے ملک میں آجاسکتے ہیں۔ صرف ایک باڑ کی بارڈر ہے جو اُردن اور فلسطین کو جُدا کرتی ہے ۔اکثر اُردنی مسلمان اسرائیل کی مقبوضہ مسجد اقصیٰ میں جمعہ پڑھنے جاتے ہیں ۔جو ایک گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر واقع ہے۔ فلسطینی مسلمان صرف جمعہ پڑھنے جاسکتے ہیں وہ بھی بوڑھے مرد اور عورتوں کو اجازت ہے۔ فلسطین اور اسرائیل

کے درمیان اکثر کشیدگی پائی جاتی ہے ۔لہذا جگہ جگہ بڑی بڑی دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں تا کہ فسلطینی آجا نہ سکیں ۔سیاحوں کے لئے حکومت نے بہت مقامات اور خوبصورت پہاڑی سلسلے بنا رکھے ہیں علاقہ بطرہ بھی بہت خوبصورت ،دلکش بنا رکھا ہے ۔ایک چھوٹی پہاڑی پر حضرت موسیٰ کی قبر بھی ہے ۔سبزیاں، فروٹ اور سیاح اُردن کا ذریعہ آمدنی ہیں ۔بڑے بڑے ہسپتال اور میڈیکل کالجوں کی بھی بھرمار ہے۔ خصوصاً عراق اور خلیجی ممالک میں کثرت سے ادویات ایکسپورٹ کی جاتی ہیں ۔بادشاہت کے ساتھ ساتھ جمہوریت بھی ہے ۔عوامی پارلیمنٹ بھی ہے جو عوام کی بھلائی کے لئے بہت کام کرتی ہے ۔البتہ بادشاہ کا فیصلہ آخری ہوتا ہے ۔سعودیہ کی طرح دیگر شہزادے حکومت کا حصہ نہیں ہوسکتے وہ صرف کوئی فلاحی ادارہ یا کاروباری ادارہ چلا سکتے ہیں ۔موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے سردیوں میں برف باری بھی ہوتی ہے ۔گرمی بھی زیادہ نہیں پڑتی اور بارش بھی بہت ہوتی ہے ۔جس سے پورا ملک ہرا بھرا رہتا ہے۔ کھانے وہی عربوں کی طرح ہیں ۔عمان شہر میں 5اسٹار ہوٹلوں اور مالز بھرے پڑے ہیں ۔غیر ملکی سیاحوں سے چالیس دینار وصول کیئے جاتے ہیں جو ڈالر اور پونڈ سے بھی زیادہ مہنگا سکہ ہے پھر بھی سیاحوں سے ہوٹل ،ریسٹورنٹ سارا سال بھرے رہتے ہیں ۔پولیس ہر بڑے علاقے شروع ہونے سے پہلے کیمپ میں نظر آتی ہیں ۔ملک میں پورے طرح امن وامان ہے لہذا سیاح آسانی سے گھوم پھر سکتے ہیں ۔ایک ہفتے میں آپ پورا ملک گھوم سکتے ہے۔

”تاثرات“

ترکی کے شہر بُرسا (BURSA) کی سیر

اس سال گرمیوں کی چھٹی میں ترکی کے شہر استنبول جانے کا پھر موقع ملا تو ہمارے دوست استنبول سے 250 کلومیٹر دور ایک پہاڑی علاقے (BURSA) بُرسا میں رہتے ہیں وہاں آنے کی دعوت دی اور بتایا اس علاقے میں بہت آبشاریں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یوں سمجھیں 70 فیصد ترکی کی آبادی کو یہاں سے پانی فراہم کیا جاتا ہے دیگر قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے بھی کثرت سے ہیں گرم اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی ہیں۔ الغرض بڑی جگہیں گنوائیں اور خودمیزبانی کی خواہش ظاہر کی تو ہم میاں بیوی اور ہمارے ایک دوست کی فیملی جن کے ذریعے ہمارے میزبان کا تعارف ہوا تھا استنبول سے بُرسا روانہ ہو گئے۔ بُرسا جانے کے لئے ایک سمندری راستہ ہے جو صرف ڈیڑھ گھنٹے میں استنبول سے بُرسا پہنچ سکتے ہیں یا پھر بسوں اور گاڑیوں کے ذریعے 3 گھنٹوں میں جایا جاسکتا ہے، تو ہم نے پلان یہ بنایا کہ بڑے جہاز سے بذریعہ سمندر جایا جائے واپسی پر کار سے استنبول آیا جائے گا۔ چناچہ Cruise سے 11 بجے روانہ ہوئے تمام دن یہ کروز ہر 2، 3 گھنٹوں کے بعد آتے جاتے ہیں، بہت صاف ستھرے کروز تھے سفر آسانی سے کٹ گیا بُرسا پہنچے تو کنارے پر ہمارے میزبان نے ریسیو کیا 1/2 گھنٹے کی دوری پر اس کی رہائش ایک پہاڑی عثمان غازی میں تھی، دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کیا اور شام کو وہاں سے ایک دوسری پہاڑی جو پونے گھنٹے کی مسافت پر تھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس کی وجہ شہرت

ایک بہت بڑا درخت جس کی عمر 600 سال بتائی جاتی ہے بہت ہی گھنا تناور درخت تھا جس کے سائے میں ایک پورا ریسٹورنٹ اور بیٹھنے کے لئے بینچیں لگی ہوئی تھیں۔ پوری طرح پبلک سے بھرا ہوا تھا، چوٹی سے نیچے بُرسا شہر کا پورا خوبصورت نظارہ تھا۔ گرم گرم پراٹھے جو آلو اور پنیر کے الگ الگ بنے تھے ترکش کافی کے ساتھ بہت مزے دار تھے جب بھی آپ ترکی جائیں گرم گرم آلو اور پنیر کے پراٹھے ترکیوں کی مرغوب اسنیک ہے ضرور کھائیں۔ اگر آپ کڑوی کافی کے شوقین ہیں تو یہ ترکش کافی کا پہلا گھونٹ آپ کو ہلا دے گا، عام کافی سے 5 گنا کڑوا ٹیسٹ ہر کسی کے بس کا نہیں ہوتا یہ بغیر چینی کے پیا جاتا ہے۔ خصوصی چھوٹا سا قہوہ کا پیالہ ہم نے تو ہمت نہیں کی اور عام کافی پر اکتفا کیا، البتہ گرم گرم تازے پراٹھوں سے خوب انجوائے کیا اور اسی سے پیٹ بھر گیا رات کے کھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رات گئے تک پہاڑی پر گھومتے رہے اور پھر واپس بُرسا آ گئے۔ دوسرے دن ایک پہاڑی شہر اولاٹ OYLAYT بذریعہ کار روانہ ہوئے بُرسا سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کر کے نیچے پہنچے یہاں گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے چشمے ہیں۔ یہاں بہت سارے SPA ہوٹل میں نلوں کے ذریعے گرم پانی کے بنائے گئے ہیں۔ الگ الگ چھوٹے کمروں میں خواتین اور مردوں کے نہانے کا بندوبست ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو سارے دن کے لئے کمرہ کرائے پر لے لیں یا پھر گھنٹے بھر کے لئے بک کرا سکتے ہیں۔ یعنی جتنے گھنٹے آپ حمام استعمال کریں گے اسی حساب سے کرایہ ادا کریں گے۔ تقریباً 10 سے 15 ڈالر فی گھنٹہ اچھے اور صاف ستھرے حمام کا کرایہ ہوتا ہے۔ چپل، صابن، شیمپو، ٹوتھ پیسٹ اور تولیہ بھی ملے گا کافی دلچسپ ہے خصوصاً گرم پانی سے نہانے میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک اور پہاڑی پر گئے وہ بالکل سفید پہاڑی تھی اس کا نام PAMUKKALE تھا جو DENIZLE کے علاقے میں واقع تھی ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک جانے کے لئے کئی چیئر لفٹس لگی تھیں۔ کوکہ پہاڑی سلسلے تھے مگر خشک اور سفید علاقہ تھا بہت عمدہ ہوٹل بنے ہوئے تھے ہر پہاڑی پر آنے جانے کا کرایہ 10 ڈالر تھا۔ نیچے

ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ تھا جس میں آپ کو کوئلے سلگا کر انگیٹھی دی جاتی ہے آپ اپنے مطلب کا گوشت بھیڑ، گائے اور مرغی کا صاف کیا ہوا گوشت خریدیں خود آگ پر بھونیں اور گرم گرم کھائیں۔ اتنا تازہ باربی کیو کیا ہوا گوشت وہ بھی صرف معمولی نمک اور زیرہ لگا ہوا جو شاید ہی آپ نے کھایا ہو گا یہ مقام بھی بُرسا سے 2 گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے بہت یادگار رہے گا۔ ایک ہفتہ ہم نے بُرسا اور اس کے نواحی علاقوں اور پہاڑی پر گزار کر بذریعہ کار واپس استنبول ائرپورٹ پہنچے جس کی مسافت ڈھائی گھنٹوں میں براستہ ہائی وے طے کی تمام راستے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی درمیان میں گھوڑوں کے اصطبل، فارمز بھی تھے جہاں گھوڑوں کی افزائش نسل ہوتی تھی، یہاں بتانا چاہتا ہوں جس طرح عربوں کو اونٹ کا گوشت اور اونٹنی کا دودھ پسند ہے ترکوں کو گھوڑے کا گوشت بہت مرغوب ہے اسی وجہ سے ترک قوم بہت بہادروں اور دوستوں کی قدر کرتی ہے اور دوستی نبھانے میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ خصوصاً ہر ترک پاکستان اور پاکستانی قوم کا بہت احترام کرتا ہے۔ ہم جس جس اجنبی ترک سے ملے اور ہم نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ریسٹورنٹوں میں چند اضافی آئٹم مفت پیش کئے۔ ویسے تو ترک قوم کا کھانا باربی کیو کے ساتھ سبزیاں، سلاد، پراٹھا اور پنیر ہوتا ہے مگر استنبول میں ایک عربی ترکی مکس ریسٹورنٹ بہت مشہور ہے اس کا نام مدینہ ریسٹورنٹ ہے۔ بے حد لذیز اور تازے آگ، انگیٹھی پر پکے ہوئے کھانے نایاب انداز میں پیش کرتے ہیں اور ٹیبل پر لاکر مٹی کی ہانڈیوں میں پیش کرتے ہیں۔ کھانے کے اوقات میں تو کئی کئی گھنٹوں کا انتظار ہوتا ہے بہتر ہے بکنگ کرا کر جائیں ورنہ انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑے گا۔ چلتے چلتے بتاتا چلوں کہ 70 کی دہائی میں ہماری قومی ائرلائن پی آئی اے نے ترکش ائرلائن بنا کر دی تھی، 73 میں ہمارے پاس تجربے کے علاوہ ترکش ائرلائن سے 2 گنا جہاز ہوتے تھے اور ہمارا ائرپورٹ بہت کشادہ تھا اور ہم پی آئی اے سے امریکہ، کینیڈا تمام بڑے یورپین ممالک، خلیج اور ایشیائی ممالک جاتے تھے اور 10 بڑی ائیر لائنز میں

شمار ہوتے تھے اور 10 بڑی ائر لائن بنانے کے موجد تھے۔جس میں سنگاپور، ترکش، بلجیم اور آخر میں امارات شامل تھیں۔راقم پہلی مرتبہ ترکی 1973 میں بزنس کے سلسلے میں گیا تھا بہت چھوٹا ائر پورٹ ہوتا تھا پھر 45 سال کے دوران آنا جانا رہتا تھا اس کے ائر پورٹ کشادہ اور جہازوں کی تعداد بڑھتی رہی اور اس مرتبہ ایک نئے ائر پورٹ کا افتتاح ہوا تھا جس میں تقریباً 2 کلومیٹر اندر چلنا پڑا۔بہت کشادہ خوبصورت اور ڈیوٹی فری کی سینکڑوں دوکانوں سے آراستہ دبئی انٹرنیشنل ائر پورٹ سے تقریباً 2 گنا بڑا تھا۔ان کے جہازوں کی تعداد 328 ہوچکی ہے۔تقریباً 1،1 گھنٹہ جہازوں کے ٹیک آف میں لگتا ہے جبکہ 4 رن وے استعمال ہو رہے ہیں۔اس وقت 300 سے زیادہ شہروں میں آجا رہے ہیں جن میں 253 بین الاقوامی اور 50 مقامی ترکی کے شہر شامل ہیں۔ہماری پی آئی اے 55 جہازوں سے 30 تک آچکی ہے اور پوری دنیا کے شہروں سے گھٹ کر چند ممالک تک محدود ہو چکے ہیں اور آدھے ملکوں کے حقوق تک بیچ چکے ہیں، اب صرف ائر لائن کو فروخت کرنے کی 2، تین بار کوششیں کر چکے ہیں، مگر 1 درجن پی آئی اے کی یونینز آڑے آجاتی ہیں اور خسارہ بڑھتے بڑھتے اربوں روپے تک پہنچ چکا ہے۔شاید نئی حکومت کوئی تبدیلی لا سکے۔

﴿یورپ کی ترقی کا راز﴾

فرانس کے شہر کانس (CANNES) شمال میں سب سے خوبصورت بیچ یعنی ساحل سمندر سمجھا جاتا ہے۔یہاں دنیا بھر سے سیاح خصوصی طور پر مئی، جون اور جولائی میں آتے ہیں۔کیونکہ ان مہینوں میں بے تحاشہ فیسٹیول (نمائش) لگتی ہیں جن میں خصوصی طور پر فلمی میلے کا انعقاد ہوتا ہے۔جس میں ہالی ووڈ کے اداکار، گلوکار، ہدایتکار اور فلم لائن سے وابستہ افراد شرکت کرتے ہیں۔ہر سال آسکر ایوارڈ کا اجراء بھی ہوتا ہے۔عوام اور سیاح ان اداکاروں کو قریب سے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور خوشی خوشی ان میں گھل مل کر تصاویر کھنچواتے ہیں۔انہی مہینوں میں ٹور ڈی فرانس کی ہر سال سائیکل ریس بھی ہوتی ہے جو اس شہر سے گزرتی ہے۔اس ریس کے گزرنے والے راستوں کو مقامی انتظامیہ اہتمام کر کے خوبصورتی سے سجاتی ہے۔سیاح اور مقامی افراد لاکھوں کی تعداد میں قطاریں بنا کر گھنٹوں ان دنیا بھر سے آئے ہوئے سائیکل سواروں کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے نمایاں جگہوں پر انتظار کرتی ہے۔اس کی وجہ یہ کہ کسی کو صحیح وقت نہیں معلوم ہوتا جب ان سواروں کے آگے پولیس کی گاڑیاں جو وقفہ وقفہ سے گزر کر راستہ کلیئر کرتی ہیں تو عوام کا جوش وخروش اور بھی بڑھ جاتا ہے۔وہ تالیاں بجا کر ان پولیس والوں کے دستوں کا استقبال کرتے ہیں۔پھر جب یہ سائیکل سوار جو تعداد میں کئی سو ہوتے ہیں ان کے سامنے سے گزرتے ہیں تو خوب تالیوں کی گونج میں ایک عجیب نظارہ بن جاتا ہے۔لوگ ان پر پھول بھی نچھاور

کرتے ہیں۔یاد رہے یہ وہی شہر ہے جہاں تقریباً 20 سال پہلے ہمارے عوامی لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے شاہ نواز بھٹو اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے تھے۔ یہاں ان مہینوں میں تمام چھوٹے بڑے اور درمیانی ہوٹل ان سیاحوں سے بھرے ہوتے ہیں اور عام دنوں کی نسبت اکثر ہوٹل کے کرائے زیادہ سے زیادہ دگنے ہو جاتے ہیں۔اسی شہر کانس سے ملا ہوا ایک شہر گراس (Grasse) ہے جہاں دنیا بھر کیلئے خوشبو (Perfume) پیدا کی جاتی ہے اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔یاد رہے فرانس پوری دنیا میں سیاحوں کی آمد و رفت میں اوّل مقام رکھتا ہے۔یہ ساحل سمندر کئی سو میل لمبا ہے جو نائس (Nice) ائیر پورٹ سے شروع ہوتا ہے جو بیچ سمندر میں بنایا گیا ہے۔یہ نائس (Nice) شہر بھی بہت خوبصورت ہے۔اس سمندر کے ساحل سے جڑے بہت اچھے اچھے جزیرے ہیں اگر ہم نائس (Nice) سے اوپر کی طرف پہاڑی علاقوں میں جائیں تو پہاڑ کے دامن میں موناکو (Monaco) نام کا ایک بہت چھوٹا ملک واقع ہے جس کا صرف ایک شہر مونٹی کارلو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے جس کی کل آبادی 20 بائیس سو افراد پر مشتمل ہے بہت خوبصورت شہر ہے۔پورے شہر کو کیمروں سے کور کیا ہوا ہے اور 24 گھنٹے پولیس کی نگرانی میں کیمروں کی مدد سے سیکیورٹی کا انتظام کیا ہوا ہے۔اس لیے یہاں صفر فیصد جرائم کی شرح ہے۔اس چھوٹے ترین ملک کی آمدنی کے تین ذرائع ہیں۔ایک تو معتدل موسم کی وجہ سے سیاح آتے ہیں دوسرا بڑا Attraction کیسینو (Casino) میں ہر قسم کا جوا ہوتا ہے۔ان ہی مہینوں میں دنیا بھر میں مشہور کار ریس ہوتی ہے۔اس دن اس شہر یعنی مونٹی کارلو کو بہت خوبصورتی سے چمکایا جاتا ہے۔تمام سڑکیں 2 گھنٹے کیلئے بند کر دی جاتی ہیں، ہر قسم کی سواری ممنوع ہوتی ہے اور پھر شہر بھر کی سڑکوں پر اس ریس میں حصہ لینے والی گاڑیوں کی ریس شروع ہو جاتی ہے۔اس ریس کو بھی دیکھنے کیلئے دنیا بھر سے سیاح جوق در جوق آتے ہیں اور سائیکل سواروں کی طرح ان گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو بھی ہاتھ ہلا ہلا کر داد دی جاتی ہے۔ویسے اس ملک کے حکمرانوں کا

بہت بڑا محل بھی ہے جسے دیکھنے کیلئے بھی بہت دور دور سے سیاح آتے ہیں۔اگرچہ اس محل میں کوئی نہیں رہتا صرف سیاحوں سے ٹکٹ کے ذریعے حکومت کو بہت آمدنی ہوتی ہے۔تقریباً 3 گھنٹے لگ جاتے ہیں۔گروپوں کی شکل میں یہاں کے گائیڈ محل کی سیر کراتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس محل کی تاریخ اور تاریخی حکمرانوں کے الگ الگ مخصوص کمروں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔اس چھوٹے سے ملک میں ایک بہت خوبصورت زیر زمین مچھلی گھر بھی ہے جس میں دنیا بھر کی ہر نسل کی چھوٹی بڑی، نایاب، رنگ برنگی مچھلیاں لا کر جمع کی گئی ہیں۔ان کی نسل اور ملک کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔اسی طرح ایک میوزیم بھی ہے یہاں کے باشندے بہت امیر ہیں۔اس لحاظ سے یہاں مہنگائی بھی بہت زیادہ ہے۔ایک چائے کی پیالی 10 سے 15 یورو یعنی 1500 روپے تک ملتی ہے۔ ہوٹلوں کے کرائے بھی فرانس سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں کی ایک شہزادی جس کا نام پرنس گریس تھا وہ کار ریس میں حصہ لیتی تھی۔اس کا انتقال بھی ایک کار ریس میں ہو گیا تھا جس کی یاد میں اس کے شوہر نے لندن میں اس کے نام پر بہت خوبصورت ہسپتال (گریس ہسپتال) بنا کر اس کی یادگار تعمیر کر دی ہے۔اسی شہر میں ان کے حکمران بادشاہوں کا بھی قبرستان بہت خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ہر قبر پر اس بادشاہ کا نام اور اس کی حکمرانی کے بارے میں معلومات درج ہیں۔جہاں اس شہر کی حدود ختم ہوتی ہے وہاں سے یورپ کے ایک دوسرے ملک اٹلی کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

چونکہ اب یہ تمام ممالک یورپی یونین میں شامل ہو چکے ہیں تو ان کی تمام سرحدیں ختم کر کے ایک دوسرے کے ملک میں آمد و رفت کی رکاوٹیں ختم کر دی گئی ہیں۔اب صرف ایک ویزے پر جس کا نام شنگین ویزا ہے لے کر غیر یورپی سیاح علاوہ انگلینڈ کے ان تمام ملکوں میں گھوم سکتا ہے۔تمام کسٹم اور امیگریشن کی پابندیوں سے آزاد ممالک مل کر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔یاد رہے! ان تمام ممالک نے 10 سال پہلے اپنے اپنے ملک کی کرنسیوں کو ختم کر کے اپنے اپنے اختلافات مٹا کر ایک نئی

متفقہ کرنسی یورو کے نام سے متعارف کرا کر دنیا کو حیران کر دیا۔ جب یہ نئی کرنسی متعارف کرائی گئی تو اس کی قیمت ڈالر سے 25فیصد کم تھی آج یہی کرنسی ڈالر سے تقریباً ڈیڑھ گنا مہنگی ہو چکی ہے اور دنیا کی مضبوط ترین کرنسی سمجھی جاتی ہے۔ کاش ہمارے خطے کے لوگ جنہوں نے ان یورپی یونین کی طرز پر سارک نامی تنظیم تو بنا ڈالی مگر آج تک اپنے اپنے اختلافات ختم کرنے کے بجائے پوری شدت سے ایک دوسرے کے دست و گریباں ہو کر کمزور سے کمزور تر ہو رہے ہیں اور اپنی کرنسیوں کو یورپ کے مقابلے میں 50 گنا نیچے لے جا چکے ہیں۔ اپنے اپنے عوام کو معاشی فائدہ پہنچانے کے بجائے ہر سال صرف کانفرنسیں منعقد کر کے فوٹو سیشن کروا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ عوام غربت کی لکیر سے ہر سال اور نیچے جا رہے ہیں مگر افسوس صد افسوس سارک ممالک کے حکمرانوں کی آنکھیں اس ترقی یافتہ میڈیا کے دور میں بھی ابھی تک نہیں کھلیں۔ کاش ہم یورپ کی ترقی سے سبق سیکھ لیں۔ یاد رہے ان 10 سالوں میں 2 ممالک پرتگال اور یونان 2 سال پہلے معاشی طور پر دیوالیہ ہو گئے تھے ان کو جرمنی اور فرانس نے 100 سو بلین ڈالر امداد اور قرضے دے کر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا ہے۔

امارات کی 40 سالہ جشنِ آزادی

1975ء میں لندن جاتے ہوئے ہماری قومی ایئر لائن پی آئی اے کا جہاز دبئی ایئر پورٹ اترا جہاز کا دروازہ کھلا تو گرم ہوا کا جھونکا اندر آیا ایسا لگا کہ جیسے ہم تپتے ریگستان میں اتر گئے ہوں پھر ایک بہت پرانی بس سے ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تو ایئر پورٹ پر گرمی تھی کوئی ایئر کنڈیشن نہیں تھا جبکہ ہمارے کراچی کا ایئر پورٹ ایئر کنڈیشن ہوتا تھا، معمولی ڈیوٹی فری شاپس تھیں جن پر پاکستانی اور ہندوستانی ورکرز کام کر رہے تھے۔ اردو میں انا ؤنسمنٹ ہو رہی تھی جہاز نے ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا گرمی کی وجہ سے راقم نے پی آئی اے والوں سے کہا مجھے واپس جہاز میں بھجوا دو گرمی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ پی آئی اے والوں نے معذرت کی کہ ایک بس ہے اور تمام مسافروں کو لا کر لے جانا جب ہی ممکن ہے جب فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو گا۔ اس دوران کوئی دوسری فلائٹ بھی نہیں آئی اللہ اللہ کر کے فلائٹ کا اعلان ہوا اور ہم واپس جہاز میں پہنچے گرمی سے نجات ملی اور ٹھنڈی ہوا کھانے کو ملی اور جہاز روانہ ہو گیا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ اسکے بعد 20 سال تک لندن جب بھی گیا دبئی ایئر پورٹ پر جہاز سے ٹرانزٹ لاؤنج میں جانے کے بجائے جہاز سے نہیں اترا پھر آہستہ آہستہ دیکھتے ہی دیکھتے دبئی نے ترقی کرنا شروع کی پھر بھی پاکستان کی نسبت وہ ہم سے بہت پیچھے تھا بجلی اور پانی کی قلت تھی گیس نام کی کوئی شے بھی نہیں تھی ہم نے امارات میں دبئی، ابوظہبی، شارجہ، اجمان، راسل خیمہ، العین، فجیرہ سات ریاستوں

پر مشتمل اس ملک کی پہلی کرنسی نوٹ چھاپ کر دی، یہ ریاستیں دسمبر 1971ء میں برطانیہ سے آزاد ہوئی تھیں سب سے پہلے پاکستانی نوٹ جو ایک روپیہ 5 روپے، 10 روپے اور 100 روپے پر بالترتیب 1 درھم، 5 درھم، 10 درھم اور 100 درھم لکھ کر چھاپا پھر بعد میں ان کے اپنے الگ کرنسی کے نوٹ چھاپ کر دیئے یہ پرانے نوٹ دبئی کے عجائب گھر میں آج بھی محفوظ ہیں پھر ہمارے بنکروں نے جن میں یونائیٹیڈ بنک اور حبیب بنک شامل تھے اپنی برانچیں کھولیں ساتھ ساتھ انکے بنک بھی کھلوائے بجلی اور پانی کا انتظام بھی پاکستانیوں کی مرہون منت تھا انشورنس کمپنیاں بھی پاکستانیوں نے اس ملک میں پہلی مرتبہ قائم کیں ہمارے صنعتکار بھی اپنی فیکٹریاں لگانے دبئی پہنچ گئے اس کی سب سے بڑی وجہ 1972ء میں پی پی پی کے پہلے دور میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے بنک، انشورنس کمپنیاں اور بڑے بڑے ادارے قومی تحویل میں لے لئے تھے یعنی تمام نجی کمپنیوں کو نیشنلائز کر دیا تھا جبکہ دنیا میں غیر ملکی کمپنیوں کو نیشنلائز کیا جاتا تھا۔ ہمارے ملک میں غیر ملکی بنک اور غیر ملکی انشورنس کمپنیوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا اس طرح ہماری معیشت کو سخت دھچکا پہنچا ہمارے ملک کے سرمایہ دار دبئی اور دوسرے ممالک میں جا کر شفٹ ہو گئے اور ہم آج تک اس کے نقصانات سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہم ہر انڈسٹریز میں خود کفیل تھے جن میں اناج سے لیکر پھل، سبزیاں، دالیں، گوشت تک دبئی جاتا تھا۔ یہاں آزادی کے وقت ایک صنعت بھی نہیں تھی اسکول اور کالج، یونیورسٹیاں بھی قابلِ ذکر نہیں تھے ہمارے ڈاکٹر، انجینئر، صنعتکار، بنکروں اور مزدوروں نے امارات کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی کے وقت پورے امارات کی آبادی 1 لاکھ سے بھی کم تھی اس کی کوئی ائیر لائن بھی نہیں تھی سب کچھ انہوں نے ہم سے سیکھا اور ایسا سیکھا کہ آج وہ صرف 40 سال کے قلیل عرصے میں ہم سے اتنا آگے جا چکے ہیں کہ یقین نہیں آتا ان کے ملک میں 80 لاکھ کی آبادی ہو چکی ہے جن میں 60 لاکھ غیر ملکی ہیں جو ان کے لئے کام کر رہے ہیں جن میں 55 لاکھ بھارتی اور پاکستانی ہیں، 5 لاکھ بنگلہ دیشی اور فلپائنی ہیں، مقامی صرف

15 لاکھ ہیں۔ 15 سال پہلے ہماری قومی ائیر لائن نے پہلی امارات کی قومی ائیر لائن ایمریٹس پی آئی اے کے تین جہازوں کو لیز پر لے کر شروع کی آج وہ دنیا کی تیسری بڑی ائیر لائن صرف 15 سال میں بن چکی ہے۔ ہماری ائیر لائن جس نے دنیا کی 17 ائیر لائنوں کو بنا کر دیا آج وہ 120 ارب کے خسارے میں جا چکی ہے صرف 12 ارب روپیہ سود ادا کر رہی ہے کبھی ڈیزل اور پیٹرول نہیں، کبھی تنخواہ دینے کے لئے پیسے نہیں ہوتے آج امارات کے باشندے اپنے ملک کی آزادی کا 40 سالہ جشن منا رہے ہیں ہر طرف خوشحالی ہے ان کے حکمرانوں نے اپنے عوام کے لئے اتنے کام کئے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے، تعلیم مفت، بجلی اور گیس مفت، ڈاکٹر اور ادویات مفت، بڑے بڑے ہسپتال اور تعلیمی ادارے پوری دنیا سے لا کر دبئی اور ابوظہبی میں قائم کر دیئے۔ اس 40 سالہ جشن کی خوشی میں وہ اپنے تمام سرکاری ملازمین کو ایک ایک گھر مفت دے رہے ہیں انکی تنخواہوں میں 100 فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے، شادی کے لئے 2 لاکھ درھم تک اعانت کی جاتی ہے۔ کراچی سے آدھی آبادی والے ملک میں جہاں کا ائیر پورٹ سب سے چھوٹا ہوتا تھا آج 3 بڑے ائیر پورٹ انہیں چھوٹے پڑ گئے اور وہ 2015ء تک دنیا کا سب سے بڑا ائیر پورٹ تعمیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے پورے ملک کا بجٹ 15 ارب ڈالرز کا ہے جس کی آبادی 17 کروڑ ہے جبکہ ان کی ایکسپورٹ 800 کھرب ڈالرز کی ہے دبئی جہاں کوئی تیل بھی نہیں پیدا ہوتا دنیا کا چھٹا ملک بن چکا ہے جو معاشی اعتبار سے اس خطے میں ناممکن ہے۔ کویت کے بعد اس خطے کا امیر ترین ملک بن چکا ہے آزادی کے وقت اسکے سکے کی قیمت صرف 2 روپے تھی آج وہ 23 روپے تک جا چکا ہے۔ دنیا کا سب سے بلند ترین ٹاور بھی دبئی میں قائم ہو چکا ہے اور سب سے بہترین 7 اسٹار ہوٹل بھی دبئی میں ہے۔ انہوں نے عوام کی سہولت کے لئے جدید ترین میٹرو کا نظام زمین سے اوپر بنا کر دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ ہمارے بنک انشورنس ٹیلی کمیونیکیشن کے ادارے بھی وہ خرید چکے ہیں اور اپنے بنکوں کی شاخیں بھی ہمارے

ملک میں قائم کر چکے ہیں سب چیزوں میں وہ خود کفیل ہو چکے ہیں۔63 ڈیم تعمیر کر کے بجلی کا مسئلہ حل کر چکے ہیں اور 150 ڈیم تعمیر کرنے کا عزم رکھتے ہیں ہم صرف ایک ڈیم پر اٹکے ہوئے ہیں۔پولیس کا جدید ترین نظام انہوں نے ہمارے پولیس اداروں سے لیکر اپنے ملک میں قائم کیا اور ایماندار پولیس نظام کی بدولت اس ملک کا نام روشن کیا،عدل میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں،صفائی ستھرائی،سڑکوں کا طویل نیٹ ورک اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر کام میں دل جمعی سے کام لیتے ہیں بڑی بڑی ہزاروں عمارتیں جدید طرز پر تعمیر کر کے کم مدت میں دنیا کو بتا دیا کہ وہ اب بدو نہیں رہے۔ان میں دنیا سے مقابلے کی ہمت بھی ہے ان کے حکمران اپنی اپنی جیبیں بھرنے اور کرپشن پر یقین نہیں رکھتے اور ہمارے سامنے ایک اعلیٰ مثال قائم کر چکے ہیں۔دنیا بھر کی نمائشیں ہر روز کسی نہ کسی انڈسٹریز کے متعلق لگی رہتی ہیں پوری دنیا سے سیاح اس ملک میں آزادی سے آتے جاتے ہیں۔ایک نوجوان لڑکی بھی رات کو تنہا آزادی سے گھوم سکتی ہے۔دنیا کے بہترین مالز،سپر مارکیٹیں،ریسٹورنٹس،ہوٹلز امارات میں جگہ جگہ بن چکے ہیں،دنیا بھر کے کھانے اس ملک میں با آسانی دستیاب ہیں اس ملک کی جتنی تعریف کریں کم ہے۔

آج ان کے عوام حقیقی آزادی کا جشن منانے کے حقدار ہیں ہم کو بھی آزاد ہوئے 67 سال ہو چکے ہیں قوم مسلسل زوال کی طرف جا رہی ہے ملک سے انصاف ختم ہو چکا ہے ہمارے سیاستدانوں نے صرف اور صرف اپنی جیبیں بھرنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ملک کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کر دیا۔اب شاید کوئی معجزہ ہی پاکستان کی معیشت کو بچا سکتا ہے ہم کو جشنِ آزادی مناتے وقت شرم محسوس ہوتی ہے کیا اسی دن کے لئے ہم نے پاکستان بنایا تھا؟

﴿یورپ میں گزرے اذیت ناک پانچ دن﴾

پچھلے ہفتے کینیڈا کی سیر کے بارے میں کالم لکھا تھا معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔کینیڈا سے پاکستان کیلئے روانہ ہوئے اور راستے میں جہاز بدلنے کیلئے ایک دن سوئٹزرلینڈ میں رکنا تھا۔جب دوسرے دن سوئٹزرلینڈ سے روانہ ہونے لگے تو ائیر پورٹ پر غیر معمولی افراتفری دیکھنے میں آئی۔جب کاؤنٹر سے معلوم کیا کہ اتنی بڑی لائینیں اور بھیڑ کیوں لگی ہے تو معلوم ہوا کہ آئس لینڈ میں آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہے اس کا لاوا ہوا میں بکھر رہا ہے۔تعجب ہوا ہزاروں میل دور آئس لینڈ سے سوئٹزرلینڈ کا کیا تعلق ہے کہ تمام جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی ہے۔سوئٹزرلینڈ کا ہوائی اڈہ فوری طور پر جہازوں کیلئے چند گھنٹوں کیلئے بند کر دیا گیا ہے اس وجہ سے مسافروں کو انتظار کیلئے رکنا پڑے گا۔چند گھنٹے بند کرنے سے مسافروں میں خصوصاً خواتین، بچے، بوڑھے پریشان ہو گئے۔پھر چند گھنٹے بڑھ کر 24 گھنٹوں کا اعلان ہوا۔مسافروں میں بے چینی بڑھتی گئی۔رات تک سوئٹزرلینڈ میں ہوائی کمپنیوں میں طے ہوا کہ مسافروں کو جو ٹرانزٹ مسافر ہیں ہوائی کمپنیاں ہوٹل میں ٹھہرائیں گی۔مگر ہم تو ایک دن رکنے کی وجہ سے اب نئے مسافر تھے ہم اپنے ہی خرچے پر ٹھہریں گے۔ہم واپس اپنے ہوٹل ٹھہرے تو ہوٹل والوں کی چاندی ہو چکی تھی۔منہ مانگا کرایہ طلب کرنے لگے خیر دگنے کرائے پر ایک دن کیلئے رک گئے۔تمام ائیر لائینوں کی طرف سے صرف ایک جواب آ رہا تھا کہ اب جب تک انٹرنیٹ سے ہوائی اڈہ کھلنے کا

اعلان نہ ہو برائے مہربانی آپ ائیر پورٹ کی طرف ہرگز نہ آئیں۔ پہلا دن اسی افراتفری میں گزرا پھر معلوم ہوا کہ یورپ کے تمام ائیر پورٹس غیر معینہ مدت کیلئے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یورپ کے رہنے والے ٹرینوں کی طرف دوڑے کیونکہ یورپ میں ٹرینوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ 2 گھنٹوں سے لے کر بارہ 15 گھنٹوں کا سفر ایک عام بات ہے لہٰذا یورپ جانے والے مسافر تو ٹرینوں میں روانہ ہونے لگے معلوم ہوا کہ ٹرینوں میں بھی کافی رش بڑھ گیا ہے۔ 2 دن تک کی بکنگ فل ہوگئی۔ ہماری طرح ٹرینوں میں لٹک کر یا ٹرینوں کی چھت پر نہیں بیٹھا جاتا کیونکہ تمام ٹرینیں الیکٹرک سے چلتی ہیں اور ہمیشہ وقت مقررہ پر ہی پہنچتی ہیں۔ ہمارا سفر تو یورپ سے بہت باہر یعنی دبئی سے کراچی تک کا تھا۔ اس کی وجہ سوائے ہماری قومی ائیر لائن پی آئی اے کے کوئی بھی امریکی یا یورپ سے آنے والی ہوائی کمپنیاں پاکستان کے کسی شہر میں ڈائریکٹ تو کجا براستہ دبئی یا کسی اور گلف سے بھی نہیں جاتیں سب نے اپنے دفاتر تک پاکستان میں بند کر دیئے ہیں صرف ان کے مقامی پاکستانی ٹریول ایجنٹ بکنگ کرتے ہیں۔ 3 دن تک جبری رہنے کی وجہ سے سوئٹزرلینڈ گھومنے کا موقع ملا۔ سوئٹزرلینڈ بھی دنیا کے خوبصورت ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اس ملک کی آبادی صرف ساڑھے سات ملین یعنی آدھی کراچی کے برابر ہے۔ لاتعداد پہاڑ، جھیلیں، برف پوش چوٹیاں اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتی ہیں۔ بالکل ہمارے شمالی علاقہ جات سوات، دیر، چترال، کاغان، کے ٹو سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ ایک زمانے میں تو ہمارے ان علاقوں کو منی سوئٹزرلینڈ کہا جاتا تھا۔ جہاں صرف ہمارے ملک کے دوسرے علاقے کے باشندے گرمیاں گزارنے آتے جاتے تھے مگر جب سے طالبان آئے وہ اب اُجڑ کر رہ گئے ہیں۔ بدقسمتی تو دیکھئے دنیا کی دوسری بلند ترین پہاڑوں کی چوٹی ''کے ٹو'' پاکستان میں واقع ہے جس سے ہم بہت زرِمبادلہ کما رہے تھے۔ کروڑوں کی رقم پاکستانی سیاحوں سے ہر سال وصول ہوتی تھی۔ ہوٹل اور مقامی لوگوں کے روزگار وابستہ تھے مگر وہ سب ایک سال سے ختم ہو چکا ہے۔ اس سوئٹزرلینڈ میں لاکھوں غیر ملکی سیاح آتے جاتے

ہیں۔ بلند ترین پہاڑوں پر چیئر لفٹس لگی ہوئی ہیں۔ برف پر اسکیٹنگ ہوتی ہے۔ جھیلوں پر لوگوں کا تھمگٹھا ہوتا ہے۔ اس سوئٹزرلینڈ سے ملحق ایک ریاست ایسی بھی ہے جہاں بادشاہت ہے۔ تمام دنیا کے بینکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اربوں ڈالرز کا لین دین بھی اسی ریاست میں ہوتا ہے جس کیلئے پوری دنیا میں مشہور ہے وہ بھی دیکھا اور 3 دن گزر گئے۔ پھر ائیر پورٹ پہنچے تو دیکھا لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک تو ہوٹل بھرے ہوئے دوسری طرف کھانے پینے کا سامان بھی وہاں منہ مانگے داموں بک رہا تھا۔ بہت سے سیاحوں کے پاس تو پیسے ختم ہو گئے تھے وہ سب ائیر پورٹ پر پڑے ہوئے تھے۔ ہوائی کمپنیوں نے بھی مزید سہولتیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس ائیر پورٹ پر ایک تبلیغی ٹیم کے افراد سے ملاقات ہوئی جو مقامی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ لوگ بھی کافی پریشان تھے۔ اللہ اللہ کر کے پانچویں دن اعلان ہوا کہ چند پروازیں شروع کر رہے ہیں۔ پھر کیا تھا کاؤنٹرز کی طرف لوگ دوڑے، قیامت خیز منظر نظر آنے لگا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد استنبول سے یورپ کی فلائٹ مل رہی تھی تو وہ بھی اسی طرح خوش تھے۔ 10 گھنٹے ائیر پورٹ پر رہنے کے بعد دبئی کی فلائٹ ملی پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اپنے ملک تو جانے کو ملا جہاں سے پھر جہاز پکڑ کر دوسرے دن کراچی کی فلائٹ ملی۔ کراچی روانہ ہونے پر آخری تازیانہ ہماری قومی ائیر لائن والوں نے دبئی سے کراچی آنے پر لگایا۔ ہمارے ٹکٹ بزنس کلاس کے تھے اور چھوٹا جہاز بھیج کر بزنس کلاس کی قیمت لے کر اکانومی (Economy) کلاس میں سفر کرایا۔ ایسی اذیت دیکھنے کے بعد پاکستان کی سرزمین پر پہنچے۔ یہ مناظر تمام زندگی یاد رکھنے کیلئے کافی ہیں۔ یہاں آئے تو معلوم ہوا ہزاروں پاکستانی یورپ جانے کیلئے بے تاب ہیں اس کی وجہ وہ وہاں سیٹل ہیں۔ وہ پاکستان کام سے یا عزیز و اقارب سے ملنے آئے تھے۔ ان کو اگلے ایک ہفتے میں بھی فلائٹ نہیں مل رہی ہیں کیونکہ ہمارے جہاز بہت کم یورپ جاتے ہیں ان کی مشکلات ابھی باقی ہیں۔ وہ کب اپنے اپنے کاموں پر پہنچیں گے اللہ کو معلوم ہے۔ ایسا لگتا ہے آتش فشاں کا لاوا آئس لینڈ میں نہیں پوری دنیا پر گرا تھا۔ کھربوں ڈالر اس کی نذر ہو گئے۔

﴿نویں ورلڈ کانفرنس اعزازی قونصلر﴾

پچھلے ہفتے میں کالم نہیں لکھ سکا مجھے ترکی کے شہر ازمیر میں 9ویں ورلڈ کانفرنس برائے اعزازی قونصلر میں شرکت کیلئے جانا تھا جہاں دنیا بھر سے اعزازی قونصلر جنرل شریک ہو رہے تھے۔ میرا یہ پہلا تجربہ تھا یہ کانفرنس ہر تین سال بعد مختلف ممالک میں ہوتی ہے۔ مجھے پاکستان میں جبوتی کے اعزازی قونصلر جنرل کی حیثیت سے دونوں ممالک کی نمائندگی کرنی تھی۔ یہ کانفرنس تو صرف 2 دن کی تھی مگر مدعوین کی اضافی تفریح کیلئے 2 دن ترکی کے مختلف شہروں اور عجائب گھر اور تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام تھا۔ میں گزشتہ 3 دہائیوں سے ترکی جاتا رہا ہوں۔ 98 فیصد مسلمانوں کی آبادی والے ترک باشندے ہمیشہ سے پاکستان اور پاکستانیوں سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ پہلی مرتبہ 30 سال پہلے حج کر کے جب ترکی گیا تھا جس جس ترک دوست کو معلوم ہوتا کہ میں حج کر کے آیا ہوں تو وہ بے اختیار میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر عقیدت سے ایسے چومتے تھے جیسے میں کوئی بڑا پیر ہوں۔ دراصل ہم پاکستان اور انڈونیشیا کے مسلمان عین جوانی میں حج کرتے ہیں اور ترک اکثریت زندگی کے آخری دنوں میں بڑھاپے میں میاں بیوی ایک ساتھ حج کرتے ہیں۔ ترکی کے تین بڑے شہر جس میں استنبول جس کی آبادی کراچی کے برابر 15 ملین، انقرہ 5 ملین اور ازمیر کی آبادی 4 ملین ہے۔ جو خوبصورتی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر آتا ہے۔ اس کی بھی بڑی عجیب وجہ بیان کی جاتی

ہے۔ 1923ء میں ترکی سلطنت عثمانیہ جو 6 سات سو سال سے حکومت چلا رہے تھے بادشاہت ختم کر کے عوامی جمہوریت میں تبدیل ہو گیا تھا جس کے پہلے صدر کمال اتاترک (اتاترک کے معنی ترکوں کے باپ) باقاعدہ منتخب ہوئے۔ انہوں نے بادشاہی فرمان ختم کر کے نئے معاہدے کرنے کی شرائط عائد کر دیں۔ ترکی میں قدیم یونانی باشندے ازمیر میں اکثریت میں آباد تھے۔ نئی قیادت کے خلاف واپس یونان چلے گئے اور جاتے جاتے دو تہائی شہر کی عمارتیں جو ان کی ملکیت تھیں نذر آتش کر دی گئیں جس کی وجہ سے ازمیر کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس وجہ سے جدید بلند و بالا عمارتیں، سمندر اور پہاڑوں کے اطراف میں خوبصورتی میں اضافہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف سمندر کے ساتھ ساتھ قطار در قطار رہائشی بلڈنگیں ہیں تو سمندر سے ملے پہاڑ ازمیر کو جنت نظیر بنا رہے ہیں۔ پہاڑی سلسلہ تقریباً ہمارے دریائے سوات کے کنارے شہر منگورہ جیسا لگتا ہے۔

پہلے دن ہمیں 100 کلومیٹر دور ایک قدیم شہر برگام کے شہر ایکروپولس (Acropolis) جو ہمارے ہزاروں سال پرانے کھنڈراتی شہر موہن جوداڑو اور ہڑپہ کی طرح ہے جہاں دنیا کی سب سے پرانی لائبریری اور 10 ہزار افراد کی گنجائش کا تھیٹر جو بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ ان کے بچے کھچے محلات، گرجہ گھر اور سات قدیم ترین گرجہ گھر سے بالکل ملحق مسجد دکھائی گئی۔ اس پرانی اور پہلی لائبریری کی تمام کتابیں جب مصر کی ملکہ قلوپطرہ اپنے ساتھ واپس جاتے ہوئے زبردستی لے گئی اور قاہرہ کے عجائب گھر میں وہ محفوظ ہیں۔ کچھ اسکندریہ کی سب سے بڑی لائبریری کو دے دی گئیں۔ بہت سے گرجے اور مسجد ایک دوسرے سے ملحقہ کلچر قدیم ترکی میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کی پہلی فارمیسی بھی انہی کھنڈرات میں برآمد ہوئی جس میں قدیم ترین نشان سانپ کو لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے اس عمارت پر کندہ تھا۔

دوسرے دن بھی تمام اعزازی قونصلر جنرل کو پولیس اسکاڈ میں ایفی سیس (Epheses) کے پہاڑی علاقے میں جو 120 کلومیٹر دور واقع ایک عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق جب حضرت عیسیٰ کو

پھانسی دی گئی تو بی بی مریم ان کی والدہ حضرت عیسیٰ کے پادری سینٹ جان کے ساتھ دشمنوں سے بچنے کیلئے یہاں آ گئیں اور یہیں ان کا انتقال ہوا تو ہر سال 15 اگست کو خصوصاً دنیا بھر سے عیسائی ان کی رہائش گاہ پر شمع جلانے اور گرجے کی زیارت کیلئے آتے ہیں ۔ویسے بھی یہ خوشنما پہاڑی علاقہ بہت پرسکون جگہ پر واقع ہے جہاں سال بھر عیسائی اور مسلمان سیاح دیکھنے آتے ہیں ۔یہاں پہاڑ کے نیچے ایک عجائب گھر بھی دکھایا گیا اس علاقے کی سب سے بڑی خوبی چوڑی چوڑی شاہراہیں ہیں ۔دونوں طرف شہر اور سرسبز کھیت اور باغات آباد ہیں ۔ترک اپنے قائد کمال اتاترک کی دل سے عزت اور عقیدت رکھتے ہیں جگہ جگہ ان کے خوبصورت مجسمے (Statue) لگے ہوئے ہیں ۔ترک مسلمان ہماری طرح فرقوں میں نہیں بٹے ہیں صرف شیعہ اور سنی ہیں اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں ۔لبرل مسلمان ہیں ان کی حالت بھی 25 تیس سال پہلے ہماری طرح خستہ تھی ۔ایک دوسرے سے لڑتے تھے آئے دن لڑائیاں ہوتی تھیں پھر انہوں نے اپنی پوری توجہ اپنے ملک اور عوام کی بہتری کی طرف موڑ دی ۔آج وہ 7 کروڑ انسانوں کا ملک بہت ترقی کر کے 700 ارب ڈالر ایکسپورٹ کر رہا ہے ۔ہم 16 کروڑ باشندے اپنے ہی ہاتھوں اپنے پیارے ملک کو تباہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔صرف ازمیر میں 7 یونیورسٹیز اور سینکڑوں اسکول ہیں ۔95 فیصد پڑھا لکھا ترکی آج یورپی یونین میں صرف اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ وہ مسلمان ہیں ۔اس اعزازی قونصلر کنونشن میں 48 ممالک کے قونصلر جنرل شریک ہوئے ۔تمام ممالک کے نمائندے دنیا پر بڑے بڑے امیر ممالک کی ہٹ دھرمیوں اور اپنی محرومیوں کا رونا رو رہے تھے ۔2 دن صبح شام تقاریر میں گزر گئے اس اعزازی کنونشن میں ازمیر کے گورنر بھی آئے ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا وہ اکیلے آئے ۔تقریر کی اسی طرح ان کی طرف سے دوپہر کا کھانا سادگی سے دیا گیا نہ کوئی ہل چل مچی نہ اخبار والے ان کی طرف دوڑے ۔اسی سادگی سے دوسرے وزراء بھی آئے تقریر کی ،کھانا کھایا ،فوٹو گروپوں کے ساتھ کھنچوائے ۔اس کنونشن میں سب سے

بڑا ڈیلیگیٹ پاکستان سے آیا تھا جس میں 9 اعزازی قونصلر جنرل تھے ۔دنیا بھر میں اعزازی قونصلر جنرلوں کو بہت سی مراعات ملتی ہیں خصوصاً 35 ممالک میں تو اعزازی قونصلروں کو غیر ملکی ڈپلومیٹ والی مراعات ملتی ہیں مگر پاکستان دنیا کا شاید واحد ملک ہے جہاں صرف پروٹوکول ملتا ہے کوئی مراعات نہیں ۔1972ء میں پی پی پی کی جب حکومت آئی تو اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) نے تمام اعزازی قونصلر جنرل کی مراعات یکدم ختم کر دیں ۔آج ہمارے ملک کی موجودہ صورتحال کے پیش نظر صرف 25 فیصد غیر ملکی قونصلر جنرل اور ایمبیسڈر رہ گئے ہیں ۔75 فیصد ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں اگر یہ صورتحال بہتر نہ ہوئی تو بقایا بھی سیکورٹی کے ڈر سے چھوڑ جائیں گے ۔موجودہ حکومت کو چاہیے کہ تمام اعزازی قونصلر کی واپس لی جانے والی مراعات اور ان کو غیر ملکی قونصلروں کی طرح اعزازات بحال کرے جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق دیگر ممالک میں رائج ہیں ۔ترکی کی ترقی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ترکش ایئر لائن کو ہماری قومی ایئر لائن PIA نے بنا کر دی تھی ۔آج ان کے پاس PIA سے 20 گنا زیادہ ہوائی بیڑہ ہے ۔وہ دنیا کے 160 شہروں میں آ جا رہی ہیں ۔دنیا کے تمام ایئر لائنز ان کے شہر میں آ جا رہی ہیں ۔یورپ، امریکہ، کینیڈا سے ایک بھی غیر ملکی فلائٹ نہ پاکستان آتی ہے نہ یہاں سے جاتی ہے جبکہ کراچی دنیا میں سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہوتا تھا جو مغرب اور مشرق کو ملاتا تھا ۔یہاں سے گزرے بغیر کوئی ایئر لائن مکمل نہیں ہوتی تھی ۔سب کے دفاتر یہاں قائم تھے آج ان کے پاکستانی ایجنٹ صرف بکنگ کرتے ہیں ۔ہے کوئی جو اس طرف بھی توجہ دے؟

سب سے بڑی لندن میں واردات

اس وقت میں لندن کی سب سے بڑی شاپنگ اسٹریٹ گھوم رہا ہوں ۔جس کا نام بونڈ (Bond Street) ہے ۔یہ سنٹرل لندن کی سب سے مہنگی شاپنگ مارکیٹوں میں شمار ہوتی ہے ۔جہاں دنیا بھر سے سیاح آ کر ان بڑی بڑی دکانوں سے شاپنگ کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں ۔ان میں سلے سلائے سوٹ ،جیولری، کاسمیٹکس ،گھڑیاں اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی بھرمار ہے ۔ایسا لگتا ہے شاید یہاں مفت سامان فروخت ہوتا ہوگا۔مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے یہاں تو دام پوچھنا بھی اس علاقے کی ہتک سمجھی جاتی ہے ۔صرف دیکھیں ،پسند کریں اور پیک کروا کر اپنا کریڈٹ کارڈ دیں اور باہر آجائیں یہی آپ کے امیر ہونے کا بھرم ہے ۔چاروں طرف اس کے ٹیوب اسٹیشن (انڈر گراؤنڈ ٹرینیں) ہیں اگر آپ نے سنٹرل لندن میں شاپنگ نہیں کی تو سمجھیں آپ ٹورسٹ نہیں بلکہ مقامی باشندے ہیں مقامی باشندے یہاں خریداری نہیں کرتے کیونکہ یہاں سب سے مہنگے داموں میں مال فروخت کیا جاتا ہے اس کے آگے پیچھے تھیٹرز مادام تساؤ کا عجائب گھر ،سینموں ،سینما گھر الغرض ہر تفریح مہیا ہوتی ہے ۔کھانے کے طرح طرح کے ریسٹورنٹس صبح سے لے کر رات گئے تک کھلے رہتے ہیں ۔اسی بازار میں ایک بہت بڑی جیولری کی دکان بھی واقع ہے جس میں اربوں روپے کے سونے کے زیورات اور ڈائمنڈ ، جم طرح طرح کے قیمتی پتھروں کا اسٹاک ہوتا ہے ۔آج اُس دکان سے کافی

دور تک پولیس نے گھیراؤ ڈالا ہوا تھا کوئی بھی آگے نہیں جا سکتا تھا بھیڑ تھی کہ بڑھتی چلی جا رہی تھی ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا کوئی کہہ رہا تھا شاید آگے ٹریفک کا ایکسیڈنٹ ہوا ہوگا ۔کسی کا خیال تھا کہ کوئی دہشت گرد پکڑا گیا ہوگا ۔کسی کو آگے جانے کی اجازت نہیں تھی صرف پولیس کی گاڑیاں ایمبولینس آ جا رہی تھیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا واقعہ ہوا ہے جو اتنی بھیڑ زدہ علاقے میں پولیس نے گھیراؤ کیا ہوا ہے ۔ہم صرف گھومنے نکلے تھے لہٰذا گلیوں سے گزر کر آگے بڑھ گئے ۔شام کو جب واپس اُس علاقے سے پھر گزرے تو اُس جیولری کی دکان کے باہر لوگ جمع تھے ۔پولیس اور ایمبولینس واپس جا چکی تھیں پوچھنے پر معلوم ہوا صبح صبح اس دکان پر بہت بڑا ڈاکہ پڑا ۔دو نہایت خوش پوش نوجوان سوٹ بوٹ پہنے ہوئے آئے سیلز مین اُن کے قیمتی کپڑوں سے اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ یقیناً ارب پتی ہونگے انہوں نے مہنگے مہنگے سونے کے زیورات ڈائمنڈ زقیمتی پتھر پسند کئے اور جب سب جمع کر کے انہوں نے جیب سے پستولیں نکالیں تو سیلز مینوں کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دیا دھمکی دی خبردار اگر کسی نے ہلنے یا اُن کو روکنے کی کوشش کی تو وہ جان سے ہاتھ دھو لے گا ۔سیلز مین گھبرا گئے وہ ایسی واردات کے عادی نہیں تھے نہ انہوں نے ایسی واردات کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی کیونکہ یہ دکان تمام کیمروں اور آہنی دروازوں سے لیس تھی ۔بہر حال وہ دونوں خوش پوش نوجوانوں نے زمین پر اُس پستولوں سے فائر کئے اطمینان سے دروازے کھولے باہر نکلے اُن کی گاڑی اُن کا انتظار کر رہی تھی بیٹھے اور یہ جا اور وہ جا یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس سڑک پر گاڑی کھڑے کرنے کی اجازت نہیں ہوتی کیسے یہ واردات ہوئی کس نے اس میں حصہ لیا کیونکہ جب تک اُس دکان کا کوئی فرد ملوث نہ ہو یہ واردات نہیں ہو سکتی ۔اس واردات کی داستان دوسرے دن کے اخبار میں شائع ہوئی تمام ٹی وی چینلز سے اُن دونوں کے خاکے اور فوٹیج بار بار دکھائی جا رہی تھی کیسے وہ اندر داخل ہوئے کیسے انہوں نے سامان پسند کیا جمع کیا پھر پستول دکھا کر باہر آ گئے اس سامان کی مالیت 65 ملین پاؤنڈ یعنی 100 ارب روپے بتائی جاتی ہے جو

صرف آدھے گھنٹے کی واردات میں ہوئی سب سے اصل بات یہ تھی کہ پولیس نے بڑے فخر سے کہا کہ اس واقعہ میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔اسکاٹ لینڈ پولیس اس پوری واردات کی تفتیش کر رہی ہے کیونکہ یہ لندن میں ہونے والی ڈکیتی کی سب سے بڑی واردات ہے اور بظاہر حلیے اور بات چیت سے یہ بھی معلوم کیا گیا کہ اس واردات میں مقامی افراد ملوث ہیں اور وہ بہت جلد وہ قانون کے شکنجے میں آجائیں گے اب جگہ جگہ ان کے فوٹو پوسٹر لگائیں گے عوام سے انہوں نے اپیل کی ایسے حلیے کے افراد جہاں بھی ہوں پولیس اسٹیشن مطلع کریں ابھی تک اُن کی گرفتاری پر کوئی انعامی رقم کا اعلان نہیں ہوا ہے۔پولیس حیران ہے اتنے حفاظتی اقدامات کے ہوتے ہوئے یہ دونوں نوجوان کیسے دیدہ دلیری سے واردات کرنے میں کامیاب ہو گئے یقیناً انہوں نے بہت باریک ماسک پہنے ہونگے ان کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ اُن کی تمام حرکات وسکنات سیکنڈ ٹو سیکنڈ کیمروں میں محفوظ ہو رہی ہوگی چند ہی منٹ بعد پولیس حرکت میں آئے گی میڈیا کو کہانی ملے گی۔عوام حیرت زدہ ہونگے پھر وہ کہاں چھپیں گے۔گاڑی کا نمبر تو فوراً ہی پتہ چل جائے گا۔لندن کی عوام ہمیشہ پولیس سے تعاون کرتی ہے کیونکہ لندن پولیس عوام کا بڑا احترام کرتی ہے۔پاکستان اور بھارت کی پولیس بتانے والے کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ شاید یہ کوئی ڈرامہ کر رہا ہو مگر وہاں ایسا نہیں ہوتا۔

جس وقت میں صبح کے لندن والے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا خدا کی قدرت اُس میں ایک خبر اور چھپی تھی کہ لندن پولیس نے 40 سال پرانی لندن کی سب سے بڑی ٹرین ڈکیتی کے مجرم کو انسانی ہمدردی میں رہا کر دیا کیونکہ اُس کو ڈاکٹروں نے کینسر کا مریض قرار دیتے ہوئے بتایا وہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے کینسر آخری اسٹیج تک پہنچ چکا ہے اس شخص نے 10 سال پہلے باوجود اس حقیقت کہ لندن پولیس ٹرین ڈکیتی کیس کے کسی بھی مجرم کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔اس مجرم نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا تھا۔اس کو 40 سال کی سزا سنائی بھی گئی مگر صرف 10 سال بعد انسانی ہمدردی آڑے آگئی اور وہ رہا

ہو گیا۔نہ جانے یہ لندن جیولری ڈکیتی کے مجرم کب پکڑے جائیں گے کیونکہ یہ بھی لندن کی تاریخ میں سب سے بڑی ڈکیتی ہے۔سوچئے اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اس واردات میں ملوث ہوتا تو ؟ یہ ہم مسلمانوں کیلئے ایک سبق ہے سوچئے؟

﴿لندن کا افسوس ناک واقعہ﴾

آج سے 36 سال قبل پہلی مرتبہ لندن جانے کا اتفاق ہوا۔جون کا مہینہ تھا۔پاکستان میں سخت گرمی تھی۔لندن ائیر پورٹ پر اترا تو سخت سردی تھی۔جہاز میں میری سیٹ کے ساتھ ایک پاکستانی سے ملاقات ہوئی جس کا تعلق آزاد کشمیر سے تھا۔وہ لندن سے باہر مضافات میں رہائش پذیر تھا۔فلائٹ میں تقریباً آٹھ گھنٹے میں اس سے دوستی ہوگئی جب لندن ائیر پورٹ آیا تو اس نے پوچھا لندن میں کہاں رہو گے تو میں نے بتایا کہ فی الحال کسی ہوٹل میں قیام کرونگا تو اُس نے اپنے گھر پر رہنے پر اصرار کیا۔میں لندن سے بالکل ناواقف تھا سوچا چند دن اُس کے گھر رکنے کے بعد لندن شہر میں منتقل ہو جاؤنگا۔لہٰذا اُس کے گھر ٹھہرا وہ صبح 7:00 بجے اپنے گھر سے جاتا اور رات گئے تک واپس آتا۔سارا دن اکیلے رہنے سے میں بور ہوگیا۔میرا قیام نیچے والے کمرے میں تھا۔جس کے ساتھ ڈرائنگ روم تھا اُس کے بیوی بچے اوپر کے حصے میں مقیم تھے جو سکول چلے جاتے تھے۔بیوی بھی سروس کرتی تھی۔بچے اسکول سے واپس آکر میرے لئے کھانا نیچے لاتے تھے میرے ساتھ کھا کر دوبارہ اپنی پڑھائی میں لگ جاتے تھے۔مکان کی چابی میرے پاس تھی لہٰذا میں بھی مضافات کی سیر کرتا مگر اکیلے۔خیر پھر ویک اینڈ (Weekend) آیا اس کے ساتھ 2 دن تک لندن کی سیر کی بہت صاف ستھرا شہر تھا۔لوگ بہت اچھے صاف ستھرے ذہن رکھنے والے تھے جس سے بھی ملاقات ہوتی وہ بہت مزے سے پوچھتا ہمارا

لندن کیسا لگا؟۔میرا جواب ہوتا بہت خوبصورت،میرا دوست دن میں 2 ڈیوٹیاں کرتا تھا لہٰذا عام دنوں میں تو اُس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔لہٰذا ایک ہفتے کے بعد میں اپنے کاروباری کام کے سلسلے میں لندن سے چلا آیا۔اس کے بعد سینکڑوں مرتبہ آنا جانا لگا رہا لندن اور لندن میں رہنے والوں جن میں میرے پاکستانی،انڈین اور مقامی لوگ تھے ہمیشہ گرمجوشی سے مجھ سے ملتے اور روایتی طریقے سے کھانوں کی دعوت دیتے۔

ان 36 سالوں میں اُن کے رہنے سہنے کے طریقوں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوا۔وہی گلیاں،سڑکیں، بسیں ٹیوب اسٹیشن،گھر،دکانیں،99 فیصد ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ برطانیہ کے لوگ اپنے روایتی طور طریقے بدلنے کیلئے تیار نہیں تھے یہی وجہ تھی کہ جو بھی ایک مرتبہ اپنے ملک کو چھوڑ کر لندن آیا میں نے نہیں سنا کہ وہ واپس اپنے اپنے ملک میں آباد ہونے گیا ہو۔البتہ اپنے رشتہ داروں،عزیزوں سے یا تو ملنے گیا یا پھر ان کو بھی لندن میں آباد کر دیا۔اب تو وہ اپنے خاندان کے خاندان آباد کر چکا ہے۔ بہت سے تو اب دادا اور نانا بھی بن چکے ہیں اُنکی اولادوں کی اولادیں ہو رہی ہیں مگر اس دفعہ جب میں لندن آیا ہوں تو لندن اور اس کے باشندے بہت مغموم ہیں۔دو مرتبہ اس شہر میں صرف دو ہفتوں میں بم دھماکے ہو چکے ہیں۔پہلے دھماکے میں 56 افراد جاں بحق ہو چکے ہیں۔دوسرے دھماکے میں ایک شہری ہلاک ہوا ہے مگر جو سکون لندن شہر کا لازم وملزوم حصہ تھا وہ اب بے بسی کا شکار تھا۔پہلی مرتبہ مقامی پاکستانیوں کا نام بم دھماکے میں سننے میں آیا جو بہت ہی افسوس ناک تھا۔جس نے بھی لندن شہر کے سکون کو برباد کرنے کی کوشش کی اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کیلئے شر پسند عناصر ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔

ایشین جن میں مسلمان شامل ہیں وہ الگ پریشان ہیں کہ کس نے اُن کا سکون برباد کر کے اُنہیں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے اور مقامی انگریز اپنی جگہ الگ پریشان ہیں کہ ہم نے اپنے روایتی بھائی چارگی

میں باہر سے آنے والوں کو پناہ دی۔روزگار فراہم کیا اگر روزگار نہ ملا تو انہیں بے روزگاری الاؤنس دیا دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر زندگی گزار رہے تھے۔گرجے،مندر اور مسجدوں میں بھی تبدیل ہوئے مسلمانوں نے کھل کر تبلیغ کی اپنے اپنے مدرسے،اسکول کھولے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔گھر خریدے برطانیہ کی شہریت تک اُن کو ملی جس کی وجہ سے آج وہ دنیا میں بغیر ویزے سفر کر سکتے ہیں۔یہ مقامی شہریت صرف چند سال کی رہائش کے بعد ہی اُن کو مل گئی جبکہ ہمارے تمام اسلامی خلیجی ملکوں میں 20 تیس سال کے بعد بھی نہیں مل سکتی نہ صرف ایک فرد کو بلکہ سارے کے سارے خاندان کو شہریت دی جو آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

انہوں نے ہمیں اپنی ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لینے دیا۔ہمارے MPA اور MNA پارلیمنٹ سے منتخب کرائے۔یہاں تک کہ آج مانچسٹر کا لارڈ میئر پاکستانی ہے۔انہوں نے کبھی عصبیت پر یقین نہیں رکھا۔رنگ ونسل سے بالاتر ہو کر ہمیں اپنے ملک کے ہر پہلو میں حصہ لینے دیا۔یہ ایک منفرد مثال ہے جو آج تک جاری ہے۔اُن میں ابھی تک نفرت کی کوئی لہر نہیں اُٹھی۔

البتہ 36 سال قبل کوئی ویزہ نہیں تھا۔لندن ائیر پورٹ پر ہی ویزہ مل جاتا تھا اب پیشگی ویزہ لینا پڑتا ہے جو با آسانی مل جاتا ہے۔پڑھائی کا ویزہ بھی با آسانی ہمارے مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو مل جاتا ہے۔ مگر اب جبکہ دلوں میں مسلمانوں کیلئے بال آچکا ہے کل کیا ہوگا یہ سوچنے اور سمجھنے کیلئے تمام مسلمانوں کو تیار رہنا ہوگا۔ابھی تک اگرچہ حتمی معلومات نہیں میسر ہوسکی ہیں کہ ان بم دھماکوں میں ثبوت مشکوک ہیں کیونکہ ہلاک ہونے والوں میں سے ایک لڑکا زندہ ہے۔

القاعدہ کا نام بھی آرہا ہے۔ہمارے صدر مشرف صاحب نے بھی پُرزور الفاظ میں پاکستانیوں کے تعلق کو منحرف الزام قرار دیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں اس دہشت گردی کی مذمت بھی کی ہے جس سے یہاں کے پاکستانیوں کو حوصلہ ملا ہے مگر جب تک بم دھماکے کے اصلی ملزمان گرفتار نہیں ہوتے خصوصاً

پاکستانیوں میں بے چینی یقینی امر ہے۔ممکن ہے کہ یہاں رہنے والے بھارتی اس کو اور ہوا دیں پھر لندن کی فضاء مشکوک ماحول میں تبدیل ہوسکتی ہے۔پاکستانی کمیونٹی اور مسلم کمیونٹی کو چاہیے کہ مل کر اس کا حل نکالیں اور جس نے بھی اس امن کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے مقامی انگریز کمیونٹیوں کے ساتھ شانہ بشانہ اس کا سراغ لگا کر اصلی مجرموں کو بے نقاب کریں اور ان کے غم میں شریک ہو کر یہ ثابت کریں کہ اصولی طور پر اسلام دہشت گردی کے خلاف ہے وہ مسلمان ہو نہیں سکتا جو دہشت گردی کو ہوا دے یہ صرف اور صرف دہشت گرد ہوسکتا ہے جس کا دین اور دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔دہشت گرد صرف دہشت گرد ہوتا ہے خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔مسلمان اپنی مساجد میں دہشت گردی کے خلاف باقاعدہ تقاریر کریں اور بتائیں کہ اسلام حرام موت خواہ وہ خودکشی ہو یا خودکش حملہ ہو دونوں صورتوں میں حرام ہے اور گمراہ کن پروپیگنڈے سے مسلمان دور ہیں تاکہ برطانیہ کی حکومت اور عوام دونوں یہ سمجھیں کہ چند لوگوں کی غلطی سے لاکھوں مسلمانوں کو اجتماعی نقصان نہ پہنچے۔اپنے اپنے انگریز دوستوں کو کھل کر بتائیں کہ شر پسند ہر مذہب میں ہوتے ہیں انہیں ہر طرح کا تعاون کا یقین دلائیں اور جو بھی اس امن کو خراب کرنے کے درپے ہیں اس کو بے نقاب کرا کر اپنا فرض ادا کریں۔ہمارے علمائے کرام خصوصی طور پر مقامی پادریوں سے ملیں اور ان کو یقین دلائیں کہ اسلام امن کا درس دیتا ہے۔ اگرچہ چند افراد افغانستان اور عراق کے ردعمل کا شکار ہو کر ایسی غلطی کر بیٹھے ہوں جو ان کا انفرادی فعل ہے اگر ایسا خلوص دل کے ساتھ نہ کیا گیا تو پھر مقامی انگریزوں میں پاکستانیوں کے ساتھ بالخصوص اور تمام مسلمانوں کے ساتھ بالعموم نفرت کی آگ بھڑک سکتی ہے اُن کا اور انکے بچوں کا مستقبل بھی خطرے میں پڑسکتا ہے۔جس طرح امریکہ میں 9/11 کے بعد اب حالات واپس نارمل ہو رہے ہیں لندن میں بھی نارمل ہو جائیں گے۔مگر تمام مسلمانوں کو بہت ہوشیاری سے مجرموں کو بے نقاب کرنا ہوگا۔یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ 2012ء کیلئے اولمپک کا شہر لندن جو سب سے زیادہ پرسکون مانا جاتا تھا صرف چند دن

کے اعلان کے بعد ہی افراتفری کا شکار ہو گیا۔اخبارات اور ٹی وی کے مطابق صرف جولائی میں 10فیصد سیل گر چکی ہے اور 12 سالہ ریکارڈ ٹوٹ چکا ہے۔

لندن کے شہری ٹیوب اسٹیشن اور بسوں میں سفر سے کترا رہے ہیں۔اللہ لندن کو نظر بد سے بچائے۔ یہاں تو ہر ملک کا باشندہ آسانی سے رہتا ہے۔یہ یورپ کا واحد شہر ہے جہاں آپ کو تمام ممالک کا کلچر اور ریسٹورنٹس با آسانی ملتے ہیں۔بھائی چارہ کا گلدستہ لندن شہر کو کہہ سکتے ہیں۔مسلمانوں کو جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔لندن والوں کو لندن کا سکون بحال کروا کر اپنا فرض ادا کریں تا کہ اس شہر میں بد امنی کی فضاء ختم ہو سکے اور یہاں معمول کے مطابق لوگ ایک بار پھر سکون کی زندگی گزار سکیں۔

﴿اس کالم کو کیا عنوان دوں؟﴾

پیرس سے 125 کلومیٹر دور ایک گاؤں میں جس کا نام چارل ولا (Charleville) میں کسی نے ایک کتے کو نشے کی چیز کھلا کر بے ہوش کر کے ایک جھیل کے کنارے زمین میں گڑھا کھود کر دفنا دیا۔خوش قسمتی سے ایک شخص وہاں سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ زمین کے اندر کوئی چیز ہل رہی اور زمین کے اندر سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی ہیں۔اس نے پولیس کو اطلاع دی،پولیس کی گاڑیاں اور ریسکیو والے اس حادثے کی جگہ پہنچے اور کھدائی کر کے مٹی ہٹائی تو اس گڑھے سے ایک نیم مردہ کتا نکالا اور فوراً اس پر سے مٹی ہٹا کر گرم پانی سے اس کو نہلایا کتا نیم غنودگی کی حالت میں ٹھنڈا ہو چکا تھا۔غالباً وہ باہر نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اس کو جانوروں کے ہسپتال لا کر گرمائش دی گئی جس کے بعد کتے کو ہوش میں لایا گیا جو بہ مشکل سانس لے رہا تھا۔کچھ دیر کے بعد کتے نے انگڑائی لی اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔یہ اس کتے کی اپنی کوشش کام آئی اس نے ہوش میں آنے کے بعد ہاتھ پاؤں چلائے جس سے گڑھے میں ہل چل دیکھی گئی اور اس کتے کی جان بچ گئی۔یہاں تک قصہ ختم نہیں ہوا پولیس نے اس کتے کی زنجیر نمبر سے اس کے مالک کا پتہ چلایا اس کے مالک نے بتایا کہ اس نے کتا معمول کے مطابق کھولا تھا مگر وہ واپس نہیں آیا۔پولیس کو مالک پر شک ہے کہ جب کتا واپس نہیں آیا تو اس نے پولیس کو کیوں اطلاع نہیں دی۔اب وہ ضروری معلومات جمع کر رہی ہے کہ کہیں اس کے مالک

نے یا پھر کسی نے دشمنی میں اس کو بے ہوش کر کے دفن کر نہ دیا ہو۔موقع پر موجود لوگوں نے اس کی جان بچ جانے پر بہت خوشی کا اظہار کیا پھر مختلف ٹی وی چینلز والوں نے اس کہانی کو اپنے سامعین کو دکھایا، انہوں نے پولیس کی کارکردگی کو سراہا۔مغرب میں انسانوں کی نہیں جانوروں، پرندوں حتیٰ کہ درختوں تک کی حفاظت کی جاتی ہے اور خصوصاً ان کی حفاظت کے لئے الگ الگ سخت قوانین بنائے گئے ہیں۔ ان کی سخت سزائیں ہی ہیں کہ اگر ایک درخت کو کاٹ دیں تو پولیس اور انتظامیہ حرکت میں آجاتی ہے اور اس کا باقاعدہ چالان کیا جاتا ہے۔

پچھلے سال راقم ایک رات کینیڈا میں کھانے کے بعد واپس گھر آرہا تھا، راستے میں چند پولیس کی گاڑیوں نے سڑک بلاک کر رکھی تھی معلوم ہوا کہ کھیتوں سے ایک بڑا ہرن نکل کر سڑک کراس کر رہا تھا ایک گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا۔گاڑی والے نے پولیس کو موبائل سے اطلاع دی۔جانوروں کے ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور پولیس والے اطلاع دینے والے سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔کہیں اس کی گاڑی کی رفتار تیز تو نہیں تھی کیونکہ سڑک کے کنارے بورڈ لگا تھا کہ ہرن سڑک پر آسکتا ہے لہٰذا گاڑی آہستہ چلائیں۔یعنی بورڈ پر ہرن بنا ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست نے جو امریکہ میں رہتے ہیں ان کی اہلیہ رات کا بچا کچا کھانا جمع کر کے گھر کے سامنے پارک میں کبوتروں کو ڈال دیتی تھیں۔کچھ دن بعد بہت سارے کبوتر جمع ہو گئے ایک دن وہاں سے پولیس کی گاڑی کا گذر ہوا تو پولیس والے اتر کر وہاں پہنچے اور ان کی اہلیہ سے پوچھا کہ یہ کھانا کیوں کھلا رہی ہیں کیا ضمانت ہے کہ اس کو کھا کر کبوتر بیمار یا مر نہ جائیں کون ذمہ دار ہوگا؟ ان کی اہلیہ نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تھا مگر پولیس مطمئن نہیں ہوئی ان کا چالان کر دیا۔ایسا کرنا جرم ہے بعد میں عدالت نے ان کو معمولی جرمانہ کر کے وارننگ دی کہ خبردار آئندہ یہ بچا کچا کھانا یا پکے ہوئے چاول ڈالنا خلاف قانون ہے۔صرف وہی کھانا کھلائیں جو سیل پیک ہو اور جانوروں کے لئے بنا ہوا ہو۔اسی طرح جھیلوں

، دریاؤں میں بھی مچھلیوں کو دیگر کھانے ڈالنے کی ممانعت ہوتی ہے۔اسی طرح اگر سمندر سے کوئی مچھلی یا جانور نکل آئے اور مرنے لگے تو آپ کو چاہئے کہ فوراً پولیس کو اطلاع کریں۔آپ نے اس سے غفلت برتی تو آپ کو سزا ہو سکتی ہے۔اسی طرح یہاں مچھلی کا شکار بغیر لائسنس کرنا بھی جرم ہے اور آپ ایک لائسنس پر صرف 3 مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں۔اگر آپ زیادہ پکڑیں گے تو آپ کو واپس کانٹے سے نکال کر دریا یا سمندر میں جہاں سے آپ پکڑ رہے ہیں واپس ڈالنا ہوگی۔گویا مچھلیوں کی نشوونما جاری رکھنا بھی ضروری ہے۔

جرمنی میں میرے ایک دوست نے گھر میں چڑیاں پالی ہوئی تھیں اور ان سب کے الگ الگ نام رکھے ہوئے تھے۔وہ جس چڑیا کا نام لیتا وہ پنجرے کے تاروں پر آکر اپنا دانہ کھاتی تھی۔اس نے بتایا کہ اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر چلی گئی لہٰذا وہ فرصت کے اوقات ان چڑیوں کے ساتھ گذارتا ہے۔مزے کی بات کہ میں اس جرمن دوست کی اتوار کی دعوت پر مدعو تھا کہ 2 چڑیاں آپس میں لڑ پڑیں اور ایک کی چونچ ٹوٹ گئی اس نے کھانا چھوڑا اور کہنے لگا کہ دوست تم گھر پر کھانا کھاؤ میں اس کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی میں نے کہا کہ میں بھی چلتا ہوں۔گاڑی سے ہم ایک چھوٹے سے پرندوں کے ہسپتال اس کو پنجرے میں ہی لے گئے وہاں ڈاکٹر نے باقاعدہ آپریشن کر کے اس کی چونچ لگائی اور الگ پنجرے میں بند کر کے واپس کی اور آپریشن کی باقاعدہ فیس وصول کی جو کئی ہزار روپوں میں تھی۔میں نے اس کو کہا کہ اس چڑیا کو کیوں نہیں اڑا دیا اس رقم سے تو ایک درجن نئی چڑیا مل سکتی تھیں۔اس نے منہ بنا کر کہا کہ تم کیسے انسان ہو جو پرندوں کی جان کو جان نہیں سمجھتے میرے پاس اس بات کو کوئی جواب نہیں تھا۔

یہ تمہید لکھنے کا مقصد آج کے اخبارات میں پڑھا کہ ایک شخص ایک قیمتی جانور قربانی کے لئے خرید کر اپنے گھر لایا تو اس کو پرچی ملی اس نے نظر انداز کر دی۔دوسرے دن اس کے جانور کو گولیاں ماردی گئیں کسی

نے کوئی کاروائی نہیں کی ۔حکومت سندھ کو سپریم کورٹ کی لارجر بینچ نے ایک ساعت کے دوران ریمارکس دیئے کہ لوگ قربانی کا جانور بھتہ کے ڈر سے نہیں لا رہے ہیں قانون کیا کر رہا ہے۔پورا کراچی روز 10 بارہ افراد کی جان لے رہا ہے ذرا غور کریں کہ اسلام مسلمان کی جان کو خانہ کعبہ سے بھی بڑھ کر محترم قرار دیتا ہے۔یہ کون مسلمان ہے جو اس کو کھلونا سمجھ کر توڑ رہا ہے پولیس صرف تماشائی بن چکی ہے کیا عمران خان،نواز شریف،مولانا فضل الرحمٰن کو کراچی کے باشندوں کا دکھ،درد نہیں لگتا۔کیا یہاں کے تاجر لاوارث ہو چکے ہیں ان کی آواز کوئی نہیں سنتا۔وہ اپنے اپنے کاروبار بند کرنے پر مجبور ہیں عید سر پر ہے۔وزیر اعلیٰ سندھ عملی طور پر غیر فعال ہیں بھتہ خوری، دہشت گردی،قتل و غارت گری اپنے عروج پر ہے،سیاستدان صرف کرسی کی جنگ میں مصروف ہیں۔انہیں اگلے الیکشن کی فکر ہے اس صوبے کے عوام پر کیا گذر رہی ہے اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہے۔تاجر نقل مکانی کر رہے ہیں،صنعتکار ملک سے باہر جا رہے ہیں،دیار غیر کے پاکستانی بڑے دکھ والم کے ساتھ اس ملک کی تباہی کو دیکھ کر کڑھ رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ عید خیر سے گذر جائے اس کالم کو لکھ کر اپنا غم ہلکا کر رہا ہوں کیونکہ میں بھی دیار غیر میں عید منانے آیا ہوں۔یہاں کے پاکستانی مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے ملک کا کیا ہوگا؟

﴿مراکش اور اسپین میں مسجد قرطبہ کی سیر﴾

ہر سال دسمبر کے مہینہ میں اکثر یورپ برف باری اور سیر و تفریح کے لئے معہ اپنی فیملی جاتا رہا ہوں یہی پروگرام سیٹ ہو چکا تھا تو ہمارے دوست اشتیاق بیگ قونصل جنرل مراکش اور اختیار بیگ قونصل جنرل برائے یمن جو FPCCI کے نائب صدر بھی ہیں۔ان دنوں مراکش میں بریانی فیسٹول کر رہے تھے،ان کا کہنا تھا کہ افریقہ میں پاکستانی اشیاء با آسانی فروخت کی جا سکتی ہیں۔ایک 5 روزہ پروگرام ہمارے ایمبیسیڈر جناب حامد اصغر خان صاحب پاکستانی ایمبسی کے تعاون سے تشکیل دے رہے ہیں۔اس میں بہت سے پاکستانی ادارے اسکول اور ہوٹل کے مالکان مراکش میں اپنا کاروبار بڑھانے کے لئے جا رہے ہیں۔مراکش کے چیمبر آف کامرس اور دیگر مراکش حکومت کے ایکسپورٹ پروموشن والوں کے تعاون سے اور دونوں مسلمان ممالک کے فائدے کے لئے ایک کوشش کی جا رہی ہے،تاکہ دونوں ممالک کے ادارے آپس میں اس کو فروغ دیں،تاکہ ہم آپس میں کاروبار بڑھا سکیں اس کے لئے صرف 50 ہزار روپے پاکستان میں مراکش ایمبسی میں جمع کرا دیں۔وہ مراکش میں آنے جانے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر میں ٹرانسپورٹ کی سہولیات فراہم کر سکیں۔تمام آنے جانے اور ٹھہرنے کے اخراجات خود ادا کرنے ہونگے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ رباط چیمبر آپ کامرس میں ایک میٹنگ بھی پیشگی تشکیل دی جا رہی ہے،تاکہ دونوں پارٹیاں آپس میں مل کر اس کو عملی جامعہ پہنائیں۔

اس طرح تمام کمپنیوں کا ڈیٹا بھی لے لیا گیا۔سیمپل وغیرہ لیٹریچرز، کیٹلاگ بھی ساتھ لے جانے کی ہدایت کی اور اس طرح کراچی سے ہم کا سابلانکا کے لئے براستہ دبئی روانہ ہو گئے۔دبئی سے 8 گھنٹے کی مسافت طے کر کے کا سابلانکا پہنچے وہاں سے ان دونوں بیگ برادران کی سربراہی میں کوچ کے ذریعے رباط ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت میں لگے، اپنے ہوٹل پہنچے، جس کی تفصیل جناب اشتیاق بیگ صاحب اپنے کالم میں لکھ چکے ہیں۔رات ہم کو محترم جناب حامد اصغر خان صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر پُرتکلف عشایہ دیا، دوسرے دن ہم رباط چیمبر آف کامرس کے دفتر پہنچے، ہمارا بہترین طریقے سے استقبال خود ان کے صدر اور چیمبر کے عہدیداران نے کیا۔ہمارے ایمبیسیڈر صاحب بھی بنفس نفیس موجود تھے۔ دونوں طرف سے تقاریر ہوئیں۔ ہمارے ایمبیسیڈر صاحب نے اس کاروباری مشن سے آگاہ کیا۔ بیگ برادران نے بھی تفصیلی نقطہ نظر پیش کیا، جواب میں ان کے صدر نے بھی اس مشن کو سراہا۔تقاریر ختم ہوئیں تو پرتکلف ظہرانہ مراکشی کھانے، سلاد، سوپ پیش کئے گئے۔اس میٹنگ میں پاکستانی افراد جن کا تعلق ادویات، کاسمیٹکس کمپنیوں، سرکاری ٹھیکیدار، سیمنٹ کے ادارے، اسکول، یونیورسٹی، رائس ایکسپورٹرز، فرنیچر، کھیل سپلائر، ٹیکسٹائل، گلوز، کنسٹرکشن، آئی ٹی، ماربل، آئل سے تھا شریک ہوئے۔بعد میں مقامی اداروں سے آئے ہوئے افراد سے میٹنگ ہوئیں، مگر اس میں اکثریت خود ایکسپورٹرز نکلے جو اپنی اشیاء بیچنے کے لئے آئے تھے۔اس وجہ سے ان میٹنگوں سے کسی بھی پاکستان ادارے کو کوئی آڈر نہیں ملے نہ اشتراک ہو سکا جس سے ہم سب بہت نا امید ہوئے۔البتہ یونیورسٹی اور ہوٹل کے لئے انہوں نے امیدیں دلائی تھیں وہ بعد میں معلوم ہوگا۔حکومتی وعدے اکثر MOU تک محدود رہ جاتے ہیں۔دوسرے دن انہوں نے Export پروسیسنگ زون دکھایا اپنی 300 کلومیٹر بجلی کی ٹرین میں بھی سیر کرائی۔اس کو ایک تفریحی دورہ تو کہہ سکتے ہیں کاروباری ہرگز نہیں بن سکا۔کا سابلانکا اور مراکش شہر کی بھی سمندری تفریحی گاہیں بہت خوبصورت تھیں۔ہوٹل اور مالز کی بھی بھرمار تھی۔جس میں دنیا بھر کی

اشیاء دستیاب تھیں۔سالانہ تقریباً 10 لاکھ ٹورسٹ مراکو ہر سال دنیا بھر سے آتے ہیں۔خصوصاً گرمیوں میں ان کے سمندری ساحل بھرے ہوتے ہیں۔عربی اور یورپین کھانوں سے ٹورسٹ لطف انداز ہوتے ہیں مراکو سے نکل کر ہم اسپین کے شہر بارسلونا پہنچے، بارسلونا بھی سمندر کے کنارے پر خوبصورت تفریحی گاہ ہے، اگرچہ اسپین اس وقت ریسیشن سے گزر رہا ہے، پھر بھی ٹورسٹوں کے لئے بہت Attraction ہے۔خاص طور پر ایک بہت بڑا بازار جس کا نام RAMBLA ہے۔جو ہزاروں چھوٹی بڑی دوکانوں سے بھرا پڑا ہے۔یہاں بہت پرانے نامی گرامی کھانوں کے ریسٹورنٹس ہیں جو 100 سال پرانے ہیں، بہت سی دوکانوں کے مالکان کا تعلق پاکستان سے ہے۔اگر آپ اس رامبلا اسٹریٹ پر نہیں گئے تو سمجھیں آپ نے اسپین کی پرانی ثقافت نہیں دیکھی۔ایک بہت قدیم گرجا گھر ہے جس کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔بہت خوبصورت اور بیچ شہر میں واقع ہے۔یہ تاریخی چرچ 1832 میں تعمیر ہوا تھا، اس چرچ کے بڑے بڑے گیٹ اور ناورڈور سے نظر آتے ہیں۔2010 میں دوبارہ تعمیر شروع کی گئی تھی ابھی تک زیر تعمیر ہے اس کا نام Sagarda Familia کیتھولک چرچ ہے یہاں کا فٹ بال اسٹیڈیم بہت مشہور ہے۔البتہ ٹکٹ خرید کر اس کو اندر سے دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے آس پاس سینکڑوں چھوٹے بڑے ہوٹل، پارکنگ لاٹس ہر اقسام کے ریسٹورنٹ ہیں، پوری دنیا سے ٹورسٹ اس چرچ کو دیکھنے آتے ہیں۔سمندر کے کنارے بہت بڑا بازار بھی لگتا ہے، کشتی رانی بھی ہوتی ہے۔ ایک بہت بڑا MALL بھی ہے۔سمندر کے کنارے 10، 15 میل پیدل چلنے کی فٹ پاتھ بھی ہے۔ جس پر پیدل چلنے میں بہت لطف آتا ہے۔چاروں طرف درخت ہی درخت ہیں۔بارسلونا کی ایک خوبصورت پہاڑی بھی ہے جس سے پورا شہر رات کو جگمگاتا ہے۔بارسلونا سے بذریعہ کار ہم 3 گھنٹوں کی مسافت طے کر کے Valencia پہنچے، یہ بھی اسپین کی تعمیری ثقافت کا آئینہ دار شہر ہے۔یہاں کا عجائب گھر نیشنل پارک، کشتی رانی، 3 گھنٹے کا سائیکل ٹور، ڈانس شوز، پرانا ڈاؤن ٹاؤن تاریخی ٹور بھی یاد

گارہوتا ہے۔پھر یہاں سے ہم اسپین کے دارالخلافہ Madrid بذریعہ کار 3:30 گھنٹے میں پہنچے سب سے بڑی خوبی اسپین کی ہائی وے بہت صاف ستھری اور ہر 100 کلومیٹر کے بعد ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ہائی وے کے دونوں طرف ہرے بھرے کھیت، درخت خصوصاً زیتون کی باغات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔Madrid ایک تجارتی شہر ہے۔یہاں سے 3 گھنٹے کی مسافت پر قرطبہ شہر ہے، جہاں 800 سال مسلمانوں کی حکومت رہی، اس کا نام تبدیل کر کے Cordoba کر دیا گیا۔یہاں 785 میں اس وقت کے مسلمان حکمران امیر عبدالرحمان نے قرطبہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔جو کہ آج تک لال پتھروں کی اینٹوں کی وجہ سے اس کی خوبصورتی آج تک برقرار ہے۔اس کے پہلے حصے میں ایک گھنٹہ گھر ہے۔جس میں تقریباً 40 میٹر اوپر چل کر گھنٹی بجائی جاتی ہے، یہاں پہلے آذان دی جاتی تھی، مسجد کے اندر ایسا سسٹم تھا کے بغیر لاؤڈ اسپیکر سارے لوگ جمعہ کا خطبہ سنتے تھے، یہ مسلمانوں کے آرٹ کی ایک نشانی تھی۔جس کو 1210 میں چرچ میں تبدیل کر دیا گیا۔اور اب وہاں صرف مسجد کا مینار اور مُصلاء رہ گیا ہے اور نماز پڑھنے پر بھی مکمل پابندی ہے۔اور عیسائی عبادت گاہ کا درجہ دیکر عیسائیوں کا عبادت کی اجازت ہے۔ہر سال مسلمانوں سمیت دنیا بھر سے لاکھوں سیاں اس مسجد کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ہر سیاح کو 30 یورو کا ٹکٹ فروخت کر کے اس چرچ کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں، جس میں ایک وقت میں 1 لاکھ سے زیادہ نمازی ہوتے تھے۔خصوصاً جمعہ اور عیدیں پر پورے اسپین سے مسلمان نماز کی سعادت سے مستفیض ہوتے تھے، مگر آج وہ اپنی بنائی ہوئی شاندار معرابوں والی مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔البتہ Cordoba میں نئی مساجد اور مسلمان رہتے ہیں۔اس شہر میں اس کے علاوہ کوئی خاص چیز موجود نہیں تھی لہذا ہم شام کو Madrid ائیر پورٹ سے لندن روانہ ہو گئے گویا 10 دن میں 3 ممالک کی سیر مکمل ہو چکی تھی۔